الطاف
حسین
حالی
حیاتِ جاوید

حیاتِ جاوید

جلد دوم

مولانا الطاف حسین حالی

ارسلان بکس

علامہ اقبال روڈ میرپور، آزاد کشمیر

حیاتِ جاوید

حیاتِ جاوید

مولانا الطاف حسین حالی

ناشر ——— ارسلان محمود

اہتمام ——— امجد محمود

اشاعت ——— مئی 2000ء

طابع ——— زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

کتابت ——— قاری محمد حبیب الرحمٰن

قیمت ——— -/450روپے

ملنے کا پتہ : ———

ارشد بک سیلرز

چوک شہیداں، میر پور، آزاد کشمیر

فون: 42327 (058810)
49522 - 49503

فہرست

سرسید کی مخالفت

کامیابی اور اس کے اسباب

سرسید میں مختلف لیاقتوں کا

شکل و شمائل' اوضاع و عادات' اخلاق و خصائل اور مذہب'

محبت و صداقت

مذہب

مذہبی خدمات

اس عنوان میں ہم سرسید کی وہ کوششیں اور خدمات دکھانی چاہتے ہیں جو دین اسلام کی حمایت میں زمانۂ حال کی ضرورتوں کے موافق وہ اخیر دم تک انجام دیتے رہے اگرچہ ابھی تک اُن کی مذہبی خدمات کی کچھ قدر نہیں ہوئی کیونکہ ایک محدود جماعت کے سوا اکثر مسلمان اُن کی مذہبی تصنیفات کو مخرّب اسلام جانتے ہیں اور اکثر تکفیر یا تضلیل کے خوف سے محض مصلحتاً مخالفین کی ہاں میں ہاں ملادیتے ہیں یا سکوت اختیار کرتے ہیں، لیکن چونکہ مخالفت کا سبب محض تعصب یا پاس دینداری ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ناواقفیت اور زمانہ کی ضرورتوں سے بےخبر ہونا بھی شامل ہے اس لیے امید ہے کہ جس قدر لوگ زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اسی قدر سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر مسلمانوں میں روز بروز بڑھتی جائے گی۔

سرسید نے جو کچھ مذہب کے متعلق ابتدا سے اخیر تک لکھا ہے منجملہ اُس کے وہ کتابیں اور رسالے جو غدر کے زمانہ سے پہلے لکھے گئے اور جن کا ذکر پہلے حصہ میں اپنے اپنے موقع پر آچکا ہے وہ اس مقام پر ہماری بحث سے خارج ہیں کیونکہ اُن میں ہم کوئی چیز ایسی نہیں پاتے جس کے لحاظ سے اُن کو قدیم طرز کی تصنیفات میں کوئی ممتاز درجہ دیا جائے یا جو اسلام کی حمایت کے لیے اس زمانہ میں درکار ہے۔ پس جو کچھ ہم کو اس باب میں دکھانا ہے وہ صرف اُن کی وہ مذہبی خدمات ہیں جو غدر کے بعد انھوں نے انجام دیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ اُنھوں نے

غدر کے بعد مذہب کے متعلق کہ وہ خطا اور غلطی سے بالکل پاک ہے اور ایک فانی مخلوق کا کام ایسا ہو بھی نہیں سکتا لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں اور کہیں گے کہ جس شخص کو کافر، ملحد، نیچری اور بد مذہب کہا جاتا تھا جو اسلام کی خدمت اُس سے بن آئی وہ نہ اُن مستفتیوں سے ہو سکی جنھوں نے مکہ میں جاکر اُس کے کفر کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیوں سے جنہوں نے مسجد الحرام میں بیٹھ کر اُس کے کفر کے فتووں پر مہریں لگائیں

ہندوستان میں اسلام کن خطروں میں گھرا ہوا تھا

ہندوستان میں اسلام تین خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اُس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوروں میں انکو ڈیلا نیلا سکار پیٹ بھراؤ ملجاتا تھا مگر وہ اس پہ قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔

پہلا خطرہ

ہندوستان میں سب سے زیادہ اُن کا دانت مسلمانوں پر تھا اور اس لیے اُن کی مناد یوں میں، اُن کے اخباروں میں اور اُن کے رسالوں میں زیادہ تر نوچھاڑ اسلام پہ ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے۔ بانی اسلام کے اخلاق و عادات پہ انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب اُن کے دام میں آگئے۔ اس خطرہ سے بلاشبہ علمائے اسلام (شکر اللہ مساعیہم) جیسے مولانا رحمت اللہ مرحوم اور مولوی آلِ حسن اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ متنبہ ہوئے انھوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں

اور ان سے بالمشافہ مناظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا لیکن اس کا اثر مسلمانوں ہی تک محدود رہا عیسائیوں کی غلط فہمیاں جو اسلام کی نسبت قدیم سے چلی آتی تھیں وہ بدستور قائم رہیں۔

دوسرا خطرہ

دوسرا خطرہ جو پہلے سے زیادہ خوفناک تھا وہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت سے علاقہ رکھتا تھا اول تو مسلمانوں اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمران قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے دوسرے بسبب ان غلط فہمیوں کے جو یورپ کی تمام عیسائی قوموں میں اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی تھیں، انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغی وفساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

تیسرا خطرہ

تیسرا خطرہ خاصکر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا، اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا ابھرنا محال ہو گیا تھا یہانتک کہ سرسید کو خود ان میں تعلیم پھیلانی پڑی، حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پرپیگنڈ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔

پچھلے دونوں خطروں کا سرسید کے سوا ہندوستان کے کسی عالم کو احساس نہیں ہوا۔ مولویوں سے اس کے سوا کہ چند روز دریا کی رو یعنی انگریزی تعلیم کو

روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار کر رہ گئے اور کچھ نہیں ہو سکا. سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے ان تینوں خطروں کا جہاں تک کہ اس کی قدرت میں مقابلہ کیا اور توقع سے زیادہ اُس میں کامیابی حاصل کی.

سرسید نے تینوں خطروں کا مقابلہ کیا

اُس نے تمام اعتراضوں کے جواب جن کے ذریعہ مشنری مسلمانوں کو دام میں لا سکتے تھے خود عیسائی عالموں کے اقوال کی سند پر لکھے. اس نے تمام غلطیوں کو رفع کیا جو اسلام کی نسبت عیسائی قوموں میں پھیلی ہوئی تھیں. اس نے بدلائل قاطعہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی مذہب اسلام سے زیادہ عیسائی مذہب اور عیسائی قوم کا دوست نہیں ہو سکتا اور اُس نے جب دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے کسی طرح مسلمانوں کو مفر نہیں ہو سکتا تو اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ اسلام کو انگریزی تعلیم کے مضر نتائج سے بچانے میں صرف کیا۔

بائیبل کی تفسیر

انھوں نے ان مقاصد کی طرف پہلی ہی بار اُس وقت توجہ کی تھی جبکہ مراد آباد میں تبیین الکلام یعنی توریت و انجیل کی تفسیر لکھنے کی بنیاد ڈالی اس کتاب کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے.

سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کی تیاری

یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے. پھر جب سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد چار جلدوں میں چھپکر ہندوستان میں پہنچی جس کی نسبت عیسائیوں

میں مشہور تھا کہ اُس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا۔ اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ غالباً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور دلی سے منشی امو جان مرحوم اور جہانگیر آباد سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کو یہ بھی اس وقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے، علی گڑھ گئے تھے۔ نواب صاحب کی ہمراہ میں بھی گیا تھا گو اس وقت تک میری سرسید سے جان پہچان نہ تھی۔ مگر چونکہ ہم انھیں کی کوٹھی میں ٹھیرے تھے اُن کے خیالات معلوم کرنے کا اکثر موقع ملتا تھا۔ وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔ اُسی وقت ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرسید جاہلیت کے اشعار جن سے اُس زمانہ کی بیہودہ اور نفرت انگیز رسمیں ظاہر ہوتی ہیں اور جو خطبات احمدیہ میں بجنسہٖ نقل کیے گئے ہیں ایک مولوی سے انتخاب کرا رہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا پختہ ارادہ سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لیے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو اُن کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

سرسید کے بعض خطوں سے جو انھوں نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں پایا جاتا ہے کہ ہندوستان سے چلتے وقت جب اُنھوں

یہ ارادہ اپنے احباب پر ظاہر کیا تو اُن کے بعض دوست جو سرکاری عہدہ دار

سر ولیم میور کا جواب لکھنے سے دوستوں کا منع کرنا

اور سر ولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے اُن کو سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے تھے مگر سر سید نے اُن کا کہنا نہیں مانا اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے۔

خطبات احمدیہ کے لیے میٹریل جمع کرنا

انھوں نے انڈیا آفس کے کتب خانہ سے کتابیں بہم پہنچائیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعیں حاصل کیں۔ بعض عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ ایسے یعنی خطبے یا مضمون لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر مشتہر کیا۔

خطبات کے لکھنے میں سرگرمی جو ولایت کے خطوں سے پائی جاتی ہے

اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سر سید کے دل میں تھا اور جو مالی مشکلات اُن کو اس کے شائع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت

اُس کے لکھنے میں اُن کو کرنی پڑی اُس کا کسی قدر اندازہ اُن کے خطوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں " ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم صاحب کی کتاب کو ایا دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دل کو جلا دیا اور اُس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھدی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کردی ہیں۔ چٹھیاں روانہ ہو گئیں۔ سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خریدیں ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹین کا ترجمہ کر کر مضمون بتلا سکے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں " مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ اس خط کے پہنچتے ہی میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور دونوں صاحب کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے۔ سود اور روپیہ میں ادا کردوں گا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دلی لکھا ہے اور لکھدیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کرکے ہزار روپیہ بھیجدو۔ کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں " میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی (یعنی خطبات احمدیہ) میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور

بھی سخت ہوگیا ہے۔ اِدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ
ابھی لکھنا اور چھپانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں۔ سکتہ سا ہوگیا۔
دن رات کی تکلیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ جلد اول خطبات
احمدیہ کی تمام ہوگئی ہے اور اس مہینے میں چھاپہ بھی تمام ہو جائے گا۔ اب جو
اندازہ اس کی ایک جلد کے چھاپنے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپیہ سے زیادہ
کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہے ہیں اور جان میں جان نہیں میر تراب علی
نے نہایت مدد کی ہے۔ تین سو روپیہ اس کے چندہ کی بابت بھیجے ہیں۔ میر
ظہور حسین صاحب نے ڈیڑھ سو روپیہ بھیجا ہے۔ مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب
نے اپنا چندہ سو روپیہ بھیجدیا۔ آپ زین العابدین سے روپیہ منگوا کر بھجوا دیجیے
اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ کا بھی بھیجدیجیے؟"

جب ہندوستان سے سرسید کے دوستوں نے کچھ اور چندہ بھیجا ہے تو
اُن کو بے انتہا تقویت ہوئی چنانچہ اس کی رسید کے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ" اگر
آپ لوگ کچھ مدد نہ کرتے تو زہر کھا کر مرجانے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا؟"

مگر بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تخمینہ کتاب کے چھاپہ کا پہلے کیا گیا
تھا اُس سے بہت زیادہ صرف ہوگیا تھا یعنی قریب چار ہزار کے خرچ ہوا جس
میں سے کچھ کم سولہ سو روپیہ سرسید کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر
کے بھیجا اور باقی روپیہ سرسید نے قرض لے کر ادا کیا۔ ان کے ایک خط سے
معلوم ہوتا ہے کہ ولایت سے مراجعت کرنے وقت اُن کے پاس زادِ راہ
کے لیے کچھ نہ رہا تھا اور نہایت پریشان تھے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ
"اب جب تک اور روپیہ قرض نہ لیا جائے مراجعت متعسّر ہے۔ یہ

تردّدات ایسے جانکاہ ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کتابیں مطبوعہ صندوقوں میں بند ہورہی ہیں واسطے روانگی ہندوستان کے۔ اُن کے محصول وغیرہ میں بھی دو سو روپیہ سے کم خرچ نہیں ہونے کے۔ اب زیادہ حال تردّدات کا لکھنا ناحق آپ کو تردّد میں ڈالنا ہے۔"

شاید اسی اخیر خط کے جواب میں مولوی سید مہدی علیخاں نے اپنی ساری تنخواہ بھیجنے اور کچھ قرض لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کے جواب میں سرسید نے اُن کو لکھا کہ "کتاب کے اخراجات کا صدمہ اور عین اسی صدمہ میں صدمۂ غم انتقال ہمشیرۂ حامد و محمود کا لاحق ہونا جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گذرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا۔

ع ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

آپ نے جو الفاظ اپنی محبت اور الفت سے لکھے ہیں اُن کا بہت بہت شکر کرتا ہوں اور بے تکلف لکھتا ہوں کہ اب کچھ حاجت نہیں رہی تین ہزار روپیہ قرض لیا گیا۔ سب بیباق ہو گیا۔ اب آپ کچھ قرض لیجیے نہ اپنی تنخواہ بھیجے۔ مگر خارجاً معلوم ہوا کہ سید مہدی علیخاں اس خط کے پہنچنے سے پہلے اپنی تنخواہ کا روپیہ روانہ کر چکے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض خیال کرتے تھے اور جب کہ وہ حسب دلخواہ تیار ہو گئی تو اُن کو بے انتہا خوشی اور فخر اس کے لکھنے پر ہوا تھا۔ وہ سید مہدی علیخاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں "اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم مصر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اُس

سنے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اُس کی لذت میں ہی جانتا ہوں" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں۔ اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈالا تو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں"

خیر یہ خیالات تو سرسید کے اپنی کتاب کی نسبت ایسے ہیں جیسے ہر مصنف کے خیالات اپنی تصنیف کی نسبت ہوتے ہیں، اس سے سوا اس کے کہ وہ اسلام کی حمایت کرنے سے بے انتہا خوش تھے اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ سرسید سے پہلے بے شمار عالموں نے بمقابلہ عیسائیوں کے اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے خود ہندوستان کے علمائے اسلام نے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، بڑی بڑی مبسوط کتابیں نہایت کوشش سے اسی مضمون پر تحریر کی ہیں۔

خطبات احمدیہ کی ترجیح پہلی کتابوں پر جو اسلام کی حمایت میں لکھی گئیں

پس تاوقتیکہ خطبات احمدیہ میں کوئی وجہ ترجیح کی نہ پائی جائے اس کو اگلے علما کی کتابوں پر فوقیت نہیں دیجا سکتی۔ مگر ہمارے نزدیک فی الواقع ایسی وجوہات موجود ہیں جن کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان سے اسلام کی ایسی خدمت بن نہیں آئی۔

ترجیح کی پہلی وجہ

اولاً جہانتک ہم کو معلوم ہوا ہے، سرسید سے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یورپ کا سفر محض اس غرض سے نہیں کیا کہ وہاں جاکر اسلام کی حمایت کے لیے بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹریل جمع کرے۔ وہیں بیٹھ کر عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے۔ یورپ ہی کی کسی زبان میں جو تمام سیولائزڈ ورلڈ میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہو، اس کا ترجمہ کرائے اور وہیں اس کو چھپواکر شایع کرے اور اس طرح اسلام کی خوبیاں اُن قوموں کے کان تک پہنچانے جنھوں نے تیرہ سو برس سے کبھی اسلام کی نسبت بُرائی کے سوا کوئی بات نہ سنی ہو۔

ریورنڈ ہوپر، جو اب سے تقریباً بیس برس پہلے لاہور ڈیوینٹی کالج میں پرنسپل تھے اور جن سے میں خود بارہا ملا ہوں، انھوں نے میرے ایک دہلوی دوست سے جو اُن کو اُردو پڑھاتے تھے کہا کہ "مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خاں کو کافر ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو اُن کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے اُن پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، اُن کے ملکوں میں جاکر انھیں کی زبان میں وعظ کہتے اور انھیں کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔"

مسٹر آرنلڈ جنھوں نے ابھی پریچنگ آف اسلام لکھی ہے اور اس کے لکھتے وقت مسلمانوں کے لٹریچر سے بمشکل واقفیت حاصل کی ہے۔

ایک نہایت سچے اور پختہ عیسائی ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ "ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ میں جاکر یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔"

سرسید کہتے تھے کہ "۱۸۷۰ء میں جبکہ خطبات احمدیہ چھپکر لندن میں شائع ہوئی تو اس پر لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اُس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔"

دوسری وجہ

دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سرسید نے اس کتاب میں مناظرہ کے اُس مناصمانہ طریقہ کی جگہ جو مسلمانوں میں عموماً دائر و سائر ہے اور جس سے فریق مخالف کے دل میں بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے۔ ایک ایسا دوستانہ اور بے تعصبانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ جس کی پیروی کرنے کی نہایت ضرورت تھی۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں خطبات احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر۔ غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصل عیسائیت کے سچے اصول کا ادب۔" پھر اپنی قوم کے مذہبی

لوگوں کو اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ "جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دین محمدی فی زمانہ انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اُس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بوناپارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب، مغایرت اور تنگدلی کی اُس میں خیال کیجاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب " لائف آف محمد " کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔" اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خطباتِ احمدیہ نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا اور جو کتابیں مذہبی مناظرہ کے متعلق برخلاف قدیم طریقہ کے شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کس قدر مفید اور کس قدر فریق ثانی کو انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

تیسری وجہ

خصوصیت اس کتاب میں یہ ہے کہ سر ولیم میور نے وہ قدیم فرسودہ و بوسیدہ طریقہ جس کے بموجب مشنری اسلام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور

جس میں اُن کو کبھی مقابلہ اہل اسلام کے کامیابی نہیں ہوئی ترک کر دیا تھا اور اس کی جگہ اپنی کتاب لائف اوف محمد میں نکتہ چینی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو خاصکر تعلیم یافتہ لوگوں پر، خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو اور خواہ عیسائی بہت زیادہ اثر کرنے والا تھا، مثلاً قدیم مشنری مسلمانوں کی کتب سیر و احادیث پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ مثل انجیلوں کے الہام سے نہیں لکھی گئیں اور اس لیے جن روایتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور پیشین گوئیاں ثابت کی جاتی ہیں وہ اعتبار کے لائق نہیں ہیں. مگر سر ولیم میور نے اُن کے برخلاف تمام روایتوں کو جو مسلمانوں کی حدیثوں، تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں مندرج ہیں، صحیح تسلیم کر کے آنحضرت کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی. یا مثلاً پادری فانڈر وغیرہ اسلام کے برخلاف عقلی دلیلیں پیش کرتے تھے. اور اس کی تعلیم کو انبیا کی روحانی تعلیم کے منافی بیان کرتے تھے. مگر سر ولیم میور نے بجائے عقلی دلیلوں کے تاریخی شہادتیں پیش کیں تھیں اور بجائے اس کے کہ اسلام کی تعلیم کو روحانیت کے برخلاف ثابت کریں، اس کو زمانہ حال کی شائستگی اور تمدن و حسن معاشرت کے برخلاف ظاہر کیا تھا، مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیا تھا اور مسلمان بادشاہوں کی ہوا پرستی و سفاکی و خونریزی کا جوابدہ اسلام کو ٹھیرایا تھا، یہ باتیں گو فی نفسہ صحیح ہوں یا غلط مگر تعلیم یافتہ جماعتوں کے دل پر جادو کا کام کرنے والی تھیں، سر سید نے ان تمام مغالطوں کو نہایت معقول اور دلنشیں دلائل سے رفع کیا ہے. انھوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور اُن روایتوں کا جو اُن کتابوں میں درج ہیں مفصل حال بیان کیا ہے جو ان لوگوں کے لیے جو سچائی اور انصاف

سے اسلام کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں ہمیشہ کے واسطے ایک بے مثل رہنما ہے۔ ان خطبوں میں روایت کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین نے مقرر کیے ہیں۔ اور جو معیار انھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے اُن کی تشریح ایسے بسط کے ساتھ کی گئی ہے کہ اس پر غور کرنے کے بعد اُن روایات کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی جن کی رو سے مسٹر ولیم میور نے اسلام کی تعلیم اور بانی اسلام کے اخلاق پر نکتہ چینی کی ہے۔ انھوں نے نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانۂ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات کی مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال اور کردار جن کے ثمرے وہ آج بھگت رہے ہیں اُن کے جوابدہ خود مسلمان ہیں نہ اسلام اور جو مباحث تاریخی یا جغرافی تحقیقات پر مبنی تھے اُن کا فیصلہ ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ کسی منصف مزاج آدمی کو اگرچہ وہ اسلام کا کیسا ہی مخالف ہو، اس کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں۔

چوتھی وجہ

مگر سب سے بڑی خصوصیت خطبات احمدیہ کی جو اُس کو اگلے علما کی کتابوں سے ممتاز ٹھیراتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں برخلاف دیگر علمائے اسلام کے الزامی جوابوں سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا ہے، بلکہ ہر ایک اعتراض کا محققانہ جواب جو عیسائی اور لامذہب دونوں کو برابر دیا جا سکے لکھا گیا ہے الزامی جوابوں سے سوا اس کے کہ صرف مسلمانوں کی تسلی ہو جائے یا بعض صورتوں میں عیسائی بھی ساکت ہو جائیں اُن لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی جو اسلام اور عیسائیت دونوں مذہبوں سے الگ ہیں یا مطلقاً قید مذہب

سے آزاد ہیں۔ یہاں بطور مثال کے مختصر طور پر ہم چند مقامات خطبات احمدیہ کے اس غرض سے دکھاتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں سرسید کا طریق استدلال کیا ہے اور جنھوں نے اُن سے پہلے اس مضمون پر کتابیں لکھی ہیں اُن کا طریق استدلال کیا تھا ! مگر ہم باوجود اس کے کہ سرسید نے اس مضمون کو پہلے کی نسبت بہت بلند کر دیا ہے، مولانا رحمت اللہ اور مولوی آل حسن کے سرسید سے کچھ کم مداح اور شکرگزار نہیں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشنریوں کے حملوں سے بچایا اور اُن سے مناظرہ کرنے کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی اور جن کی کتابیں دیکھ کر پچھلوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔

پہلی مثال

عیسائیوں کا جو طعن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بابت کثرت ازواج اور اسلام پر بابت اجازت تعدد ازدواج اور اجازت طلاق کے ہے اس کی تردید میں ہمارے علما نے بالکل الزامی جوابوں سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اگر عیسائی اپنے مذہب کے اصلی اصول کے پابند ہوں تو یہ جواب اُن کے لیے کافی و وافی ہیں مثلاً ازالۃ الاوہام میں توریت کے حوالوں سے نہایت تصریح کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے تین نکاح، حضرت یعقوبؑ کے چار نکاح، حضرت موسیٰؑ کے دو نکاح، حضرت داؤدؑ کی نو سے زیادہ بیویاں جن میں بعض منکوحہ اور بعض غیر منکوحہ تھیں اور حضرت سلیمان کی ایکہزار بیویاں اور بعض اور انبیاء کی کثرت ازواج کو ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح طلاق کی طعن پر توریت سے جس کے احکام کو عیسائی منسوخ نہیں مانتے، ثابت

کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جوازِ طلاق کا حکم دیا ہے کتابِ استفسار میں بھی اول اسی قسم کے الزامی جواب دیے ہیں اور آخر میں جواب تحقیقی یہ لکھا ہے کہ کوئی دلیل عقلی یا نقلی توریت و انجیل سے بھی اس بات پر قائم نہیں ہے کہ جو بہت سی بیویاں کرے وہ نبی نہیں ہو سکتا یا خدا تعالےٰ نے کسی نبی کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور طلاق کی نسبت یہ لکھا ہے کہ اگرچہ انجیل میں طلاق کو منع کیا گیا ہے مگر توریت میں اجازت دی گئی ہے اور عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ توریت اور انجیل آپس میں متحد ہیں۔ ناسخ و منسوخ نہیں۔

اگرچہ یہ جوابات جو ہمارے علما نے دیے ہیں مسلمانوں کی تسلی کے لیے اور عیسائی اپنے مذہبی اصول کے پابند ہوں تو اُن کے ساکت کرنے کے کافی ہیں مگر عیسائی ۔ باوجودیکہ توریت کو الہامی کتاب اور قیامت تک غیر منسوخ جانتے ہیں ، نہ توریت کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور نہ توریت کے حوالوں پر کان دھرتے ہیں نیز عیسائی انبیا کو مثل اہل اسلام کے معصوم نہیں سمجھتے یہانتک کہ اُن میں سے بعض کی طرف بدترین گناہوں کو منسوب کرتے ہیں پس تاوقتیکہ عیسائیوں کو تحقیقی جواب نہ دیا جائے اُن کی زبان بند نہیں کیجا سکتی اس کے سوا الزامی جوابات اُن لوگوں کے لیے جو توریت وانجیل کو نہیں مانتے کافی نہیں ہیں جب تک اس زمانہ کی مسلمات کے موافق اُن کا جواب نہ دیا جائے ۔

مسئلہ تعداد ازواج اور جوازِ طلاق کی بحث خطبات احمدیہ میں بھی آگئی ہے ۔ اس میں سرسید نے اول سر ولیم میور کا اعتراض نقل کیا ہے جس کا محصل یہ ہے کہ تعدّد ازواج اور طلاق کا حکم عام اخلاق کی بیخ کنی کرتا ہے ۔ عام

زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتا ہے اور حسن معاشرت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

اس کے جواب میں سرسید نے اول تعداد ازدواج پر علمی بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "اس معاملہ پر تین حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے، اول قانون قدرت کے لحاظ سے۔ سو ہم قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روحوں کی نسبت اُن کے خالق کا یہ منشا تھا کہ اُن کے صرف ایک ہی مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک مادہ اور ایک نر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ جن ذی روحوں کی متعدد مادائیں ہونی مقصود تھیں اُن کے ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور نر و مادہ کی تعداد متناسب نہیں ہوتی اس قانون کے بموجب جیسا کہ ظاہر ہے انسان دوسری قسم میں داخل ہے۔ مگر چونکہ رتبہ میں بوجہ اس بیش بہا قوت کے جو مدرک کلیات وجزئیات ہے وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے قدرت نے اُس کو عطا کیے ہیں، اُن کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امورات طبعی اور حسنِ معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور ممالک مختلفہ کی آب و ہوا کے کام میں لائے ورنہ اُس میں اور دیگر حیوانات میں جو اُس کے آس پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکرے یا مرغے سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتا۔ پس جس طرح کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلاف فطرت ہے۔

اس کے بعد سرسید نے معاشرت کے لحاظ سے اسی مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا

اُس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اُس نے اُس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا.
اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد
اور رنج و راحت میں شریک ہو، اپنی مجالست سے اُس کی خوشی کو بڑھا دے
اپنی محبت بھری ہمدردی سے اُس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر
غرض جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے. وہ یہ ہے کہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر
خدا کے اِس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ "بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو" مدد دے
مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرائض کے ادا کرنے میں
قاصر ہو تو اُس دانشمند حکیم خالق زن و مرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی
بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یا
ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں
جورُوئیں رکھنے کی اجازت ہو اور یا پہلی زوجہ کو طلاق دینے کے بعد دوسری جورو
کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا، چنانچہ مذہب اسلام
کی رو سے اُس کو حاصل ہے. سیاست مدُن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق
ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے لیکن عورت کو اول قاضی کی اجازت
حاصل کرنی چاہیے"۔

"اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی تو اِس کے سبب سے حسن
معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا
پڑتا۔ اگرچہ تعلیم و تربیت سے اس ضرورت کا کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا
محالات سے ہے، پس جہاں اس کی ضرورت ہے وہاں اس کے عمل میں نہ
لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسن معاشرت کیلئے سم قاتل ہیں"۔
اس کے بعد وہ ڈیون پورٹ کی کتاب سے مانٹگیو کی رائے تعدادِ ازدواج

کی تائید میں نقل کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ "گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بڑھیا ہو جاتی ہیں ضرور ہے کہ تعدادِ ازدواج کا قاعدہ جاری کیا جائے" پھر مسٹر ہگنز کی رائے لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ "علم قوائے انسانی اور علم طبیعات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسی دریافت کی ہیں جو کثرت ازدواج کے واسطے بطور ایک عذر کے متصور ہو سکتی ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سرد خون والے مینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتیں، مگر بنی اسمٰعیل سے جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں متعلق ہو سکتی ہیں" اس کے بعد مسٹر ہگنز نے سر ڈبلیو اوسلی صاحب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر بتدریج عالمِ ضعیفی کو پہنچتے ہیں۔ مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بانیٔ اسلام کے لیے اس بات کی کہ انھوں نے متعدد جورؤں کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی اور یہ ایک کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کو ملکوں کی گورنمنٹوں کے آئین پر چھوڑ دیا کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہوگی وہ یورپ کے واسطے نامناسب ہوگی"

ان دونوں مذکورۂ بالا رایوں پر سر سید یہ ریمارک کرتے ہیں "افسوس کہ ان دونوں صاحبوں نے تعددِ ازدواج پر صرف امورات طبیعی کے لحاظ سے نظر کی ہے مگر مذہب اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امورات طبیعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کی تلخیوں کے

واسطے اور مقاصدِ تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم وحوا کے پیدا کرنے والے کی اُس کے قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے "

اس کے بعد سرسید اُن اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں جو آنحضرت سے پہلے عرب اور اُس کے گرد ونواح کے ملکوں میں ازدواج کے متعلق واقع تھیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ " ایران میں قوانین نکاح بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے یہاں تک کہ بیٹے کو اُس کی ماں ایسی ہی مباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن۔ یہودیوں کے ہاں جو ایران کے گوشہ مغرب میں بکثرت آباد تھے تعدادِ ازدواج کی رسم بلا کسی قید اور حد کے بے روک ٹوک جاری تھی عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں۔ تعدادِ ازدواج کی کچھ انتہا نہ تھی تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں۔ عیسائیوں کا حال ان سب کے برخلاف تھا، اُن کے ہاں ایک جورو بھی کرنی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی بلکہ رہبانیت اور تجرّدِ محض کی عام ہدایت تھی اور مرد عورت دونوں کے لیے وہی نیکی گنی جاتی تھی۔ ایسے زمانہ میں جبکہ عقل اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اخلاق و معاشرت اس قدر بگڑ گئی تھی بانیِ اسلام نے ایک ایسا عمدہ قانون جاری کیا جو بلحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقل کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیے اُس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے "

اس کے بعد انھوں نے مذہب کی حیثیت سے اس مسئلہ پر بحث

کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعدادِ ازدواج کو رد کیا ہے اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے. یہودیوں کے ہاں بکثرت اور بلا تعین حد ازدواج موجود ہے. عیسائی مذہب نے بھی تعداد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی. چنانچہ مسٹر ہگنز لکھتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی نظیر پر جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے. خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی ان میں انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی. جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ " ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعدد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے."

اس کے بعد سرسید نے نہایت مشہور و معروف عیسائی عالم دین جان ملٹن جو تعدد ازدواج کا ایک مشہور حامی ہے اور جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سی آیتیں نقل کی ہیں اس کی تقریر نقل کی ہے جس میں تعدد ازدواج کے جواز پر ایک لطیف اور دقیق استدلال کیا گیا ہے. اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "یہ حال تو تعدد ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا. اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے رد کیا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے ہم

کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اُس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا، ضرور ایسا ہوگا جو قانونِ قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو۔ اور وہ یہی مسئلہ بحیثیت اسلام کا ہے۔

قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پُرپیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے "فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً" (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے) اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "اس آیت کے اگر وہی معنی لیے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا اور علما نے لیے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے، کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازدواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمقِ نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ اِنْ لَمْ تَعْدِلُوْا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا پس اگر یہ ممکن ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا" اس کے بعد انھوں نے دوسری آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اس لیے مستثنیٰ صورتوں کے سوا اُس کو متعدد جوروئیں کرنے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی اور وہ یہ آیت ہے "وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ" (یعنی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں

عدل کر سکو، اس کے بعد وہ خاص خاص صورتوں کو جن میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے۔ بیان کر کے لکھتے ہیں۔

"ہاں بلاشبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا نشاء ٹھٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے ایک حیلہ ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بیجا عملدرآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا جو اُن کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہو گی۔"

ان باتوں کو سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو دو تین تین اور چار چار جورویں کرنے لگے اور ایک بازار کی عورت کو ڈالو پر چڑھایا اور نکاح کر مارا، جہاں مقدس بزرگ مولوی ہوئے اور اللہ میاں کے سانڈ بنے، اس سریدنی کو لے ڈالا۔ وہاں وعظ کہنے لگے اور سنت نکاح ثانی کو جاری کیا، قرآن پڑھانے پڑھانے دوسرا سبق خطبۃ النکاح کا پڑھانے لگے اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو گھنگالنا شروع کیا۔ ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے، یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے۔ پس ایسے شخص کے افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑوں کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔"

اس کے بعد سرسید نے طلاق کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وہ اول حسن

معاشرت کی نظر سے اس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بڑا دشمن حسن معاشرت و تمدن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے۔ اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں "لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد عورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے کیونکہ اس سے مرد عورت کو آزادی ہو جاتی ہے جن کے مزاج کے اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ با ایں ہمہ اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ اُن بداخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں اور نیز اُس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جبکہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں تو اس کو بطور ایک علاج کے سمجھ کر اسی حالت میں اس کی جانب رجوع کرنا جائز ہو سکتا ہے جبکہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں اور ایسے تردّدات و تفکرات میں ڈالنے والی ہوں جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور روزافزوں رنجشیں پیدا کرنے والے اور باہمی معاشرت کے بدلے دن رات کی لعن وطعن وجوتی پیزار میں رکھنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے جیسا کہ اسلام نے اسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حسنِ معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اُس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔"

اس کے بعد مسئلہ طلاق پر اسلام اور مذہب موسوی و عیسوی کے بموجب گفتگو کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "یہودیوں کے ہاں طلاق دینا بغیر کسی قید و شرط حالت کے مرد کے اختیار میں تھا جب وہ چاہتا تھا طلاق نامہ لکھ کر جورو کو دیدیتا تھا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا حضرت عیسیٰ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا لیکن اگر فی الواقع عیسائیوں کے خیال کے موافق طلاق کی امتناع سے حضرت عیسیٰؑ کا یہی مطلب تھا تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی ، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے معتقدوں نے ان سے کہا کہ اگر جورو سے مرد کا یہ طور ہے تو جورو کرنا خوب نہیں ۔ اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں تو حسن معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے اور جو رنج وہ امور زن و شوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد دونوں کے لیے اور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

اس کے بعد سرسید نے یورپ کے مشہور و نامور عیسائی عالم جان ملٹن کی بہت لمبی تقریر اور محققانہ رائے جو وہ اس مسئلہ کے متعلق رکھتے ہیں۔ نقل کی ہے اور بائیبل کی جن آیتوں سے انھوں نے جواز طلاق پر استدلال کیا ہے وہ سب آیتیں نقل کی ہیں جس سے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ "حضرت عیسیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے۔

اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں جو اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں" اس سے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائیبل کے درسوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجون مفرح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لاعلاج کا علاج ہے۔"

جان ملٹن کی تقریر نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اب دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؛ اس نے طلاق کو بطور ایک مرض لاعلاج کے جائز و مباح بتلایا ہے مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا معاملہ ہے کہ جو اس میں بیماری پیدا ہو سوائے انھیں دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے بانی اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر، بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لیے ابتداءً یہ عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار کے پیدا ہوئی تھی۔"

"اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے۔"

"بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروں کو بتایا کہ "ماخلق اللہ شیئاً علی وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق یعنی کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر

ایسی پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو) "

"و پھر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ " ابغض الحلال الی اللہ الطلاق" (یعنی خدا کے نزدیک مباح چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ چیز طلاق ہے")

اس کے بعد لکھتے ہیں "کہ یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا " ایما امرأۃ سألت زوجھا طلاقا فی غیر ما بأس فحرام علیھا رائحۃ الجنۃ " (یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بغیر سختی کی حالت کے طلاق چاہے اس پر جنت کی بو تک حرام ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ " پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ جو شخص اپنی جورو کو دفعۃً قطعی طلاق دیدے وہ قتل ہونے کے لائق ہے چنانچہ نسائی نے روایت کی کہ ایک شخص نے اپنی جورو کو دفعۃً تین طلاقیں دیدیں یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غصہ میں بھرے ہوئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا اس نے خدا کے حکم کو کھیل بنایا ہے ! اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں تم میں موجود ہوں یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس کو قتل نہ کر ڈالوں ؛ یعنی وہ شخص آنحضرت کی شدت غضب سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کیے جانے کے لائق کام کیا ہے ۔"

اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ " بانی اسلام نے طلاق کے روکنے میں انھیں تہدیدوں اور ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ نکاح اور ملاپ قائم رکھنے کے لیے یہ تدبیر رکھی ہے کہ جب تک تین دفعہ طلاق نہ دی جائے زن و شوہر میں پوری تفریق نہ ہو اور دفعۃً تین طلاقیں دینے کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب فاصلہ سے طلاق دی جائے

ہر ایک میں تقریباً پچیس روز کا فاصلہ ہوتا ہے تاکہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے تو بدستور زن و شوہر ہیں اور دوسری طلاق کے بعد بھی بشرط مصالحت کے اسی طرح ملاپ ہو جائے۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے اور پھر دائمی تفرق ہو جائے۔"

"علاوہ ان ہدایتوں کے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور اُن کے ساتھ مہربانی اور خاطر داری سے پیش آنے اور ان کی سختی اور بدمزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔"

اُس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اِس حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہوا اور اُس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں اور بغیر اُس کے حالتِ معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ پس اُن کے افعال کی نفریں انھیں پر ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر ہم کو امید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کریں گے کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اُس سے بہتر ہو ہی نہیں

سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اُسی استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اُس کے لیے اس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اُس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔

دوسری مثال

جہاد کے طعن پر بھی ازالۃ الاوہام اور استفسار وغیرہ میں عہدِ عتیق کے بیشمار حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ جس شدت اور سختی کے ساتھ جہاد کا حکم انبیائے بنی اسرائیل کو دیا گیا اور جس طرح انبیا نے اس حکم کی تعمیل کی، اسلام میں ویسی شدت اور سختی جہاد کے حکم میں نہیں ہے یہ جواب بھی بلاشبہ عام مسلمانوں کے اطمینان اور عیسائیوں کے ساکت کرنے کے لیے جو کہ تمام عہدِ عتیق کو الہامی جانتے ہیں، کافی تھا، مگر جو لوگ یہودی یا عیسائی مذہب کے قائل نہ تھے اور جہاد کو عموماً خواہ وہ کسی مذہب میں ہو، اصولِ تمدن اور حسنِ معاشرت کے خلاف جانتے تھے اور مسلمان فاتحوں کے افعال کی بدولت خود اسلام کو سب مذہبوں سے زیادہ بنی نوع انسان کی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے اُن کے لیے اور اُن تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو ان معترضین کی تحریریں دیکھتے تھے، کافی نہ تھا۔

سرسید نے خطبات احمدیہ میں اور اس کے سوا اپنی اور بہت سی تحریروں میں اس مغالطہ کو اس طرح رفع کیا ہے کہ فی الواقع کسی انصاف پسند کو، خواہ وہ عیسائی ہو اور خواہ غیر عیسائی، اسلام کے مسئلہ جہاد پر نکتہ چینی کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔ سب سے زیادہ مفصل بحث انھوں نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر میں کی ہے۔ مگر یہاں ہم صرف اُن کی اس تحریر کا نہایت مختصر

خلاصہ جو خطبات میں درج ہے۔ لکھتے ہیں :

"سر ولیم میور نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے مذہب کے معاملہ میں رائے کی آزادی بالکل روک دی بلکہ بالکل معدوم کر دی ہے۔ سرسید نے اُس کے جواب میں اول ایک لمبی تحریر میں اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ جیسی آزادی رائے کی روک عیسائی مذہب میں ہے ایسی دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اگر عیسائیوں کے قول کے موافق اسلام میں آزادی رائے نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کے قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے تو یہ اسلام پر اُن جھوٹے الزامات میں سے ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر لگائے ہیں۔ یا تو وہ لوگ اصول اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ و دانستہ حق پوشی کی نظر سے ایسا کیا ہے۔ جبکہ اسلام دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے تو کیونکر یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ وہ زبردستی منوایا اور قبلوایا جاتا ہے۔ جو لوگ اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الزام قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے کس قدر برخلاف ہے کہ "لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ" یعنی دین کے معاملہ میں کچھ جبر نہیں ہے کیونکہ ہدایت اور گمراہی میں صاف فرق ظاہر ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "جس اصول پر حضرت موسیٰؑ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر استثنا کے قتل و غارت اور نیست و نابود کر دیں۔ اس اصول پر اسلام نے کبھی تلوار

میان سے نہیں نکالی، اُس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کرکے اسلام قبلوانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلاشبہ اُس نے بھی تلوار نکالی مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کی جان و مال کی حفاظت اور اُن کو خداپرستی کا موقع ملنے کو۔ اور یہ وہ منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا۔ ابتدائے سلام میں مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا اور اب بھی بقدر ضرورت وقت کے اُن پر فرض ہے کہ کافروں کے ملکوں میں جائیں اور خدا کی توحید کا یقین اُن کے دل میں بٹھائیں جہاں کوئی ایسے وعظ و نصیحت کا مانع نہیں ہے وہاں اسلام نے تلوار نکالنے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ مگر جب خدا کے نام کی منادی روک دی جائے اور موحدوں کو امن میسر نہ ہو، جیسا کہ مکہ میں کافروں نے کیا کہ جب مسلمان مکہ سے نکل گئے تو بھی اُن کا تعاقب نہ چھوڑا، اُس وقت بلاشبہ اپنے بچاؤ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے۔"

مذکورہ بالا مضمون کو نہایت مفصل و مشرح بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اس بیان سے ان عیسائی مصنفوں کی بھی غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے۔" پھر لکھتے ہیں کہ "ہاں ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتحمندوں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی سے دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کیا، مگر مذہب کا اندازہ اُن کے افعال سے نہیں بلکہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ آیا انھوں نے اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں اس وقت صاف کھل جائے گا کہ اُن کے افعال اسلام کے بالکل برخلاف

تھے مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان فخمند اپنے مذہب کے پابند نھے وہ دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلا لحاظ قوم و مذہب کے ہر طرح کا امن و آزادی بخشتے تھے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس سے اسلام کی طرفداری کی بالکل توقع نہ تھی، اسپین کے علم تاریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ "اسپین کے بنی امیہ خلفا کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات قابل بیان ہے کیونکہ اس سے اسپین کے ہمعصر یعنی عیسائی اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانہ تک ان بادشاہوں کی بڑی عمدگی پائی جاتی ہے، یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی کا دینا۔"

اس کے بعد گاڈفری ہگنز کی رائے اس امر کے متعلق نقل کی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں "کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسی کہ پادریوں کی زبانی اسلام کی مذمت اس وجہ سے سننے میں آتی ہے کہ اس میں تعصب زیادہ ہے اور دوسرے مذہب کو آزادی نہیں ہے یہ عجیب زعم اور محض ریاکاری ہے، وہ کون تھا جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو بایں وجہ کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے جلا وطن کر دیا تھا؟ اور وہ کون تھا جس نے میکسکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دے دیا تھا اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے؟ مسلمانوں نے بمقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے[1] عیسائی

---

[1] مصنف مذکور کے زمانہ میں یونان ترکوں کے قبضہ میں تھا۔

امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور اُن کے مذہب اُن کے پادریوں اُن کے بشپ، اُن کے بزرگوں اور اُن کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے۔ جو لڑائی بالفعل یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں ڈیمرارا کے حبشیوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہبی نہیں ہے۔"

"ایک نہایت دانشمند مگر غیر معتقد عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ "وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب اُن میں خوش و خرم تھے۔ اگرچہ بظاہر مورس اس وجہ سے جلاوطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی بانک رراہب) سمجھتے تھے کہ اُن کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک اُن کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک اُن کا یہ خیال صحیح تھا۔

"خلفا کی تمام تاریخ کی کوئی بات ایسی نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ کوئی مثال اس بات کی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب نہ چھوڑنے کے سبب آگ میں جلایا گیا ہو اور مجھ کو یقین ہے کہ زمانۂ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اُس نے اسلام قبول نہیں کیا۔"

اس کے بعد جان ڈیون پورٹ کی کتاب اپالوجی سے مندرجۂ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں "خونریزی اور بربادی اُن نو احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے تقریباً دو سو برس تک ترکوں پر کیے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک

ہوئے، پھر قتل کرنا ان شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں مانتے تھے کہ انسان کو دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، لوتھر کے پیروں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائی شمال تک ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی میری کے حکم سے قتل ہونا فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا، چالیس برس برس تک اور بہت سی خونریزیوں کا ہونا۔ فرانسیس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک عدالت مذہبی کے حکم سے قتل ہونا جو اب تک اس لیے قابل نفرین ہے کہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا، علاوہ اس کے وہ بیس برس کی خرابیاں جبکہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے زہر خورانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا۔ اور آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیے قتل ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا مکروہ اور گویا ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا۔"

اس کے بعد مشہور عیسائی مورخ مسٹر گبن کی رائے اس آزادی کی تائید میں جو اسلام نے غیر قوموں کو دی ہے نقل کی ہے۔ پھر ایک آرٹیکل سے جو کسی یوروپین مصنف نے ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں چھپوایا تھا، مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے "اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا، ہاں اس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اس کو جبراً جاری نہیں کیا، اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت

پائی جاتی ہے جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے۔"
اس کے بعد فلسطین کے ایک عیسائی شاعر لامارٹین کا یہ قول نقل کیا ہے ہے کہ "صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں۔"
پھر ایک انگریزی سیاح سیلڈن کا یہ قول نقل کیا ہے جو اُس نے بطور طعن کے مسلمانوں کی نسبت کہا ہے یعنی یہ کہ "وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔"
یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "دیکھو یہ سب رائیں بہت سے بے طرفدار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے کے کیسے برخلاف ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے۔"

خطبات احمدیہ کے مضامین کا خلاصہ

ان دو مثالوں کے بعد ہم سرسید کی کتاب کی نہایت مختصر کیفیت جس سے مصنف کی محنت اور جانفشانی کا جو اس کتاب کے لکھنے میں اس نے کی ہے کسی قدر اندازہ ہو سکے گا اور ناظرین کے ذہن میں کتاب کی حقیقت کا ایک دھندلا سا خیال پیدا ہو جائے گا، بیان کرتے ہیں۔

پہلا خطبہ

پہلے خطبہ میں جو سب سے بڑا اور بجائے خود ایک کتاب ہے۔ عرب کا نہایت مفصل تاریخی جغرافیہ مسلمانوں کے اُن بعض مسلمات کے

ثابت کرنے کے لیے جن کا سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار کیا ہے بطور بنیاد مباحث آئندہ کے بیان کیا گیا ہے تاکہ آئندہ خطبات میں اس بات کا فیصلہ آسانی سے ہو سکے کہ مثلاً جبل فاران جس کا نام توریت کی ایک آیت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بشارت نکالتے ہیں آیا وہ بقول اہل اسلام جبال عرب میں سے ہے یا بقول سر ولیم میور کے جبال شام میں؛ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں آباد ہوئے یا بقول سر ولیم میور کے آباد نہیں ہوئے؟ یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمٰعیلؑ کی کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سر ولیم میور کے ثابت نہیں ہے؟ اس خطبہ میں سر سید نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققوں کی شہادتوں سے اپنے ہر ایک دعوے پر سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے برخلاف استدلال کیا ہے۔

دوسرا خطبہ

دوسرے خطبہ میں عرب جاہلیت کی رسوم و عادات اور خیالات و عقاید اچھے یا برے، جہاں تک کہ شعرائے جاہلیت کے اشعار اور دیگر معتبر ذریعوں سے معلوم ہوئے، بیان کیے ہیں اور جس قدر باتیں اشعار سے استنباط کی ہیں اُن کے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دیے ہیں جن سے ان باتوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ لوگوں کو اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی اور اسلام کے بعد اُن کے اخلاق اور عادات اور عقاید و خیالات کس درجہ تک تبدیل ہو گئے۔

تیسرا خطبہ

تیسرے خطبہ میں اُن ادیان مختلفہ کا جو اسلام سے پہلے عرب میں شائع ہونے اور اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ان تمام ادیان میں کون سے دین سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے؟ اس خطبہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے چار فرقوں میں منقسم تھے، بت پرست، خدا پرست، لامذہب اور معتقدین مذہب الہامی۔ ان میں سے اول کے تین فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد عرب کے الہامی مذاہب کی تفصیل بیان کی ہے:

۱۔ مذہب صابئین۔

۲۔ مذہب ابراہیم اور دیگر انبیائے عرب یعنی ہودؑ، صالحؑ، اسمٰعیلؑ اور شعیبؑ کا۔

۳۔ مذہب یہود۔

۴۔ مذہب عیسوی۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ: "ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعتاً اسلام نمودار ہوا اور اس کو حیرت آمیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعتاً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھرپور کر دیا" اس کے بعد انھوں نے مفصل بیان کیا ہے کہ اسلام نے عرب کے مذاہب مذکورہ میں کیا کیا اصلاحیں کیں! کن باتوں کو قائم رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی! اس کے بعد جو اکثر عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام درحقیقت اصول و عقاید متفرقہ و منتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے، اُس کا اس طرح جواب دیتے ہیں کہ، "ہر ذی فہم شخص پہ یہ بات ظاہر ہوگی کہ یہ مشابہت

اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہی غیر متبدل اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی۔ جس طرح کہ خدا تعالےٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض اصول اور احکام اُس کی ذات سے صادر ہوں مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیئے جنھوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھیرایا، جنھوں نے دنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنھوں نے اپنے باایمان متبعین کے لیے بےبہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیے۔"

چوتھا خطبہ

چوتھے خطبہ میں اس بات کا نہایت شافی ثبوت دیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور اس سے موسوی اور عیسوی مذہب کو نہایت فائدے پہنچے ہیں۔ اس خطبہ کو سرسید نے اس طرح شروع کیا ہے کہ "یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اس کا لکھنا یا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب دل پیدا کرنا چاہیے کیونکہ طرفدار دل سچے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتا۔ اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانی مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اُس کو ظاہر کرتے ہیں مگر جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناطرفدار دل اور سیدھی سادی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا

ہے اور اسی لیے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دوسرے کو یقین نہ دلا سکیں گے تو اس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے ؟

خطبۂ ۴ کا پہلا حصہ

مصنف نے اس مضمون کو چار حصوں پر منقسم کیا ہے جن میں سے پہلے حصہ میں وہ فائدے بیان کیے ہیں جو اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں اور اُس کے ثبوت میں اُن مشہور اور نامور عیسائی مصنفوں کے اقوال نقل کیے ہیں جنھوں نے اسلام کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت شہادتیں دی ہیں جیسے سر ولیم میور جن کی نسبت سرسید لکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے ۔ ایڈورڈ گبن جان ڈیون پورٹ ٹامس کارلائل وغیرہ وغیرہ ۔

دوسرا حصہ

دوسرے حصہ میں اُن عیسائی مصنفوں کی رائے کی تردید کی ہے جنھوں نے اسلام کو نوع انسان کی معاشرت کے حق میں مُضر بتلایا ہے اور اُس میں بھی یورپ کے بہت سے نامور اور محقق مصنفوں کی شہادتوں سے استدلال اور اسلام کا مقابلہ حسن معاشرت کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے ۔

تیسرا حصہ

تیسرے حصہ میں اُن فائدوں کا بیان ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں

مذہبوں کو بالاشتراک اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔ یہ دونوں حصے خطبۂ مذکورہ کے چونکہ بہت طولانی ہیں اور خلاصہ میں اُس کی خوبی باقی نہیں رہ سکتی اس لیے ان کو اصل کتاب میں دیکھنا چاہیے۔ مگر تیسرے حصہ کا صرف ایک فقرہ بطور نمونہ کے یہاں لکھا جاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ " اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ منسوب کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اُن تحریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی اُن تمام تحریروں کو الہام ربانی اور ان نبیوں اور مقدس لوگوں کو ان افعال قبیحہ[1] کا مرتکب یقین کرتے تھے۔ اسلام نے ان معصوم نبیوں اور خداپرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا اور جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے اُن پر لگائے تھے اُن کو نہایت عقلمندی سے دفع کیا اور ان بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے کہ انبیاء و پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں، توریت کو بڑے غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور جن وجوہ سے وہ غلطی میں پڑے تھے اُن کو بخوبی دریافت کیا۔ بس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ، ان کی بیٹیوں، حضرت اسحٰقؑ، یہودا، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹیوں، ہارونؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی ایک بدکار آدمی کی

---

[1] یہ عہد عتیق کے اُن درسوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حضرت لوطؑ، حضرت داؤدؑ وغیرہما کی طرف زنا اور دیگر افعال قبیحہ کی نسبت کی گئی ہے ۱۲۔

خراب ہوتی ہے، وہ تمام دنیا کی نظروں میں ایسے ہی حقیر ہوتے جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں یا اُن کے گناہوں کی سزا کے لیے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے اِن تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پہنچا دی جس کے وہ مستحق تھے۔"

چوتھا حصہ

پھر اسی خطبہ کے چوتھے حصہ میں اُن فائدوں کو بیان کیا ہے جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی مذہب کو اس قدر فائدے نہیں پہنچائے ہیں عیسائی مذہب کی بنیاد اس نیک اور حلیم شخص (یعنی حضرت یحیٰی پیغمبر) سے ہے جو خدا کے رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دارومدار اس عجیب شخص پر ہے جس کو انھوں نے اتنا بزرگ اور مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰؑ پر)، مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادہ اور نڈر دل اور نہایت استوار ثابت قدمی سے عیسائی مذہب کا طرفدار ہوا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ جان دی باپٹسٹ (یعنی حضرت یحیٰیؑ) بلاشبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسٰیؑ بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے پس کونسا مذہب اس بات کا دعوے کر سکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اُس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں

اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے۔"

"وہ جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی ہے وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ اس لازوال مسیح کے بھی متناقض تھا اور ان خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسیٰؑ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال عظمت کا باعث ہے کہ اسی نے خدائے ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اُس خاص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت نے کی تھی اسلام ہمیشہ اُس زمانے کے عیسائیوں کو اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرتا رہا اور اب بھی متنبہ کرتا رہتا ہے۔ اسلام نے عیسائیوں سے اُسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے " قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا " بہت سے عیسائیوں کی آنکھیں اسلام کی روشنی میں کھل گئیں اور اس ذلیل حالت سے وہ خبردار ہوئے جس میں مبتلا تھے اور انھوں نے پھر اُسی رتبہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے اُن کو حاصل تھا۔ یعنی انھوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدے کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہٗ لاشریک لہ اور عیسیٰ مسیح کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب یونیٹیرین یعنی موحدین سے معزز ہے۔"

اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لیے دنیا سے اٹھا لیا جائے تو مسٹر گبن کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائے گی کہ " اگر سینٹ

پیٹر یا سینٹ پال[1] پوپ کے محل میں آجائیں تو غالباً وہ اُس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسے پُر اسرار رسومات کے ساتھ اُس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے. آکسفورڈ یا جنیوا میں جاکر اُن کو چنداں حیرت نہ ہوگی مگر گرجا میں جاکر سوال و جواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول[2] مفسروں نے اُن کی تحریرات اور اُنکے مالک یعنی عیسیٰ مسیح کے کلمات کی تفسیر کی ہے اُس پر غور کرنا پڑے گا۔"

اس کے بعد سر سید لکھتے ہیں کہ "جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے اُن میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونک دی. تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا اختیار نائب سمجھتے تھے اور اس کو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں. ان کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے. پوپ گنہگاروں کے گناہوں کو بخش دینے کا دعویٰ رکھتا ہے. پوپ کو پورا اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے. درحقیقت پوپ بلحاظ اُن اختیارات کے جو اس کو حاصل تھے اور جن کو وہ کام میں لاتا تھا کسی طرح حضرت عیسیٰ سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو خرابیاں اُس سے پیدا

---

[1] سینٹ پیٹر یعنی پطرس حواری اور سینٹ پال یعنی پولوس مقدس ۱۲۔

[2] صادق القول کا لفظ مسٹر گبن نے بطور طنز کے لکھا ہے جس سے مراد تحریف کرنے والے مفسر ہیں ۱۲

ہوئی ہیں اُن کو تبلایا اور جا بجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی اور اُن کو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لیے سچ کی جستجو کریں چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا:

"قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" اور پھر دوسری جگہ فرمایا "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحَانَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ"

ور جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم جو اُس وقت عیسائی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اُن کے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عدی اس بُت کو اپنے گلے سے نکال پھینک۔ چنانچہ نکال ڈالی جب وہ پاس آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" جب آپ پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ "ہم تو اُن کی پرستش نہیں کرتے" آپ نے فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اُس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر تم بھی اُس کو حرام سمجھتے ہو اور حلال ٹھیراتے ہیں وہ اُس چیز کو جسے خدا نے حرام کر دیا سو تم بھی اس کو حلال سمجھنے لگتے ہو۔ عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس یہی اُن کا پوجنا ہے۔

"ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھتے رہے اور اس کے ہر ایک مسئلہ سے بے سمجھی سے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں کے کچھ تھوڑی بہت غور سے اُسے دیکھا اور کالون اور لوتھر

مقدس کے دل پر اس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ اُن دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جن میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرے خدا یا چھوٹے خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلہ نے اُن کے دل پر اثر کیا اور جیسی کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور پادری ہے وہ چلا اٹھے کہ پالیا پالیا اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور اُن کے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اُس کے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے جس کی بدولت ہم کروڑوں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام عیسائی مذہب کو یہ نعمت نہ بخشتا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھلک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم مورت صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں پس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔

"چوں کہ درحقیقت لوتھر مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لیے اُس کے مخالف علانیہ اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا۔ کوارٹرلی ریویو نمبر ۲۵۲ میں لکھا ہے کہ جینی براہ ڈ نے پوپ کی طرف سے جرمنی کے ریفارمروں اور خصوصاً لوتھر کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرا کسی کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں اور لوتھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں کا میلان جو بت پرستی کے برخلاف ہے اُس پر غور کرو۔ مارشیس، الفانس

اور والڈس کہتے ہیں کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھر کے مذہب میں ایک رتی بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد یعنی پیروان لوتھر کرتے ہیں؎

تاہم لوتھر نے اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا اور آخرکار اس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلاموں کی بدترین غلامی سے جو ایک مرشدانہ غلامی تھی، آزاد کر دیا ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور وہ مسئلہ تثلیث کے مخالف ہوتے ۔ اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی، جو درحقیقت حضرت عیسیٰؑ نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلا نے اور آخرا ئس نبی آخرالزمان صلعم پر یقین کرنے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسانمند رہنا چاہیے؎

پانچواں خطبہ

پانچویں خطبہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی کتب حدیث کتب سیر تفاسیر اور کتب فقہ کی تصنیف کا منشا اور غرض اور ڈھنگ بیان کیا ہے تاکہ غیر مذہب کے محقق اور نکتہ چین جو اسلام کی نسبت آیندہ زمانہ میں کچھ لکھنا چاہیں اُن کو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی طرز تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور وہ اُن مصنفوں کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کے سبب غلطی میں پڑے

ہیں گمراہ نہ ہوں اور اُن کی رہبری کے لیے ایک سید ھا رستہ بن جائے۔

چھٹا خطبہ

چھٹا خطبہ مذہب اسلام کی روایت پر لکھا گیا ہے یہ خطبہ کسی قدر طولانی ہے اس لیے صرف اُس کی سرخیاں لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اس میں اول زوایت کی اصلیت اور یہ کہ ان کے رواج کی ابتدا کیونکر ہوئی اور نیز یہ کہ دین اسلام صرف انھیں صحیح روایتوں میں منحصر ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہیں نہ دیگر دنیوی امور سے۔ بیان کیا ہے۔ پھر جھوٹی روایت کرنے کا امتناع اور اس کی سزا جو اسلام میں مقرر ہے، درجاتِ احادیث بلحاظ ثقہ ہونے رواۃ کے راویوں کا درجۂ اعتبار بلحاظ تفقہ کے یہودیوں سے روایت کرنے کی اجازت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو دی، اختلاف روایت کے اسباب احادیث موضوعہ کا بیان، یہ تمام باتیں مفصل بیان کی گئی ہیں اس کے بعد سر ولیم میور نے جن روایات سے استدلال کرکے اسلام اور بانی اسلام پر اعتراضات وارد کیے ہیں اُن اعتراضوں کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح سے دیا ہے۔

یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری اور مفید اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جس کے اُجالے میں کوئی غیر مذہب مصنف بشرطیکہ اُس نے آنکھیں بند نہ کرلی ہوں ٹھوکر نہیں کھاسکتا۔

ساتواں خطبہ

ساتویں خطبہ میں اول قرآن مجید، اُس کا نزول، اس کی سورتوں اور آیتوں

کی ترتیب، اس کی مختلف قراتیں، آیات ناسخ و منسوخ کی بحث، اس کے جمع ہوتے کا زمانہ اس کی نقلوں کی اشاعت اور اس کا کامل اور الہامی ہونا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیاں جو انھوں نے قرآن مجید کے متعلق کی ہیں بیان کی ہیں۔

ان غلطیوں کا اصل منشا وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کراتے اور مختلف ملکوں میں شایع کرتے، یورپ کی زبانوں میں بے شک اس کے ترجمے ہوئے مگر وہ سب غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کیے۔ ابتدا میں جس طرح پر بذریعہ ان ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یورپ میں ہوا اس کا بیان گاڈفری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شائع ہوتا کہ ہر لفظ قابل تبدیل یعنی محتمل المعنیین، متین اور شائستہ معنی سے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنچانے کا ذریعہ بنایا جاتا، ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی، تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا جس کی وساطت سے یورپ میں قرآن کی اشاعت ہوئی۔"

اس کے بعد سر سید نے سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی تشریح کی ہے اور جو اعتراض انھوں نے غلط فہمی سے قرآن وارد کیے ہیں ہر ایک کا جواب دیا ہے۔

آٹھواں خطبہ

آٹھواں خطبہ خانہ کعبہ کے حالات اور اس کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات

پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ یقطان جس کا ذکر توریت میں جا بجا آیا ہے اہل عرب کا اُس کی اولاد میں ہونا حضرت اسمٰعیلؑ کا مکہ کے قریب آباد ہونا خانہ کعبہ کی تعمیر اور اس کی تمام مراسم کا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے تعلق ہونا، یہ سب بناوٹ اور افسانہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور مورخانہ احتمالات و قیاسات سے نہایت بعید ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "حجر اسود کو بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منا میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیم سے یا اُن خیالات و اصول سے جو غالباً اُن کی اولاد کو اُن سے پہنچے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں۔ یا اُن کو بُت پرستی کے اُن اصول سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا" اس دعوے سے اُن کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو آگے چل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی اسمٰعیل ہونے سے انکار کیا ہے اور آپ کے نسب نامہ پر شبہات وارد کیے ہیں اُن کے لیے ایک وجہ ہاتھ آئے۔

سر سید نے اس خطبہ میں نہ صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ زیادہ تر یورپ کے عیسائی محققوں اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد کا حجاز یا عرب میں آباد ہونا ثابت کیا ہے اور اس کے بعد توریت کی نہایت صریح شہادتوں سے اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ حجر اسود اور قربانی کی رسم اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد سے تعلق ہے۔ انھوں نے توریت کے بہت سے

حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد یعنی حضرت اسحٰقؑ حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسٰیؑ سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لیے ایک بن گھڑا پتھر مثل حجر اسود کے کھڑا کر کے مذبح بناتے تھے اور اس کو بیت ایل یعنی بیت اللہ کہتے تھے اور تمام مراسم جو موسم حج میں خانۂ کعبہ اور اس کے قرب وجوار میں مسلمان ادا کرتے ہیں ان سب کا تعلق حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ ایسے طور پر ثابت کیا ہے جس سے فی الواقع سر ولیم میور کے شبہات ہر منصف مزاج آدمی کی نظر میں نہایت بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہ کعبہ اور حجر اسود کی نسبت کتاب پیدائش اور کتاب خروج کے متعدد بابوں اور آیتوں کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ "حجر اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیمؑ اسحٰقؑ یعقوبؑ اور موسٰیؑ بناتے تھے۔ یہ سب بزرگ ایسے پتھر کی تعظیم کرتے تھے۔ یعقوب نے اس پر تیل ڈالا جو اس زمانے کے دستور کے موافق غایت الغایۃ تعظیم پرستش کے قریب تھی یعقوبؑ نے کہا کہ یہ جگہ خانۂ خدا ہوگی اور خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تاکہ تمہاری شرمگاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے۔ پس اب کونسا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیمؑ میں جاری نہ تھا جس پر سر ولیم میور حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو بنی ابراہیمؑ کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں۔"

"ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا، جیسے کہ کعبہ ہے اگر ابراہیمؑ کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا یعنی موسیٰؑ جس نے بمقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا۔ اور وہ کون تھا یعنی داؤدؑ) جس نے خرمنگاہ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا اور پتھر و لکڑی و

لوہا و پیتل اُس کے بنانے کو جمع کیا۔ اور وہ کون تھا یعنی سلیمانؑ جس نے بعد کو خرمنگاہِ ارنانِ یبوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا۔ پس کعبہ کی بنا کو اور اُس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بنانا نہایت تعجب کی بات ہے۔"

اس کے بعد عرفات کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ "عرفات جس کو سر ولیم میور بت پرستوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، ایک ایسی چیز ہے جو خاص ابراہیمؑ اور اس کی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے۔ ہزاروں جگہ توریت میں آیا ہے کہ خدا ابراہیمؑ کو مرئی ہوا۔ خدا اسحاقؑ کو مرئی ہوا۔ خدا یعقوبؑ کو مرئی ہوا۔ خدا موسیٰؑ کو مرئی ہوا۔ بس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں جس پہاڑ پر جو قریب مکہ کے ہے۔ خدا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو مرئی ہوا۔ اس پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے۔ معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے جبل عرفات کو کیا سمجھا جو اُس کی نسبت کہا کہ اس کو ابراہیمؑ رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ عرفات کا استعمال بجز خاندان ابراہیمؑ کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صرف حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں۔ وہاں کوئی چیز نہیں ہے پہاڑ تلے کا میدان ہے۔ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کو یاد کرتے ہیں۔ وہاں خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں [illegible] تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ موسیٰؑ نے کوہ سینا کی تلہٹی میں سنائے تھے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بُت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیمؑ سے۔"

اس کے بعد منا کی نسبت لکھتے ہیں کہ "منا کا مقام صرف قربانی کے لیے ہے ، وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی۔ تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بیت اللہ بنا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا منا اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہے۔ اس لیے قربانی نذر کرنے کے لیے وہ مقام قرار دیا گیا تھا۔ ہاں ابراہیمؑ و یعقوبؑ و اسحٰقؑ اور موسیٰؑ اور داؤدؑ و سلیمانؑ کی قربانی اور اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اُس قربانی میں جانور کو مار کر اُس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اُس کی خوشبو یعنی چراند پسند آتی تھی اور اسلام میں وہ قربانی غربت و محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں۔ اگر اسی امر کے سبب سر ولیم میور نے منا کی رسومات کو بت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ذی عقل اُس پہلی قربانی سے اس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔"

یہ خطبہ بہت لمبا ہے۔ اس کی اصل خوبی بغیر اس کے کہ اُس کو اول سے آخر تک اصل کتاب میں دیکھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس میں سر ولیم میور کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد خانۂ کعبہ اور مکہ معظمہ کی تاریخ محققانہ طور سے مفصل بیان کی گئی ہے۔

نواں خطبہ

نواں خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔
اس خطبہ کے لکھنے کا یہ منشا یہ تھا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی اسمٰعیلؑ ہونے سے انکار کیا ہے چنانچہ وہ ایک

جگہ لکھتے ہیں کہ "غالباً یہ کوشش کہ وہ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) اسمٰعیل کے نسل سے ثابت کیے جائیں اُن کی عین حیات میں پیدا ہوگئی تھی اور اس طرح پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیلؑ اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے" سر ولیم میور کو نسب پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت غالباً اس سبب سے ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب سیر کی کتابوں میں صرف عدنان تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر عدنان کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ تک جتنی پشتیں اہلِ سیر نے لکھی ہیں ان میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔

اسی بنا پر اس خطبہ کے اول میں سر سید نے ایک نہایت عمدہ تمہید لکھی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "زمانۂ جاہلیت میں عرب کے لوگ کوئی فن نہیں جانتے تھے مگر دو باتیں ان میں بےمثل تھیں، ایک شاعری، دوسرے علم الانساب۔ چونکہ ان کے ہاں کتاب کا رواج نہ تھا اور صرف حافظہ پر مدار تھا اس لیے وہ اپنے اپنے قبیلہ کی تمام پشتیں تا بمقدور سینہ بہ سینہ یاد رکھتے تھے اور اپنے نسب پر فخر کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے نسب میں عیب نکالتے تھے مگر چونکہ بغیر کتاب کے کسی قبیلے کی تمام پشتوں کو بہ ترتیب یاد رکھنا غیر ممکن تھا اس لیے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے تھے لیکن باقی کے نام کچھ یاد رہتے تھے اور کچھ بھول جاتے تھے مشاہیر کے نام یاد رہنے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ اُن کے نام اور اُن کے کارنامے اشعار میں بیان ہوتے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں وہ اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ان وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں

اور اپنے ہمسایہ اور مخالف کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قبیلہ اور کس نسل سے ہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے اور جھوٹ موٹ اپنے کو کسی دوسری نسل کا بتا سکے۔ اگرچہ کسی کو کسی قبیلے کی نسلیں بہ ترتیب یاد نہ ہوں مگر ہر ایک قبیلے میں جو نامور اور قابل فخر اشخاص ہوتے تھے وہ سب کو یاد رہتے تھے۔ اسی لیے جب اسلام کے زمانہ میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج ہوا اور ایک مدت کے بعد مورخین نے کسی کا پورا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہا ان کو ایسی دقتیں پیش آئیں جن کا حل کرنا بہت دشوار تھا کیونکہ نسب ناموں کے بہ ترتیب یاد نہ ہونے کے علاوہ دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے۔ شام و عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامہ کے اشخاص میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا باپ کی جگہ اس کا نام لے دیتے تھے جیسا کہ انجیل متی میں حضرت عیسیٰ کی نسبت لکھا ہے کہ "نسب نامہ عیسیٰؑ مسیح بن داؤد ابن ابراہیمؑ" حالانکہ مسیحؑ سے داؤدؑ اور داؤد سے ابراہیمؑ تک بہت سی پشتیں درمیان تھیں مگر چونکہ داؤد اور ابراہیمؑ نہایت مشہور اشخاص تھے اس لیے مسیحؑ کو داؤد کا اور داؤد کو ابراہیمؑ کا بیٹا بتا دیا۔

"عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنا کرسی نامہ بیان کرتے وقت جب آباو اجداد کے نام ان کی یاد کے موافق ختم ہو جاتے تو اخیر یاد رہے ہوئے شخص کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے۔ ان اسباب سے مورخوں کو ان کے نسب نامے سلسلہ وار لکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں۔ آپ کو اپنا کرسی نامہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ تمام عرب کے لوگ یقیناً آپ کو قبیلہ قریش سے اور قریش کو معد ابن عدنان کی اولاد ہیں اور عدنان کو قیدار ابن اسمٰعیلؑ ابن ابراہیم کی اولاد میں جانتے تھے اور اسی قدر ان کا جاننا آپ کے بنی اسمٰعیل ہونے کے لیے کافی تھا، گو کہ درمیان میں کتنی ہی پشتیں گزری ہوں۔ اسی لیے کوئی صحیح روایت آپ کے نسب نامہ کے متعلق موجود نہیں ہے سوا اس کے کہ آپ نے فرمایا

"ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے ولی ہیں"

"پس جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ بہ ترتیب لکھنا چاہا تو ان میں اختلاف ہونا ایک ضروری امر تھا۔ آنحضرتؐ سے لے کر معد ابن عدنان تک کسی مورخ کا اختلاف نہیں ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ معد بن عدنان سے اسمٰعیلؑ تک کی پشتوں میں ہے۔ صرف پانچ شخص ہیں جن کے لکھے ہوئے نسب ناموں میں معد ابن عدنان سے لے کر ابراہیمؑ تک پشتوں کا بیان ہوا ہے"

اس کے بعد سر سید نے تین نسب ناموں کو غلط بتایا ہے، کیوں کہ ان میں قطع نظر اختلافات کے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو زمانہ عدنان اور ابراہیم کے درمیان گزرا ہے وہ نو یا دس یا گیارہ پشتوں سے (یعنی فی صدی تین پشتوں کے مسلمہ قاعدے کے موافق) پورا نہیں ہوتا۔ اب دو نسب نامے باقی رہ گئے ایک برخیا کاتب الوحی اور سیابی کا، دوسرا الجرا کا۔ ارسیابی جیسا کہ بائبل سے ثابت ہے خود معد ابن عدنان کے زمانے میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامہ میں انھوں نے معد کو بچایا تھا اور اپنے ساتھ لے گئے

تھے۔ یہ قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ اُن کو معد کا نسب نامہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس نسب نامہ کو مسعودی اور واقدی دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مگر اس نسب نامہ سے بھی اگر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان تک جتنی پشتیں ہیں اُن کو شامل کر لیا جائے تو وہ زمانہ جو آنحضرت سے ابراہیم تک ہی پورا نہیں ہوتا۔

جو شجرہ الجرا نے لکھا ہے وہ بھی اب تک ایک جدا نسب نامہ سمجھا جاتا تھا مگر سرسید نے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ وہ جدا نسب نامہ نہیں ہے بلکہ برخیا کے نسب نامہ کا تتمہ ہے کیوں کہ اس کو تتمہ فرض کرنے کی صورت میں آنحضرت صلعم سے اسمٰعیلؑ تک ستر پشتیں ہوتی ہیں جو فی صد تین پشت کے مسلمہ قاعدے کے موافق اس زمانہ پر بالکل منطبق ہو جاتی ہیں جو اسمٰعیل کی ولادت اور آنحضرت کی ولادت کے درمیان گزرا ہے یعنی دو ہزار چار سو چھہتر برس کا زمانہ۔

سر ولیم میور بطور طعن کے لکھتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے" اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ "بلاشبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمٰعیل کی اولاد تھے اور بنی اسرائیل اسحٰق کی۔ وہ اَن پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُس کو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی اُسکا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں خصوصاً اس وجہ سے کہ آنحضرتؐ نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تھی۔"

"پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا جس

کا کبھی مذکور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہیں ہوا تو بلا شبہ انھوں نے اپنے بنی اسرائیل بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا اُن کے ہاں رواج تھا، مدد لی۔"

اس کے بعد سر سید کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ "نہایت تعجب ہے کہ عیسائیوں نے کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور از راہ طعن ہماری نسبت کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں باتیں یہودیوں سے لی ہیں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا مذہب ہے اور جیسے کہ عیسائی مذہب یہود کا بالکل محتاج ہے اسی طرح اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے ہم نہایت خوشی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو مشابہت ان دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اُس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اُس کو نہایت فخر سمجھتے ہیں۔ صرف ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و یعقوبؑ و اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا جیسا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ "قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ۔" ہم مسلمانوں کا یہی فخر ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائی سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنھوں نے یحییٰؑ و عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور اُن کی پیروی کی ہدایت کی تھی۔ مگر یہودیوں نے اُن تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ مانا اور اُن کی سچی پیروی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے۔ خدا کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا تھا کہ "میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا، کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسمٰعیلؑ کی نسلیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اسمٰعیل تک ہم کو ترتیب وار اور پوری پوری یاد ہوں اور نہ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کی تحریروں سے لیں۔ وہ اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پورا ہوا تمام عرب اور یہود اور عرب کے قریب وجوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے اور مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم، قریش، اسمٰعیلؑ ابن ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ابیکم ابراہیم جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچی بات کو تسلیم نہ کرے۔"

اس کے بعد ابوالفدا مسلمان مورخ اور مسٹر گبن اور ریورنڈ فاسٹر عیسائی مورخوں کی شہادتیں نقل کی ہیں جن میں سے گبن کا قول یہ ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیر اور متبذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افترا ہے۔ ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے کہ اس سے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں ان کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں۔ اسمٰعیلؑ سے ان کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کرسی نامہ

کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف منجیب ہیں، وہ قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرمانروا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے۔ یہی رائے مسلمان مورخ یعنی ابو الفدا کی ہے اور یہی گواہی ریورنڈ مسٹر فاسٹر نے دی ہے۔

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب نامہ جس طرح پر کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور چونکہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اسی آفتاب عالمتاب کے ذرّوں میں سے ہوں اس لیے اپنے نسب کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سردار دوجہاں سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اس سرور عالم میں ہے اور جس کے سبب لَحْمُكَ لَحْمِیْ وَدَمُكَ دَمِیْ ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے معزز ہو جائے۔

گرچہ خردیم نسبتے ست بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم"

دسواں خطبہ

دسواں خطبہ اُن بشارتوں کے بیان میں ہے جو توریت اور انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی بابت مذکور ہیں اس خطبہ میں اول سرسید نے قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس بات کا بیان ہے کہ توریت و انجیل میں آپ کی نبوت کی خبریں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے وہ وجوہات بیان کی ہیں جن کے سبب سے اکثر قدیم مسلمان عالموں نے انبیائے سابقین کی کتابوں کا پورا پورا اعتبار نہیں کیا اور اس لیے انھوں نے توریت و انجیل میں اُن بشارتوں کی زیادہ تفتیش نہیں کی اور تحریف کا عذر

پیش کرکے اُن بشارتوں کے نشان دینے سے جن کی قرآن میں جابجا خبر دی گئی تھی دست بردار ہو گئے۔ پھر اُن محققین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نہایت کوشش اور استقلال سے اُن کی تفتیش کی اور توریت و انجیل میں بہت سے ایسے مقامات دریافت کیے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ مگر چونکہ ان کی نشان دہی ہوئی بشارتیں جو ہماری مذہبی کتابوں اور تفسیروں اور سیر و تواریخ میں مذکور ہیں اُن کی بابت کچھ پتا نہیں دیا گیا وہ بائبل کی کونسی کتاب اور کون سے باب اور کون سے ورسوں میں بیان ہوئے ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی قدیم نسخے جن میں کثرت سے اختلاف عبارت تھا اور جن کے جدا جدا نام تھے اُن میں سے کون سے نسخوں میں وہ بشارتیں پائی گئیں اور نہ یہ جتایا گیا کہ بائبل کی بہت سی کتابیں اب مفقود ہیں یا جن کو عیسائی اب نامعتبر سمجھتے ہیں وہ بشارتیں اُن میں سے لی گئی ہیں یا موجودہ مسلمہ کتابوں میں سے۔ اس لیے سرسید نے صرف چند[1] بشارتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہایت صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں اور جو موجودہ مسلمہ مجموعہ عہد عتیق و عہد جدید میں موجود ہیں جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں اس خطبہ میں بیان کی ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے وہ طریقہ جس طریقہ سے کہ بائبل میں پیشین گوئیاں آنے والے پیغمبر کی نسبت بیان ہوئی ہیں بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اُن کا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پہیلی یا معمے کا بیان ہوتا ہے جب تک کہ

---

[1] ان میں سے اکثر بشارتیں سرسید سے پہلے ہمارے زمانہ کے بعض علمانے مسلمہ مجموعہ بائبل سے بحوالہ باب اور درس سے نقل کی ہیں مگر جس عمدگی سے ساتھ خطبات میں ان کا بیان ہوا ہے ویسا کسی نے بیان نہیں کیا ۱۲۔

اُن کی تشریح نہ کیجائے اور ان کا حل نہ بتایا جائے اُن کا مطلب ہر ایک کی سمجھ نہیں آسکتا. اس لیے پہلے اس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں بیان کریں انھوں نے اول بطور مثال کے عہد عتیق کی وہ بشارتیں لکھی ہیں جن کو حواریوں نے حضرت عیسیٰ کے حق میں بتایا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ بائیبل میں پیشین گوئی کس طریقہ سے بیان کیجاتی ہے اور نیز حضرت عیسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوجائے کہ کونسی بشارتیں زیادہ روشن اور صاف ہیں اور کونسی مبہم اور دھندلی۔

اس کے بعد انھوں نے چھ بشارتیں عہد عتیق سے اور تین بشارتیں عہد جدید سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بیان کی ہیں ۔ از انجملہ عہد عتیق کی تین بشارتیں جن میں سے ایک توریت کتاب استثنا باب (۱۸) میں اور دوسری کتاب استثنا باب (۳۳) کتاب حبقوق نبی باب (۳) میں اور تیسری کتاب تسبیحات سلیمان باب (۵) میں مندرج ہے اور انجیل یوحنا باب (۱۴) میں سے ایک بشارت، یہ چار بشارتیں نہایت معرکۃ الآرا ہیں جن کی یہودیوں اور عیسائیوں کو عجیب عجیب تاویلیں کرنی پڑی ہیں اور عیسائیوں نے اُن کے ترجموں میں عجیب عجیب کارستانیاں کی ہیں. سرسید نے ان چاروں بشارتوں کی جیسے کہ چاہیے اس سے بھی کچھ بڑھ کر تحقیقات کی۔ بڑے بڑے عیسائی محققوں کے اقوال اور بائیبل کے حوالوں سے اپنے استدلالات کو تقویت دی ہے اور اپنے بیان کو فی الواقع اُس حد تک پہنچادیا ہے کہ کسی عیسائی کو باوجود ماننے عیسیٰ مسیح کی پیشین گوئیوں کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں سے انکار کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔

گیارھویں خطبہ

گیارھویں خطبہ میں معراج اور شق صدر کی حقیقت محققانہ طور سے بیان کی ہے اور اس باب میں جس قدر مختلف اور متناقض روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں اُن کا اختلاف اور تناقض دکھایا ہے اور اس لیے جس قدر کہ قرآن مجید میں معراج کی نسبت بیان ہوا ہے صرف اُسی پر معراج کے واقعہ کا انحصار رکھا ہے اور معراج کو رویا پر محمول کیا ہے جس کا ایک جزو شق صدر بھی تھا اور عیسائیوں کی طعن کا جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح کا دیا ہے۔

یہ دونوں بحثیں یعنی معراج اور شق صدر کی سرسید نے خطبات لکھنے کے بہت بعد اپنی تفسیر میں بہت زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کی ہیں جیسی کہ ان سے پہلے شاید کسی نے نہیں بیان کیں اس لیے اُن دونوں بحثوں کو تفسیر میں دیکھنا چاہیے۔

بارھواں خطبہ

بارھویں خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کا حال جس قدر کہ معتبر اور صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے بیان کیا ہے اور جو بیشمار رطب ویابس روایتیں اہل سیر نے اپنی کتابوں میں بھر دی ہیں اور جن کی رو سے سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں جابجا تعریضیں کی ہیں ان کی تضعیف کی ہے اور اکثر جگہ بر تقدیر اُن کی صحت کے نہایت لطیف جواب سر ولیم میور کی تحریرات کے دیئے ہیں۔ مثلاً سر ولیم میور نے جو بارہ برس تک کے بعض واقعات تعریضاً بیان کیے ہیں۔ جیسے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، اپنی رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پہ رونا۔ اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان باتوں کی کوئی معتبر سند نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کرلی جائیں تو یہ ایسی باتیں ہیں جو ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے، انھوں نے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ "إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ" بس ایسی باتیں اگر ہوئیں بھی تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔"

یا مثلاً سرولیم میور بارہ برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شام کا حال ابوطالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "زمانۂ سابق کے منہدم اور اجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیالی قصوں اور عجیب و غریب بیانوں اور دل انگیز روایتوں نے اور بھی پُر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کی صلیبوں اور صورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ ہونے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خوش کنندہ دل و دماغ پر ایک گہرا نقش اور پایدار اثر کر دیا تھا۔"

سرسید اول تو سفر شام میں چچا کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے اور اس کے بعد بر تقدیر تسلیم لکھتے ہیں کہ "ہم نہایت ادب سے سرولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص (جیسا کہ سرولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت لکھا ہے) کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصروع شخص

خوض کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے! اگرچہ یہ بیان سرولیم کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی سے اس قدر اثر پذیر ہوا تھا۔ بعد کو انھیں چیزوں سے مخالفت اختیار کی۔ صلیب کو توڑا۔ مورتوں کو پھوڑا، ان کی پرستش سے منع کیا اور بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں، تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا۔ خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا۔"

"لیکن اس بات کو تسلیم کر کے درحقیقت مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر اثر کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گذرتی تھی پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے، ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے اُن کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود وغیرہ حاضر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا وہ۔ بلاشبہ مادر زاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت دہ اس کی معلم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہہ کر بشارت دی ہے کہ "سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لیے ضرور ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط یعنی احمد مجتبیٰ تمہارے پاس نہیں آوے گا اور اگر میں چلا جاؤں تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

اس خطبہ میں بمقابلہ سر ولیم میور کی تعریضات کے اور بہت سے لطیف مباحث ہیں جن کو خطبات احمدیہ میں دیکھنا چاہیے۔

یہ جو کچھ ہم نے خطبات احمدیہ میں سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے اس کو ایک بہت بڑے حوض یا تالاب میں سے چلو دو چلو پانی سمجھنا چاہیے۔ اس کتاب کی خوبی اور جو کچھ کہ اس میں لکھا گیا ہے اس کی کیفیت جب تک کہ اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی خصوصاً اردو خطبات جو سر سید نے ولایت سے آ کر بہت مدت کے بعد لکھی ہے اور جس میں بہ نسبت انگریزی ترجمہ کے ہر ایک بات زیادہ وسعت کے ساتھ لکھی ہے اُس سے مصنف کی محنت، لیاقت اور اسلام کی محبت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سر سید کے ارادے کے موافق پوری نہ ہو سکی۔ ان کا ارادہ سر ولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں سے صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھیرنا ناممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچ کر کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آ کر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہو گئے اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں با آسانی میسر آ سکتی تھیں اُن کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا، وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ مگر جو مباحث سر ولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے اُن میں سے چند کے سوا سب کا تفصیلی یا اجمالی جواب اسی ایک جلد میں آ گیا ہے کیونکہ جس اصول پر سر ولیم میور نے اپنے تمام اعتراضات کی بنیاد قائم کی ہے خطبات احمدیہ میں اُس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور نہایت واضح طور پر جتا دیا گیا ہے کہ اسلام پر مخالفین کا کوئی اعتراض اس وقت تک وارد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ قرآن یا اُن حدیثوں کی سند پر جو اصول علم حدیث

کے موافق واجب التسلیم قرار پائیں. مبنی نہ ہو اور اس قاعدہ سے وہ اعتراضات یک قلم ساقط ہو جاتے ہیں جو عام تاریخ و سیر کی کتابوں یا اجتہاد فقہا یا اقوال علما و آراے مفسرین کی رو سے مذہب اسلام پر ایراد کیے جاتے ہیں.

جس وقت سرسید نے خطبات احمدیہ لکھی ہے اُس وقت تک مذہبی تحقیقات کے متعلق اُن میں وہ آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی تفسیر القرآن میں دیکھی جاتی ہے اور اس لیے خطبات احمدیہ میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جس کو اسلام کے اصول اسلام متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے. البتہ وہ ایک جگہ کسی قدر انھوں نے جمہور کے خلاف لکھا ہے جیسا کہ علماے محققین نے صدہا مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے مثلاً معراج کے مضمون کو، جیسا کہ بعض صحابہ کا مذہب ہے، رؤیا پر محمول کیا ہے اور شقِ صدر اور براق کی سواری کو اسی رؤیا میں داخل کیا ہے یا اور ایک آدھ بات اسی قبیل کی جمہور کے خلاف بیان کی ہے. لیکن اس سے اصول کی مخالفت لازم نہیں آتی. تعجب ہے کہ سر ولیم میور نے، جیسا کہ سرسید کی زبانی سنا گیا ہے. جس وقت خطبات احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ "میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کیے بلکہ اُس اسلام پر اعتراض کیے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آئے ہیں" یہ بعینہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیر انداز کسی گروہ کو نہتا سمجھ کر اس پر تیر برسانے شروع کرے اور جب اودھر سے بھی خلاف توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ نہتوں سے ہے تیر اندازوں سے نہیں ہے. سر ولیم میور نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ایک شریر طریقہ سے نکتہ چینی کی تھی اور چونکہ مسلمانوں نے اس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں سے بہت کم سنے تھے. اس لیے سر ولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان

میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے گا مگر جب انھوں نے دیکھا کہ جس قسم کے آلات انھوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کیے تھے۔ اسی قسم کے آلات اسلام کی حمایت میں ایسے طور سے استعمال کیے گئے ہیں جس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورۂ بالا الفاظ اُن کی زبان سے نکلے جن کے یہ معنی ہیں کہ میں نے تو اسلام کو نہتا سمجھ کر اس پر حملہ کیا تھا۔

خطبات پر اخبار انکوائرر کی رائے

انگلستان کے اخبار "انکوائرر" مورخہ ۱۱ مئی ۱۸۷۲ء میں جبکہ سرسید کو ولایت سے ہندوستان میں آئے ہوئے دو برس گذر چکے تھے کسی آزاد خیال انگریز نے خطبات احمدیہ پر ایک مفصل ریویو چھپوایا تھا۔ اس کے چند دلچسپ فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ "ہمیں اس کتاب کے مضامین کو خوشی سے لینا چاہیے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کم از کم پہلے پہل ہیں اُس مبادلۂ خیالات اور فیلنگز کے جو مشرق اور مغرب میں اُن مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں جو باوجود اختلاف کے ایک نوع کا اتحاد بھی رکھتے ہیں، ہوتا چلا ہے گویا ہم پہلے ہی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خیالات کا مبادلہ زمانۂ آئندہ میں کہاں تک جاری رہے گا یا اس سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے، لیکن بہر حال ہم سید احمد کو جو اپنے ملک میں رفاہ عام کے سرگرم کارگزار اور اپنے مذہب کی اثر کر حمایت کرنے والے ہیں ویلکم کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی مذہبی تحریریں ہمارے سامنے پیش کی ہیں۔ مسلمان کو بلا شبہ اس بات کا حق ہے کہ انجیل کی تفسیر کے متعلق جو کچھ وہ کہیں اُس کی سماعت کی جائے خصوصاً اس وجہ سے

کہ شاید وہ روایات کے سننے ذریعے ہم پر ظاہر کریں. سائنٹفک مذہب کا فرض ہے کہ وہ کسی شہادت کے سننے سے جو اس کو مل سکے انکار کرے. مگر مصنف کو اس سے زیادہ ہم سے توقع رکھنی نہیں چاہیے کہ ہم اُس کے خیالات سے ایک حد تک اتفاق کرینگے یہ

اس سے آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے شخص کے کیرکٹر معلوم کرنے کے لیے ایک ایسی سائیکولوجی کا جو تاریخ کے ذریعہ سے منکشف ہوئی ہے ایک شخص دشوار اور دقیق مسئلہ حل کرنا پڑتا ہے میور اور اسپرنگر نے زمانہ حال کی نکتہ چینی کا طریقہ جس کو تشریح عیسائی (اپنے مذہب کی نسبت) ناپسند کرتے ہیں. اسلام کی اصل اور اس کی ترقی کے حالات دریافت کرنے میں برتا ہے اور بارتھیلمی سینٹ ہلیر نے ہمارے سامنے ایک مفصل تاریخی تصویر پیش کی ہے. ہم عام طور پر یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف اور عزت دل میں رکھنی سیکھ لی ہے لیکن ہم میں ایسے کم ہیں جو کبھی قرآن کو پڑھتے ہوں. یہانتک کہ سیل نے جو ابتدائی بحث اِس کتاب (یعنی قرآن) کی نسبت کی ہے اُس کو بھی نہیں پڑھتے اور اُن سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اسلام کو کیا بلحاظ ملکی اور کیا بلحاظ مذہبی قوت کے ایک ایسی زندہ طاقت سمجھے ہوئے ہیں جو اپنی موجودہ یا کسی تبدیل شدہ حالت میں آنے والی صدیوں میں حکمراں طاقتوں میں سے ایک طاقت شمار ہوگی" [1]

---

[1] یہ اشارہ ہے خطبات احمدیہ کے ان بیانات کی طرف جہاں سرسید نے کہیں عیسائی مفسرین کی سند سے اور کہیں اور دلائل سے انجیل کے معنی جمہور عیسائیوں کے برخلاف بیان کیے ہیں ۱۲

سرسید نے جس خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بائبل کی پیشین گوئیاں بیان کی ہیں اس کے متعلق فاران اور فارقلیط کی پیشین گوئی کا ذکر کرکے لکھتا ہے کہ "سید احمد بار بار اس بات پر اطمینان ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے دلائل اسی درجہ کے ہیں جیسے کہ عیسائی عموماً استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ ہم کو اپنے دلائل کا یقین دلانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ عیسائیوں کی طرح صرف عمدہ ہی نہیں بلکہ عمدہ ترین دلیلیں ہمارے سامنے پیش کریں۔ انھوں نے اپنے دشمنوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب ہی ان پر حملہ کر رہا ہے حالانکہ اس کے ساتھ ہی آج کل کی نکتہ چینی کا طریقہ اُن کے مذہب کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کر رہا ہے جیسا کہ وہ اور مذہبوں کے ساتھ جن میں کریدکرنی اس کو منظور ہوتی ہے، کرتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سید احمد میور اور اسپرنگر جیسے لوگوں کے مقابلہ میں اپنی جگہ پر قائم رہنا بخوبی جانتے ہیں۔"

اس کے بعد چوتھے خطبے کے اُس مدلل بیان پر جو سرسید نے تعدد ازدواج کی بحث میں لکھا ہے کہتا ہے کہ "فی الواقع یہ مضمون مصنف کو بہت عزت دیتا ہے کہ وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ پولیگمی (یعنی تعدد ازدواج) مضر نہیں ہے، اپنے اونٹ کو سوئی کے ناکے سے نکال لے گیا ہے۔ گو اس نے اس کی جرأت نہیں کی کہ اُس کو حقیقی فوائد میں سے شمار کرتا۔ بہرحال ایسے مضمون پر اگر ہم کو سید احمد سے اتفاق بھی ہو تو ہم اُس کو ظاہر نہ کریں گے کیونکہ ہم کو اس

---

[1] چونکہ ریویو نگار ایک آزاد خیال آدمی ہے اس لیے وہ جس طرح عیسائیوں کی پیشین گوئیوں کو تسلیم نہیں کرتا اسی طرح مسلمانوں کی پیشین گوئیوں کو نہیں مانتا اور اثبات نبوت کے لیے ایسی دلیلوں کو کافی نہیں سمجھتا۔

موقع پر ایک خوشگوار سکوت ہی کو ترجیح دینی چاہیے ؟ پھر اسی خطبے کے متعلق اس بیان پر جس میں سرسید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام عیسائیوں کے لیے رحمت تھا کہتا ہے کہ " ہم دیکھتے ہیں کہ ہیئت اور طب یہ دونوں علم اور پروٹسٹنٹ اور یونی ٹیرین یہ دونوں مذہب ان فوائد میں سے ہیں جو اسلام نے کرسچینٹی (یعنی عیسائی مذہب) کو عطا کیے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عیسائی تو ہیں کافی طور پر شکر گذار ہوں گی ان فوائد میں سے ہر ایک فائدہ کے لیے اور سب فائدوں کے لیے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ فوائد مشکل سے کافی بیان ہیں اس زبردست تحریک کا جو یورپ میں اندلس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی اور جو فن تعمیر، شاعری معاشرت اور آداب سب پر حاوی ہے۔

اس کے بعد نویں خطبہ کے متعلق جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ بیان کیا گیا ہے یوں سرسید کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ " عدنان تک جو کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ میں اکتالیسواں ہے، مطلقاً عربی روایات سے لیا گیا ہے اور عدنان سے اوپر یہودی تاریخ سے لیا گیا ہے۔ ہم کو بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے عیسائی مصنفوں نے اپنا وقت ضائع کیا اور بے فائدہ دماغ صرف کیا اس بے فائدہ تلاش میں کہ اسلام اور یہودی مذہب میں تعلق ہے، حالانکہ کسی مسلمان نے اس سے انکار کرنے کا خیال تک نہیں کیا۔ عیسائیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے طنز کے ساتھ ہم کو الزام لگایا کہ تم نے یہ چیز یہودیوں سے لی اور وہ چیز

لہ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے خوف سے یا عندیہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا ورنہ سرسید کے استدلال کو وہ دل میں مان گیا ہے ۱۲۔

ان کے ہاں سے چھڑانی، گویا اسلام کوئی بنیاد نہیں رکھتا جس پر وہ قائم ہو بلکہ بالکل عیسوی اور یہودی دین پر منحصر ہے۔ ہم مسلمانوں کو دونوں الہامی مذہبوں سے انکار کرنا تو کیا ہم تو اپنی سب سے بڑی عزت سمجھتے ہیں کہ "ہم سچے اور ایماندار پیرو ہیں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے" اس پر ریویو نگار لکھتا ہے کہ "اخیر کے جملے کو ہم نے ممتاز حرفوں میں لکھا ہے کیونکہ وہ توجہ کے قابل ہے اور اس قابل ہے کہ یاد رکھا جائے ہم کو یقین ہے کہ اس جملہ کے الفاظ ایسے ہیں جو کم سے کم اسلام کی اصولی تعلیم پر مبنی ہیں اور اس میں شک ہی نہیں کہ وہ مصنف کے نزدیک مسلم ہیں۔ یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کیے جانے کے قابل ہیں۔ ان پر فی الحقیقت کتھولسٹی[1] کے سچے اصول کی مُہر ہے۔ فی الواقع اگر کوئی جامع اصول مختلف مذہبوں میں مصالحت پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف یہی اصول ہوگا شاید ہم سید احمد کو بغیر ناراض کیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ملی یا عربی کیتھولک ہے۔ بہرحال انھوں نے لٹریچر کا مرد میدان ہونے کا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے۔ اور اُن کے مضامین کو وہ لوگ توجہ سے پڑھیں گے جن کو اس سبجیکٹ میں دلچسپی حاصل ہو چکی ہے اور جو اس میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی تلاش میں ہیں۔"

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

لندن ہی میں سر سید نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فور محمد اینڈ

---

[1] کتھولسٹی ایک لفظ مشترک بہت سے معنوں میں آتا ہے جن میں سے ایک معنی مذہبی فراخ حوصلگی یا بے تعصبی اور ناطرفداری کے ہیں۔

قرآن" کو جو انھوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی خود اپنے روپیہ سے چھپوایا۔ سرسید خطوں سے جو سید مہدی علی خاں کے نام ہیں معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کے چھاپنے کی حامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنف کو اس قدر استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے اُس کو چھپوا کر شایع کرے۔ سرسید نے وہاں پہنچ کر جب اس کتاب کے مضامین سُنے تو انھوں نے فوراً اپنے پاس سے روپے کی تدبیر کر کے وہ کتاب چھٹ پٹ چھپوا دی اور اُس کی کئی سو جلدیں ہندوستان بھجوا دیں۔ یہاں اس کا ایک اردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن خاں صاحب دہلوی نے اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہو گئے۔

گاڈفری ہگنز کی کتاب کا ترجمہ کرنا

انگلستان کے ایک اور ذی رفعت مصنف گاڈفری ہگنز کی کتاب جو کسی زمانے میں مصنف مذکور نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی ایک جرمن کتاب فروش کی مشہور دُکان سے جہاں ہر زبان کی پرانی اور نایاب کتابیں بکتی ہیں، سرسید نے دس گنی قیمت میں لندن میں خریدی۔ اصل مطلب اس کے خریدنے سے یہ تھا کہ خطبات احمدیہ کی تصنیف میں اس سے مدد لی جائے مگر انھوں نے ہندوستان میں آ کر اُن لوگوں کے لیے جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے، پانسو روپیہ خرچ کر کے اس کا اُردو ترجمہ[1] بھی جو حمایت الاسلام کے نام سے مشہور ہے شایع کر دیا۔

---

[1] یہ ترجمہ مشہور عالم مولوی محمد احسن مرحوم پروفیسر بریلی کالج نے کیا تھا۔ ۱۲

رسالہ ابطال غلامی

اگرچہ یہ مضمون بقدر ضرورت خطبات احمدیہ میں لکھا جا چکا تھا مگر ولایت سے آنے کے بعد سر سید نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں شایع کیا اور پھر اس کو علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ ہمارے علما جنھوں نے ان اعتراضوں اور طعنوں سے کان بند کر رکھے ہیں جو یورپ کی قومیں اسلام اور اہل اسلام پر کرتی ہیں ان کو آج تک یہ بھی احساس نہیں کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب اور افریقہ میں جاری ہے اس میں کیا برائی ہے اور وہ اصول اسلام کے موافق صحیح ہے یا نہیں ! اُن کے نزدیک حمیت اسلامی اسی کا نام ہے کہ جو شخص اسلام پر اعتراض کرے اگر قدرت ہو تو اس کا منہ بند کر دیں ورنہ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کے مطاعن کتابوں اور اخباروں میں دن رات دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور جن کو معلوم ہے کہ یہ مطاعن مسلمانوں کی نئی پود پر جو دنیا کے حالات سے روز بروز زیادہ باخبر ہوتی جاتی ہے کیا اثر کرتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اگر معترضین کی غلط فہمیوں کو اس وقت دفع نہ جائے تو ہماری نسلیں جو ہمارے بعد اسلام کی وارث ہونے والی ہیں۔ وہ اسلام کو کس نگاہ سے دیکھیں گی اور تمام عیسائی قوموں میں اور خاص کر انگریزوں کی قوم میں جو ہندوستان کے مسلمانوں پر حکمراں ہیں۔ مذہب اسلام کس نظر سے دیکھا جائے گا۔

انھیں مطاعن میں سے ایک طعن جواز استرقاق یعنی لونڈی غلام بنانے کا ہے جو عیسائی قومیں مذہب اسلام پر اس لیے کرتی ہیں کہ نصف صدی

سے مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم میں یہ دستور باقی نہیں رہا۔ اگرچہ اٹھارھویں صدی تک جو غلاموں کی حالت نزار یورپ اور امریکا میں تھی اُس بے رحمی اور سنگدلی کی بہ نسبت اسلام میں کہیں نظیر نہیں پائی جاتی چنانچہ فرانس کے مشہور محقق ڈاکٹر لی بان نے جیسا کہ احمد شفیق بک نے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے اپنی کتاب تمدن عرب میں اُن بے رحمیوں کا بیان کرنے کے بعد جو عیسائی قومیں غلاموں پر کرتی تھیں۔ صاف اقرار کیا ہے کہ "حق بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی غلامی بالکل اس غلامی کے برعکس ہے جو عیسائی میں جاری تھی"۔ لیکن اسی بے رحمی کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ نیک دل لوگوں کو غلاموں کی حالت پر رحم آیا اور وہ ان کی حمایت کے لیے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ غلامی کا نام و نشان تک یورپ اور امریکا سے مٹا دیا گیا۔

پس اس سے زیادہ اور کیا افسوس کی بات ہو سکتی ہے کہ جو قومیں غلاموں پر ایسی تھیں اور جن کے مذہب میں کوئی خاص رعایت غلاموں کے ساتھ نہیں کی گئی وہ تو تمام دنیا میں غلامی اور بردہ فروشی کا انسداد کرتی پھرتی ہیں اور مسلمان جن کے مذہب نے تمام دنیا کے مذاہب سے بڑھ کر غلاموں کی حمایت کی اور اگر سچ پوچھیے تو گویا غلامی کو بالکل معدوم کر دیا۔ وہی تمام دنیا میں بردہ فروشی کے ناجائز و ناشائستہ رواج میں سب سے زیادہ بدنام ہیں اور انھیں کے مذہب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ نوع انسان کا دشمن اور ظلم و بے رحمی کا سرچشمہ ہے۔

سرسید اپنے ایک آرٹکل میں جو رسالہ 'ابطال غلامی' کے علاوہ انھوں نے اسی مضمون پر لکھا ہے۔ لکھتے ہیں "ولیم ہورورسل صاحب جو نہایت نامی گرامی ادیب ہیں اپنے روزنامچہ میں اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اُس نے اس نیکی کے حاصل کرنے اور رسم بد

کے موقوف کرنے میں بڑی کوشش کی ہے اور کسی قدر کامیاب بھی ہوا ہے اس کے بعد سر سید کہتے ہیں کہ "اگرچہ مسٹر رسل کی کتاب پڑھ کر ہمارا دل خوش ہوا مگر جس لفظ نے ہمارے دل کو رنجیدہ کیا اس کا بیان کرنا بھی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں انھوں نے اسمٰعیل پاشا کے اس نیک کام کی تعریف کی ہے وہاں یہ بھی لکھا کہ اس نے برخلاف اپنے مذہب و ایمان کے یہ نیک کام کیا ہے۔ اس تحریر پر ہم کچھ مسٹر رسل سے ناراض نہیں ہوئے۔ انھوں نے ٹھیک لکھا ہے مگر ان کافر مسلمانوں سے ناراض ہوئے جنھوں نے اپنے افعال ناشائستہ کو ایسے طور پر رواج دیا ہے جس کے سبب غیر قومیں ان افعال کو مذہبی اور ایمانی افعال سمجھتی ہیں اور مذہب اسلام کو حقارت سے دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ تہذیب اور شائستگی اور انسانیت مذہب اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔"

اگرچہ مسلمان سلطنتوں میں سلطان عبدالمجید خاں اور اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کے وقت سے بردہ فروشی کا انسداد محض بطور مصلحت ملکی کے ہونے لگا مگر ۱۸۸۸ء تک وہاں بھی کسی مسلمان عالم کو یہ خیال نہیں آیا کہ عیسائی، جو بردہ فروشی کے نالائق طریقہ کو دین اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو رفع کیا جاتے۔ حالانکہ ٹرکی، مصر اور افریقہ کے دیگر ممالک اسلامیہ کے علما کا سب سے مقدم فرض تھا کہ وہ اسلام پر سے اس الزام کو رفع کرتے، کیونکہ دنیا میں کوئی مرکز بردہ فروشی کا اب وسط افریقہ کے سوا باقی نہیں رہا۔ جہاں ایک مدت سے سلاطین یورپ انسداد بردہ فروشی کی تدبیروں میں مصروف ہیں اور عیسائی مشنری تمام یورپ اور افریقہ میں منادی کرتے پھرتے ہیں کہ مظلوم حبشیوں کو اسلام کے پنجۂ ظلم سے نکالو۔

بارے ۱۸۸۸ئہ میں یعنی سرسید کی تصنیف سے انیس برس بعد مصر کے ایک روشن ضمیر فاضل احمد شفیق بک کو جس نے فرانس میں تعلیم پائی ہے، یہ خیال اُس وقت پیدا ہوا جبکہ کارڈنل لافیجری پیرس کے ایک چرچ میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ بردہ فروشی کے مظالم پر لکچر دے رہا تھا اور اُس کا الزام صرف مسلمانوں ہی کے اعمال و افعال پر نہیں بلکہ مذہب اسلام پر لگاتا تھا کہ وہ علانیہ اس رسم بد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے بعد احمد شفیق بک نے دیکھا کہ وہ لکچر یورپ میں عام طور پر شایع ہو گیا۔ اس لیے انھوں نے ایک رسالہ فرانسیسی زبان میں لکھا جس کا ترجمہ احمد ذکی آفندی نے عربی میں کیا ہے۔

اس رسالہ کی جس قدر شہرت اور وقعت یورپ کی عیسائی قوموں میں اور مصر و ٹرکی کے مسلمانوں میں ہوئی ہے اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مضمون جس کو اب سے انتیس برس پہلے سرسید لکھ چکے تھے اور جس کا صلہ اُن کو یہ ملا تھا کہ بجائے عیسائیوں کے خود مسلمانوں نے اُس کے رد لکھے، کس قدر ضروری تھا۔ مصر کے اسلامی اخبار المؤید مورخہ ۲۔ ستمبر ۱۸۹۱ئہ میں اُس کی نسبت لکھا گیا تھا کہ "اسلام کی حمایت میں اس سے عمدہ اور افضل کوئی تصنیف نہیں ہوئی چنانچہ کبرا و فضلائے اہل اسلام نے جو ایسے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں، احمد ذکی آفندی سے نہایت التجا کے ساتھ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے عربی میں کرایا" اس کے سوا فرانس کے مشہور عالم موسیو میسمر نے اس رسالہ کو دیکھ کر مصنف کو لکھا، "کہ تم نے اپنے حریف (یعنی کارڈنل لافیجری) کو لاجواب کر دیا اور بے شک حق تمھاری جانب ہے" اسی طرح فرانس کے آٹھ بڑے بڑے مشاہیر نے رسالہ مذکور کی نہایت تعریف اور اس کے لکھنے

پر مبارکباد لکھی خصوصاً موسیو لوکار انسپکٹر کمپنی نہر سویس نے لکھا کہ میں نہایت قدر کرتا ہوں تمھارے اس کام کی جو تم نے اپنے مذہب اور اپنے ملک کی حمایت کے لیے کیا ہے اور کیا اچھا ہو اگر فرانس کا ہر فرد اسی طرح اپنے مذہب اور اپنے ملک کے لیے کھڑا ہو" رستم پاشا سفیر سلطانی جو اُس وقت لندن میں تھے انھوں نے رسالۂ مذکور کی رسید میں نہایت شکریہ کے بعد مصنف کو لکھا کہ "اس رسالہ سے نہایت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے اور میں ان نسخوں کو نہایت خوشی سے انگریزوں میں اور اُن اخباروں میں جو انگریزوں کی نظر سے گذرتے ہیں تقسیم کروں گا" احمد ذکی افندی مترجم رسالۂ مذکور لکھتے ہیں کہ "بہت دن گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ مضمون تمام یورپ میں مشہور ہو گیا۔ یورپ کے بڑے بڑے اخباروں میں اس پر عمدہ عمدہ ریویو لکھے گئے اور بعض اخباروں میں یہ رسالہ بجنسہ اول سے آخر تک چھاپ دیا گیا"

الغرض اسلام کی اس ضروری اور مہتم بالشان خدمت کی نسبت غالباً تمام اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سید احمد خاں کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ غلامی کے باب میں جو تفضیلت اور فوقیت مذہب اسلام کو تمام دنیا کے مذاہب پر ہے اور جو نیکی اور سلوک و احسان اس نے لونڈی غلاموں کے ساتھ کیا ہے اُس کو صاف صاف دنیا پر روشن کریں۔ انھوں نے اول ۱۸۷۰ء میں جہاں سر ولیم میور کے اور مطاعن و اعتراضات کے جواب خطبات احمدیہ میں دیے ہیں انھیں کے ذیل میں غلامی پر بھی بہت شافی[1]

---

[1] چونکہ سرسید نے غلامی پر کوئی علیحدہ مضمون لکھ کر انگریزی میں شایع نہیں کیا تھا بلکہ خطبات کے ضمن میں اس کا ذکر کیا تھا اور خطبات کی بہت کم جلدیں انگریزی میں شایع ہوئی تھیں اس لیے اس کی شہرت یورپ میں ایسی نہیں ہوئی جیسی احمد شفیق بک کے رسالہ کی ہوئی ۱۲

بحث کی ہے جس کے بعد عیسائیوں کے مقابلہ میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہ تھی مگر چونکہ اس میں ایک دعوے فقہائے اسلام کے خلاف تھا اور جب تک اصول شرع کے موافق اُس پر استدلال نہ کیا جائے وہ مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہ تھا اس لیے انھوں نے ۱۸۷۱ء میں ایک مستقل اور مبسوط رسالہ اسلام کی غلامی پر لکھ کر تہذیب الاخلاق میں چھپوایا۔ اس رسالہ میں اول بطور تمہید کے دلائل عقلیہ غلامی کی برائی پر نہایت عمدگی اور صفائی سے بیان کیے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ اگر غلامی خدا کی مرضی کے موافق ہو تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا بندوں کو اپنا شریک گردانتا پسند کرتا ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ "کُلُّکُمْ عَبِیْدُ اللّٰہِ وَکُلُّ نِسَائِکُمْ اِمَاءُ اللّٰہِ"[1] اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر غلام اچھی طرح رحم اور محبت کے ساتھ رکھے جائیں تو کوئی بُرائی نہیں، اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ غلامی فی نفسہٖ ایک قدرتی گناہ ہے اور ان کو بدسلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہے اور کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ "یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسیٰ مسیح نے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اس کی نسبت کہا اس کو کسی نے نہیں سمجھا۔" پھر جس جس طریقہ سے زمانۂ جاہلیت میں غلام بنائے جاتے تھے اُس کی تفصیل لکھی ہے اور دکھایا ہے کہ غلامی کی رسم کو جو اُس وقت عرب میں تمام دنیا کی قوموں کی طرح جاری تھی اس کا دفعۃً موقوف کر دینا صرف مصالح ملکی کے برخلاف ہی نہ تھا بلکہ ایسا کرنا انواع و اقسام کے گناہوں کا مورث ہوتا۔ چنانچہ اب بارہ

---

[1] یعنی تم سب خدا کے غلام ہو اور تمہاری سب عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں۔

سو برس بعد بھی یورپ کے بڑے بڑے مدبر جنھوں نے غلامی کے معدوم کرنے میں بے انتہا کوششیں کیں وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے کہ آیندہ کی غلامی کو بند کیا اور موجودہ غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہو جانے کی تدبیریں کیں مگر اُن کی تدبیروں میں اور بانی اسلام کی تدبیروں میں یہ فرق تھا کہ اُنکی تدبیریں زیادہ تر مادی چیزوں سے اور بانی اسلام کی تدبیریں زیادہ تر روحانی چیزوں سے علاقہ رکھتی تھیں۔ پس اسلام نے جس طرح شراب خوری کو بتدریج موقوف کیا تھا۔ اسی طرح غلامی کے رفتہ رفتہ مسدود کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اول طرح طرح سے غلاموں کے آزاد کرنے کی مسلمانوں کو ترغیب دی۔ یہانتک کہ بردہ آزاد کرنے کو تمام دنیا کی نیکیوں سے افضل بتایا بعض گناہوں کے کفارہ میں بردہ آزاد کرنے کا حکم دیا، اور بتایا کہ جو غلام اپنی قیمت اپنی کمائی سے ادا کرنی چاہیں اُن سے یہ اقرارنامہ لے کر چھوڑ دو جن سے اُن کے مالک اس طرح آزاد کرنے کا وعدہ کریں اُن کی خیرات یا چندہ سے مدد کرو، بیت المال میں سے مکاتب غلاموں کی آزادی کے لیے روپیہ دینا تجویز کیا بعض صورتیں ایسی بتائیں کہ لونڈی غلام بغیر آزاد کرنے مالک کے خود بخود آزاد ہو جائیں، اسی طرح اور طرح طرح کی سبیلیں ان کے آزاد کرنے کی نکالیں۔ مالک کو ان کے ساتھ رعایتیں کرنے کی نہایت تاکید کی کہ اُن سے زیادہ خدمت نہ لیں، انھیں لونڈی غلام کہہ کر نہ پکاریں، ان کو مثل اپنے کھانا اور کپڑا دیں، اُن کو اُن کے رشتہ داروں سے جدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔

یہانتک سرسید کا بیان جمہور علمائے اسلام کے مطابق ہے۔ مگر اس کے بعد انھوں نے دو دعوے نہایت شدومد کے ساتھ کیے ہیں جن میں بظاہر وہ متفرد معلوم ہوتے ہیں پہلا دعویٰ ان کا یہ ہے کہ لڑائی کے

قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت میں یا کسی حدیث صحیح میں نہیں ہے۔ اس کے بعد جن آیتوں یا حدیثوں سے علماء نے استرقاق کا حکم استنباط کیا ہے اُن کو نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ ان سے استرقاق کا حکم مستنبط نہیں ہوتا اور جو الفاظ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں ایسے آئے ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لونڈی غلاموں کا ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے ماملکت ایمانکم، فك رقبة، عبد، امة، فتیات وغیرہ ان کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ بیشک جبتک آیہ منّا[1] وفداء نازل نہیں ہوئی اس وقت تک عرب کی قدیم رسم کے مطابق مختلف طریقوں سے (جن کی تفصیل انھوں نے لکھی ہے) برابر لونڈی غلام بنائے جاتے تھے، اور سنہ بعد اترنے آیۂ مذکور کے گو آیندہ کے لیے استرقاق کی ممانعت ہوگئی مگر جن کے پاس لونڈی غلام پہلے سے موجود تھے اُن کو آزاد کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا کیونکہ آیۂ مذکورہ میں صرف آیندہ کے لیے یہ حکم تھا کہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھکر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔ پس قرآن وحدیث کے جن الفاظ سے رقبیت کا وجود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے وہ انھیں لونڈی غلاموں سے متعلق ہیں جو آیۂ مذکورہ کے نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کے پاس موجود تھے۔

دوسرا دعویٰ اُن کا یہ ہے کہ سورۂ محمد کی اس آیت سے جس میں یہ حکم ہے کہ آیندہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھکر چھوڑ دیا کرو۔ یا فدیہ لے کر

---

[1] یعنی سورۂ محمد کی یہ آیت " فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموهم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء " ۱۲

اسلام نے رسم استرقاق کو جو مثل اور قوموں کے عرب میں بھی قدیم زمانہ سے چلی آتی تھی ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں لڑائی کے قیدیوں کو قتل کرنا، لونڈی غلام بنانا، فدیہ لیکر یا احساناً چھوڑ دینا یہ چاروں باتیں رائج تھیں اور اسلام میں بھی، جبتک کوئی حکم قیدیوں کی نسبت نہیں آیا، ایسا ہی ہوتا رہا، لیکن جب سے یہ آیۂ مَنّ و فدا نازل ہوئی پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں قیدیوں کو لونڈی غلام نہیں بنایا یعنی جاہلیت میں جو اسیران جنگ کے ساتھ چار طرح کے برتاؤ کیے جاتے تھے اُن میں سے قتل و استرقاق کو بالکل موقوف کر دیا اور صرف مَنّ و فدا میں اختیار دے دیا کہ چاہو بغیر کسی معاوضہ کے محض احساناً چھوڑ دو اور چاہو کچھ فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

اس دوسرے دعوے کے متعلق انھوں نے بہت سی موافق اور مخالف روایتیں کتب احادیث سے نقل کر کے اس بات کے ثابت کرنے میں کوشش کی ہے کہ آیۂ مَنّ و فدا کے نازل ہونے کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پھر کسی کو لونڈی غلام نہیں بنایا گیا اور بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں جو کچھ ہوا اس کی نسبت ان کے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ جب قرآن مجید یا حدیث صحیح سے غلام بنانے کا کوئی صاف حکم نہیں نکلتا اور آیۂ مَن و فدا سے صاف پایا جاتا ہے کہ جاہلیت کی رسم کے موافق جو ابتدائے اسلام میں لونڈی غلام بنائے جاتے تھے اُس کی صاف ممانعت ہو گئی اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قیدی کو لونڈی غلام نہیں بنایا اب ہم کو کچھ ضرورت اس بات کے دریافت کرنے کی نہیں ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ یا تابعین وغیرہم نے اس باب میں کیا کیا؟

اس بیان کی تائید اتھوں نے اس طرح سے کی ہے کہ شراب کی حرمت نازل ہونے کے بعد کوئی نہیں سمجھا تھا کہ شراب حرام ہوگئی یہانتک کہ تین دفعہ اس کی حرمت نازل ہوئی۔ پھر باوجودیکہ بیع اُمّہات اولاد کا ممنوع ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تسلیم کیا جاتا ہے تاہم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک بیع ہوتی رہی۔ اس کے سوا متعہ کی حرمت سے عمر فاروقؓ کی خلافت تک صحابہ واقف رہے۔ پس اسی طرح ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آیہ مَن و فدا سے جو اصل مقصود تھا اس کو بھی صحابہ نہ سمجھے ہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ پہلے بھی قیدیوں کو احساناً یا فدیہ سے کر چھوڑنے کا دستور برابر جاری تھا۔ پس اس آیت کے اترنے کے بعد جو تمام قیدی کسی نہ کسی طرح چھوڑ دیے گیے اور قتل یا استرقاق واقع نہیں ہوا اس کو سب نے ایک اتفاقی بات سمجھا ہو اور بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلافت راشدہ میں اس مسئلہ پر بحث کا موقع اس لیے نہ ملا ہو کہ پہلی خلافت مرتدین کے مطیع کرنے میں ختم ہوگئی دوسری اور تیسری خلافت میں دارالخلافہ سے دور دور کے فاصلہ پر لڑائیاں ہوئیں اور چوتھی خلافت کا آپس کے جھگڑوں میں خاتمہ ہوگیا اور اس لیے چاروں خلافتوں میں اس مسئلہ کے تصفیہ کرنے کی مہلت نہیں ملی۔

اگرچہ یہ امید نہیں ہے کہ علمائے اسلام اور خاصکر ہندوستان کے علما موجودہ حالت میں ایک ایسی رائے کے ساتھ اتفاق کریں گے

جو اسلام کی غلامی کے متعلق انھوں نے برخلاف جمہور فقہا و علمائے اسلام کے قائم کی ہے۔ چنانچہ ایک مبسوط رسالہ جو ازا استرقاق پر سرسید کے برخلاف انھیں دنوں میں جب کہ پہلی بار ابطال غلامی کا رسالہ تہذیب الاخلاق میں شایع ہوا تھا۔ لکھا جاچکا ہے لیکن اس میں
شک نہیں کہ جس طرح سرسید کی رائے فقہا
اور مفسرین اور تعامل اہل اسلام کے برخلاف ہے اسی طرح تعامل اہل اسلام اور فقہا و مفسرین کے اقوال ظاہر قرآن کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ نہ قرآن میں کوئی ایسی نص صریح موجود ہے جس میں لونڈی غلام بنانے کا حکم دیا گیا ہو اور نہ آیۂ مَن و فدا کے حصر کی کوئی ایسی معقول تاویل ہو سکتی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ لڑائی کے قیدیوں کے ساتھ سوائے مَن و فدا کے تیسرا سلوک کیا جا سکتا ہے اور نہ اُن لوگوں کے پاس جو نسخ کے قائل ہوئے ہیں کوئی ایسی صاف اور صریح نص قرآنی موجود ہے جس کو آیۂ مذکور کا ناسخ قرار دیا جائے اور اس بات کا تو انکار ہی نہیں ہو سکتا کہ آیۂ مذکور نے اُس سلوک کو جو اسیرانِ جنگ کے ساتھ کرنا چاہیے صرف دو باتوں میں منحصر کر دیا ہے، یا احسان رکھ کر چھوڑنا یا کچھ چھڑائی لے کر چھوڑنا۔ ورنہ آیۂ مذکور کے منسوخ ماننے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔

اس تقدیر پر، اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو مسئلہ متنازع فیہ کی صورت بعینہٖ ایسی ہو گئی ہے جیسے عبد اللہ ابن عباسؓ سے مسح رجلین اور غسل رجلین کے باب میں منقول ہے کہ " لَا اَجِدُ فِی کِتَابِ اللّٰہِ اِلَّا الْمَسْحَ وَلٰکِنَّھُمْ اَبَوْا اِلَّا الْغَسْلَ " یعنی میں قرآن میں تو مسح کے سوا کچھ نہیں پاتا لیکن

صحابہ نے صرف قتل ہی کو اختیار کیا ہے۔

اگرچہ عام طور پر تعامل اہل اسلام اور فقہا و مفسرین کے اقوال سر سید کی رائے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں مگر بعض تاریخی شہادتیں ایسی ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اُمیہ کے زمانہ میں آیۂ مَن و فدا سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ اسیران جنگ کے ساتھ مَن و فدا کے سوا اور کوئی سلوک نہیں کیا جا سکتا یعنی ایک دفعہ، جیسا کہ کتاب عقد الفرید میں مذکور ہے۔ حجاج کے روبرو کچھ اسیر لائے گئے۔ حجاج نے اُن کے قتل کیے جانے کا حکم دیدیا۔ ایک قیدی نے جب کہ اس کو قتل کرنے لگے، حجاج کو بد دُعا دی اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے تو اپنی کتاب میں یہ کہا ہے کہ "فاذ القیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء" اور تمہارا شاعر اپنی قوم کے مکارم اخلاق اس طرح بیان کرتا ہے:

"وَمَا نَقْتُلُ الْاَسْرٰی وَلٰکِنْ نَفُکُّھُمْ ۔۔۔ اِذَا اَثْقَلَ الْاَعْنَاقَ حَمْلُ الْقَلَائِدِ"

(یعنی ہم قیدیوں کو قتل نہیں کرتے بلکہ اُن کو جب کہ ان کی گردنیں طوقوں کے بوجھ میں دبی جاتی ہیں، چھوڑ دیتے ہیں) یہ سُن کر حجاج نے اگویا مقتول قیدیوں کی طرف مخاطب ہو کر، کہا "تمہارا بُرا ہو کیا تم نہ کہہ سکتے تھے جو بات اس منافق نے مجھ کو جتائی" اور یہ کہہ کر باقی قیدیوں کو چھوڑ دیا۔

حجاج ہی کا ایک اور قصہ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں درج ہے یعنی حجاج کے سامنے ایک اسیر لایا گیا۔ حجاج نے عبد اللہ ابن عمر سے جو اس وقت وہاں موجود تھے، کہا کہ اٹھو اور اس کو قتل کر ڈالو۔ ابن عمر نے فرمایا "ہم کو یہ حکم نہیں ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

"اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد و اما فداء"

اگرچہ احمد شفیق بک نے آیۂ مَن و فدا پر زیادہ زور نہیں دیا مگر نتیجہ کے لحاظ سے اُن کے اور سرسید کے استدلال میں چنداں فرق نہیں معلوم ہوتا احمد شفیق کی تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ چونکہ عرب پشت ہا پشت سے لونڈی غلام بنانے کے عادی تھے اور یہ عادت ان کی طبیعت ثانی ہو گئی اور اسلام کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان مقصد توحید کا پھیلانا اور شرک وجہالت کا استیصال کرنا تھا اس لیے غلامی کا دفعۃً موقوف کر دینا ضرور اسلام کے اعلیٰ اور اشرف مقاصد میں خلل انداز ہوتا۔ لیکن جو نصیحتیں بانی اسلام نے غلاموں کے حق میں مسلمانوں کو فرمائیں اور جو بےشمار حقوق اُن کو عنایت کیے اور جس طرح اُن میں اور اُن کے مالکوں میں ہر طرح سے مساوات کا درجہ قائم کیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے غلامی کی سوتیں بالکل بند کر دیں۔ اس کے سوا اسلام صرف اُن غیر مسلمین کے استرقاق کی اجازت دیتا ہے جو شرعی جہاد میں اسیر ہوں اور اس پر بھی اُن کو ہمیشہ کے لیے مملوک رہنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ جس طرح بادشاہ اسلام اُن کو احساناً چھوڑ سکتا ہے اسی طرح وہ خود فدیہ دے کر چھوٹ سکتے ہیں۔ پس جو حبشی وسط افریقہ سے ناجائز طور پر پکڑے جاتے ہیں وہ عام اس سے کہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اصول اسلام کے موافق لونڈی غلام نہیں ٹھہر سکتے۔

اس بیان میں اور سرسید کے بیان میں، جیسا کہ ظاہر ہے اس سے زیادہ کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا کہ سرسید کے نزدیک جس طرح چوری سے پکڑے ہوئے یا چھینے ہوئے حبشی لونڈی غلام نہیں بن سکتے اسی طرح اسیران جنگ بھی لونڈی غلام نہیں بنائے جا سکتے بلکہ اُن کے قید ہونے کے بعد مسلمانوں کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اُن کو احساناً چھوڑ دیں یا فدیہ لے

کر چھوڑ دیں۔ اور احمد شفیق بک کے نزدیک وہ قید ہونے کے بعد لونڈی غلام تو بن جاتے ہیں مگر اس کے بعد اگر مسلمان ان کو احساناً چھوڑ دیں تو وہ فدیہ دیکر چھوٹ سکتے ہیں۔ اس تقدیر پر بظاہر ثمرۂ اختلاف صرف یہ نکلے گا کہ احمد شفیق بک کے نزدیک اگر مسلمان اُن کو احساناً نہ چھوڑیں تو جب تک وہ فدیہ ادا نہ کریں گے بدستور لونڈی غلام رہیں گے اور سرسید کے نزدیک اگر وہ فدیہ ادا نہ کرسکیں تو مسلمانوں کو چار و ناچار انھیں چھوڑنا پڑے گا کیونکہ اُن کے نزدیک درحقیقت رقیت طاری نہیں ہوئی۔

بہرحال سب سے پہلے سرسید نے اور ان کے بعد مصر کے اس روشن ضمیر فاضل نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ جو سلوک اور احسان لونڈی غلاموں پر اسلام نے کیا ہے وہ کسی مذہب سے بن نہیں آیا اور گو نصف صدی سے بلحاظ حسن معاشرت کے عیسائیوں نے اور خاصکر انگلش قوم نے اس باب میں تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت حاصل کی ہے مگر مذہب کی رو سے وہ غلاموں کے حق میں اس سے زیادہ کوئی شہادت پیش نہیں کرسکتے کہ انجیل تمام بنی آدم کو ایک دوسرے کا بھائی ٹھیراتی ہے اور سب کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کی تاکید کرتی ہے۔ تمام عہد جدید میں کوئی صریح نص غلامی کے برخلاف نہیں پائی جاتی، بلکہ سینٹ پال کے تمام خطوں میں، جو دین عیسوی کی اشاعت کی غرض سے اطراف وجوانب میں بھیجے گئے کوئی حکم غلاموں کی نسبت اس کے سوا نہیں پایا جاتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے آگے سر جھکائیں، اُن کی اطاعت کریں، اُن سے ڈریں، اُن کی ایسی فرماں برداری کریں جیسی عیسیٰ مسیح کی کرتے ہیں، اُن کو ہر تعظیم وتکریم کے لائق سمجھیں اور اگر اُن کے آقا عیسائی ہوں تو اُن کی خدمت گذاری میں اور بھی زیادہ

مبالغہ کریں۔ برخلاف اس کے بانی اسلام نے کہیں غلاموں کو اپنے مالکوں کی اطاعت یا تعظیم و تکریم کا حکم نہیں دیا بلکہ جہاں نصیحت کی ہے وہاں مالکوں کو غلاموں کے ساتھ مہربانی اور شفقت اور ہر ایک بات میں اپنے برابر سمجھنے کی کی ہے اور طرح طرح سے اُن کے آزاد کرنے کی ترغیبیں دی ہیں اور مالک و مملوک میں ایک محض اعتباری فرق کے سوا کوئی فرق نہیں رکھا اور اگر قرآن کے موافق دیکھا جائے تو غلامی کو ہمیشہ کے لیے بالکل موقوف کر دیا ہے۔

تفسیر القرآن

سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر جن اصول پر اور جس ضرورت اور غرض سے لکھی ہے اس کا مختصر ذکر پہلے حصہ میں آچکا ہے۔ یہاں ہم اس کی وہ خصوصیتیں بیان کرنی چاہتے ہیں جو اُس میں اور دیگر تفاسیر میں مابہ الامتیاز ہیں اور جن سے سرسید کی نیت کا اور اُس ضرورت کا جس نے اس تفسیر کے لکھنے پر اُن کو مجبور کیا، کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہمارے قدیم مفسروں نے بلاشبہ اُن تمام ضرورتوں کو جو اُن کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً پیش آتی گئیں، بخوبی پورا کیا اور اپنی آسمانی کتاب کی خدمت کا حق بحسب ضرورت ادا کرتے رہے۔ سب سے پہلے اُن کو اس بنا پر کہ تفسیر بالرائے کی نسبت حدیث میں وعید وارد ہوئی تھی۔ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جس قدر اخبار و آثار تفسیر القرآن کے متعلق کتب احادیث میں روایت کیے گئے ہیں اُن سب کو تفسیروں میں اپنے اپنے موقع پر بیان کیا جائے تاکہ کوئی ضروری بات جو قرآن کی تفسیر کے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ امت تک پہنچنے سے رہ

نہ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ قدما کی اس کوشش سے جو محض نیک نیتی سے کی گئی تھی بے شمار روایتیں تفاسیر قدیمہ میں ایسی درج ہو گئیں جن کے لحاظ سے علمائے محققین کو یہ کہنا پڑا کہ "کتب التفسیر مشحونۃ بالاحادیث الموضوعۃ" اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ ہے کہ پچھلوں نے قدما کی تفسیروں میں جو رطب و یابس روایتیں پائیں بغیر اس کے کہ اصول علم حدیث کے مطابق اُن کی تنقید کریں اُن تمام رطب و یابس روایتوں سے اپنی تفسیروں کو بھر دیا اور مخالفوں کے لیے اعتراض کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جب اسلام دور دراز ملکوں میں اور غیر قوموں میں، جن کی مادری زبان عربی نہ تھی اور جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل اہل زبان کے اندازہ نہیں کر سکتے تھے، پھیلنے لگا تو اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ پر موجب قواعد صرف و نحو معانی و بیان کے بحث کی جائے اور وجوہ اعجاز قرآن نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی جائیں اس ضرورت کو بھی ہمارے علما نے اُس زمانہ کی حالت کے موافق نہایت خوبی اور لیاقت کے ساتھ پورا کیا۔

جب یونانی فلسفہ اور منطق اہل اسلام میں شایع ہوئی اور مسلمانوں میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے اور ہر فرقہ آیات قرآنی کی تفسیر اپنے اپنے عقاید اور اصول کے موافق منطق اور فلسفہ کی رو سے کرنے لگا تو علمائے متکلمین نے اسلام کی حمایت اس بات میں منحصر سمجھی کہ تفسیر قرآن میں فلسفہ اور حکمت کو دخل دیا جائے اور تفسیروں میں مذہب حق کی تائید دلائل عقلیہ سے کی جائے بعض مفسروں نے اپنی تفسیروں کی بنیاد جزئیات فقہیہ کے استنباط اور اختلافی مسائل

میں اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت پر رکھی۔ غرض کہ جو ضرورت ہمارے قدیم مفسروں کو پیش آئی اُس کو بہ احسن وجوہ پورا کیا گیا۔ لیکن جو ضرورتیں اس وقت نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو۔ اُن کے مذہب کے متعلق درپیش ہیں ویسی ضرورتیں اگلے زمانہ میں کبھی پیش نہیں آئیں اور اس لیے ہمارے علما کو تفسیروں میں ان کے پورا کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ صدی میں کرۂ زمین کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں عیسائی قوموں کی حکومت یا اُن کا رعب وداب قائم نہ ہو اور اگر دنیا عالم اسباب ہے تو ضرور اُن کا رعب وداب روز بروز بڑھتا جائے گا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کسی عیسائی قوم کا رعب وداب قائم ہوا اور فوراً اُن کا مشن اور اُن کی تجارت سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ وہاں پہنچی۔ اگرچہ عیسائی حکومتوں میں عموماً اور انگریزی حکومت میں خصوصاً جس قدر رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے شاید دنیا کی کسی حکومت میں کبھی اس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہوئی ہوگی، لیکن رعیت کو کیسی ہی مذہبی آزادی دیجائے سلطنت کی مقناطیسی کشش اپنا کرشمہ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ حکمران قوم کی رسوم وعادات واوضاع واطوار واخلاق یہاں تک کہ اُن کے دین ومذہب کی طرف محکوم قوم کا دل خود بخود کھنچتا ہے اور جب کہ سلطنت کے ساتھ دعوت دین بھی شامل ہو اور کروڑوں روپیہ حکمران قوم کے مذہب کی اشاعت میں صرف کیا جاتا ہو اور سلطنت بھی ایک ایسی قوم کی ہو جو عقل ودانش اور شائستگی وتمدن میں دنیا بھر کی قوموں میں ممتاز ہو اور طرح طرح کی ترغیبیں تبدیل مذہب کی موجود ہوں تو دیکھنا چاہیے کہ وہ کشش کس حد تک پہنچ

جائے گی، اگرچہ ہندوستان میں ابھی تک مشنریوں کا منتر مسلمانوں پر ویسا کارگر نہیں ہوا جیساکہ اور قوموں پر ہوا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان ہمیشہ اسی طرح مشن کی زد سے بچے رہیں گے مسلمانوں کے پولٹکل زوال کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور اس لیے اسلام کی حقیقت کا سکہ ابھی اُن کے دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ آباؤ اجداد کی مذہبی عظمت اُن کو فراموش نہیں ہوئی، آزادی نے ابھی اُن کو بالکل مطلق العنان نہیں کیا، قومی سوسائٹی کا دباؤ ابھی ان کی طبیعتوں پر کم و بیش باقی ہے۔ تبدیل مذہب سے جو ذلت قوم اور خاندان کی نظر میں ہوتی ہے ابھی تک وہ اُس کو گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر رکاوٹیں کم ہوتی جائیں گی اور نہایت اندیشہ ہے کہ مبادا آخرکار مسلمان بھی اپنے اسلاف کے مذہب سے ویسے ہی بے تعلق ہو جائیں جیسے ہندوستان کی اور قومیں جو ہزار برس سے غیر قوموں کی محکوم چلی آتی ہیں اور مذہب کو بزرگوں کی ریت اور رسم سے زیادہ کوئی چیز نہیں سمجھتیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ اور مذہبوں کی طرح اسلام کی سرحد میں بھی مشن اپنا قدم بڑھاتا جاتا ہے۔ انھیں دنوں میں پنجاب کے ایک دلیسی مشینری کی تحریر ہماری نظر سے گذری جس میں لکھا ہے کہ چالیس برس کے عرصہ میں صرف امرت سر کے گرجا میں ۵۲ مسلمانوں نے بپتسما پایا ہے اور دہلی کے صرف باپٹسٹ مشن میں ۴۸ مسلمانوں نے اصطباغ لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل اسلام کو ایسی حالت بارہ سو برس تک کبھی پیش نہیں آئی، وہ جہاں گئے اور جہاں جاکر رہے اسلام کا رعب و داب اُن کے ساتھ ساتھ رہا، وہ اس عرصہ میں کبھی کسی غیر قوم کے، جو اپنے دین کی اشاعت

ہیں شل عیسائیوں کے سرگرم ہو محکوم ہو کر نہیں رہے۔ اور اس لیے ہمارے قدیم علما کو وہ ضرورتیں جو آج کل اسلام کے خیر اندیشوں کو نظر آتی ہیں۔ کبھی محسوس نہیں ہوئیں۔

دوسری ضرورت، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، اسلام کو سائنس کے حملے سے بچانے کی ہے، علوم جدیدہ کا رواج جیسا عیسائی ملکوں میں ہے ویسا ہی تمام دنیا میں روز افزوں ترقی کرتا جاتا ہے اور جو صدمہ کہ اس نے یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچایا ہے وہی صدمہ دنیا کے تمام مذاہب کو اس سے پہنچتا معلوم ہوتا ہے۔ شام و مصر و ٹرکی میں علوم جدیدہ کی اشاعت کو غالباً پچاس برس سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا، اس قلیل عرصہ میں اُس سے جو نتائج ممالک مذکورہ میں باوجود اسلامی سلطنت ہونے کے پیدا ہوئے ہیں اُن کو طرابلس کے ایک مشہور عالم شیخ حسین آفندی نے اپنی کتاب حمیدیہ[1] میں ایک موقع پر اس طرح ظاہر کیا ہے کہ " جو مسلمان نوجوان مدارس میں علوم جدیدہ اور خاصکر فن طبیعیات کی تعلیم پاتے ہیں وہ اسلام کی قید سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اُن کو اس سے کچھ لگاؤ باقی نہیں رہتا وہ اس بات کے معتقد نہیں رہتے کہ کوئی عالم کا پیدا کرنے والا موجود ہے بلکہ تمام کائنات اور آثار موجودات کو مادہ اور اس کے اجزا کی حرکت اور قوانین طبیعی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور جب کہ اُن کا حال الوہیت کے اعتقاد میں جو اصل اصول اسلام ہے۔ ایسا ہو تو پھر کونسا اعتقاد دین اسلام کی نسبت اُن میں باقی رہ سکتا ہے۔

---

[1] یہ کتاب ۱۳۰۶ھ میں اُن شکوک و شبہات کے رفع کرنے کی غرض سے جو علوم جدیدہ کی

(باقی اگلے صفحہ)

اس کے بعد مصنف ممدوح اپنے ہموطن مسلمانوں کو اس آفت اور بلائے عظیم سے آگاہ کرتا ہے جو اُن کی اولاد میں پھیلتی جاتی ہے اور اُن کو ہوشیار کرتا ہے کہ پہلے اس سے کہ یہ مصیبت لاعلاج ہو جائے اس کا تدارک کریں ظاہر ہے کہ علوم جدیدہ کی تعلیم جبکہ ممالک اسلامیہ میں یہ نتائج پیدا کر رہی ہے تو ہندوستان میں اسلام کیونکر اس کی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے. یہ بھی ممکن نہیں کہ مسلمان اُن نتائج سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کی تعلیم سے دست بردار ہو جائیں وہ پہلے ہی اپنی اس غفلت اور فروگذاشت پر کفِ افسوس مل رہے ہیں جو زمانہ گذشتہ میں انگریزی تعلیم کی نسبت اُن سے ظہور میں آئی اور وہ کیونکر اُس تعلیم سے دست بردار ہو سکتے ہیں جس سے ٹرکی اور شام اور مصر کے مسلمانوں کو بھی کسی طرح مفر نہیں۔ اس کے سوا مسلمانوں کا اولاد کو صرف اس اندیشہ سے مغربی تعلیم نہ دلوانا کہ وہ دین اسلام سے بد اعتقاد نہ ہو جائیں گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ اسلام فلسفہ جدیدہ کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا اور اسلام کا اعتقاد سائنس کے یقین کے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔

جو ضرورتیں ہم نے اوپر بیان کیں بے شک ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو محسوس نہیں ہو سکتیں جن کے دل ہر قسم کے وساوس و شبہات سے بالکل پاک ہیں یا جو بقائے دین اسلام کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتے کہ صرف اُن کے خاندان کا محدود حلقہ الحاد یا ارتداد کے صدمہ سے محفوظ رہے گو

(بقیہ حاشیہ)
تعلیم سے مسلمان نوجوانوں کے دل میں اصول اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ملک شام میں لکھی گئی ہے جس کا نام مصنف نے سلطان عبد الحمید خاں بالقابہ کے نام نامی پر "حمیدیہ" رکھا ہے ۱۲

کہ ساری دنیا ملحد و بد مذہب ہو جائے لیکن جو لوگ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات سے واقف ہیں اور ہر مسلمان کے تبدیل مذہب سے اُن کو وہی صدمہ پہنچتا ہے جو اپنے کسی عزیز یا دوست کے ارتداد سے پہنچنا چاہیے اُن کو یہ ضرورتیں روز روشن کی طرح نظر آ رہی ہیں اور اُن کو وہ زمانہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہب کا اعتقاد، جب تک کہ اس کو زمانۂ حال کے شکوک و شبہات سے منزہ اور مبرا ثابت نہ کیا جائے گا محض آباو اجداد کی تقلید سے قائم نہ رہے گا۔

۱۸۷۸ء میں ایک مرزا صاحب نے سرسید پر یہ اعتراض لکھ کر شائع کیا تھا کہ "سید صاحب دنیوی ترقی کی کوشش میں مذہبی بحث کو کیوں دخل دیتے ہیں" اس پر لاہور گورنمنٹ کالج کے ایک مسلمان طالب علم نے کچھ لکھ کر علیگڑھ گزٹ میں چھپوایا تھا جس میں لکھا تھا کہ "سرکاری مدارس میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا، خواہ ہندو خواہ مسلمان جس کا اعتقاد اپنے مسائل مذہبی پر ویسے ہی استحکام سے ہو جیسا کہ پیشتر تعلیم سے تھا۔ ممکن ہی نہیں کہ انگریزی پڑھ کر مشرقی قصوں اور کہانیوں اور دیووں اور پریوں کی داستانوں کو جھوٹا نہ سمجھے اور جن کتابوں میں اُن کا ذکر ہو اور پھر اُن کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو اُن کو لغو اور بیہودہ نہ جانے۔ آج کل کے طالب علموں کے اگر دل چیر کر دیکھے جائیں تو معلوم ہو کہ اُن کے مذہبی مسائل اُن کے دل میں کیسے کیسے کھٹکتے ہیں اور کوئی مُلا مولوی اُن کی تشفی نہیں کر سکتا۔ بعض جو بہت آزاد طبع ہوتے ہیں اور اپنے کانشنس کو دبا نہیں سکتے اور بغیر کافی دلیل کے اس کو زبردستی جھٹلا نہیں سکتے وہ عیسائی یا لامذہب ہو جاتے

ہیں۔ شکر ہے کہ سید صاحب نے اصلاح مذہبی سے اس آفت کو روکا۔ اسی اصلاح نے پادریوں کی امید کو توڑا۔ اگر سید صاحب یہ اصلاح نہ کرتے تو نہ معلوم مدرستہ العلوم ہی کے کتنے مسلمان طالب علم اصطباغ پا چکے ہوتے۔ ہماری رائے میں سید صاحب کے تمام کارہائے نمایاں ہیں جو نہایت قدر و منزلت کے لائق ہیں ہے اور آئندہ کی ترقی کی جڑ ہے۔ وہ وہی حصہ ہے جس کو مرزا صاحب قابل تنفر قرار دیتے ہیں۔ کاش اگر مرزا صاحب چند سے کالجوں میں رہے ہوتے تو وہ سید صاحب کے اسی کام کو جس کو وہ اب قابل تفریق قرار دیتے ہیں، نہایت عمدہ بلکہ تمام کارہائے نمایاں کی جان قرار دیتے اور جو تحریریں اب باعث دلشکنی اور موجب ضلالت و گمراہی خیال کی گئی ہیں، ہم مرزا صاحب کے گلے میں بطور حرز جان کے لٹکتی دیکھتے۔"

یہ اگرچہ ایک نوجوان طالب علم کی شہادت ہے جس کی شاید لوگوں کی نظر میں کچھ زیادہ وقعت نہ ہو، مگر اس قول کے موافق کہ "اھل البیت ادری بمافی البیت" انگریزی خواں طلبہ کے نزدیک اس نوجوان طالب علم کی شہادت بڑے بڑے مشائخ کبار کی شہادتوں سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے اور اس کا ثبوت بارہا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے سامنے یہ واقعہ گذرا کہ عید الفطر سے پہلے ایک عالم نے وعظ میں یہ روایت بیان کی کہ "عید کے روز روئے زمین پر ہر شہر میں خدا تعالیٰ علی الصباح اپنے فرشتوں کو بھیجتا ہے اور وہ زمین پر اُتر کر ہر ایک بستی کے گلی کوچوں میں منادی کرتے ہیں جس کو تمام مخلوقات سوائے جن و انسان کے سُنتی ہے اور بلند آواز سے

کہتے ہیں کہ اے امت محمد یہ ا ُ خدا کی طرف چلو جو بڑا بخشش والا اور بڑے بڑے گناہ معاف کرنے والا ہے۔ اس وقت اتفاق سے کچھ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی وہاں موجود تھے، جب وعظ ہوچکا تو مسجد سے باہر نکل کر ان میں سے اکثر طلبہ اس روایت پر ہنستے تھے اور ایک دوسرے سے تو کہتے تھے کہ عجیب تماشا ہے جن کو عیدگاہ میں بھیجنا منظور ہے وہ تو سن نہیں سکتے اور تمام نباتات و جمادات سنتے ہیں پھر اگر ہم لوگ عیدگاہ میں نہ جائیں تو ہمارا کیا قصور ہے۔

اسی طرح کے صدہا واقعات ہر روز دیکھتے اور سننے میں آتے ہیں اور زیادہ تر یہ خرابیاں ہمارے واعظوں کی سادہ لوحی اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہوئی ہیں جو اس قسم کی ضعیف و موضوع روایتیں بیان کر کے لوگوں کو دین پر ہنسواتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ہر گروہ کے ساتھ اُس کی عقل اور سمجھ کے موافق گفتگو کرنی چاہیے، سب کو اسی قدیم دستور کے موافق ایک لاٹھی سے ہانکتے چلے جاتے ہیں۔

سرسید نے انھیں خرابیوں کے تدارک کے لیے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی جس کی پہلی جلد ۱۲۹۷ھ میں چھپ کر شایع ہوئی اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس کی جلدیں شایع ہوتی رہیں، مگر افسوس ہے کہ وہ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۂ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۂ انبیاء تک اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل تفسیر السموات، ابطال غلامی، ازالۃ الغین فی قصہ ذی القرنین، ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف و الرقیم وغیرہ وغیرہ کے جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہیے، سرسید نے

یادگار رہ گئے۔

سرسید نے اس تفسیر میں اُن مضامین سے بہت ہی کم تعرض کیا ہے جن کو قدیم مفسرین نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنی اپنی تفسیروں میں بیان کر چکے تھے، یا جن کے بیان کرنے کی اس زمانہ میں کچھ ضرورت نہ تھی، بلکہ انھوں نے زیادہ تر انھیں باتوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جن کو وہ اس زمانہ میں اسلام کی حمایت کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور جن سے اگلی تفسیریں بالکل خالی نظر آتی تھیں۔

پہلی خصوصیت

مثلاً ہمارے مفسروں نے اخبار ماضیہ کی تنقیح پر، جو کہ قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں، بہت ہی کم توجہ کی تھی۔ اس کا سبب خواہ یہ سمجھو کہ ان کو ایسی ضرورت پیش نہیں آئی اور خواہ یہ قرار دو کہ اُس زمانہ میں اطلاع کے ذریعے محدود تھے۔ دونوں صورتوں میں یہ فروگذاشت بلاشبہ تفسیر قرآن میں ایک بہت بڑی کمی کا باعث تھی۔ اگرچہ قرآن مجید میں امم سابقہ کے قصے ایسی تفصیل کے ساتھ جیسی کہ بائبل میں درج ہے، بیان نہیں ہوئے بلکہ اکثر اُن قصوں کی طرف ترہیب یا ترغیب کی غرض سے اجمالی اشارے کیے گئے ہیں لیکن جب کہ اکثر وہی قصے کتب سابقہ میں مفصل مذکور ہیں اور قرآن میں اُن کتابوں کی جا بجا تصدیق کی گئی ہے اس لیے ضرور تھا کہ ہمارے مفسرین جہاں تک ممکن ہوتا قرآن مجید کے ان اجمالی قصوں کی تفصیل کتب سابقہ کے موافق بیان کرتے اور دونوں بیانوں میں تطبیق یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کرتے۔ اگرچہ یہ بات

علمائے مسیحی کے اقرار سے بخوبی ثابت ہے کہ بہت سی مقدس کتابیں جن کا ذکر بائیبل کی موجودہ کتابوں میں آیا ہے۔ اب ناپید ہوگئی ہیں اور اس لیے یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر قصہ جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ وہ موجودہ مجموعۂ بائیبل میں بھی پایا جائے لیکن جو قصے قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً ایسے مذکور ہوئے ہیں جو بائیبل میں بھی اسی طرح یا کسی قدر جزوی اختلاف کے ساتھ مندرج ہیں ان کی تطبیق کرنی یا عدم مطابقت کی وجوہ بیان کرنی خاصکر اس زمانے میں ایک ایسی بات تھی جس کی ضرورت کا کسی طرح انکار نہیں ہوسکتا۔

سرسید نے سب سے پہلے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے ہر ایسے قصہ یا واقعہ کا جو قرآن میں مذکور ہوا ہے تا بمقدور بائیبل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن اور بائیبل کی تطبیق کی ہے یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے اور جس قصہ کا پتہ موجودہ بائیبل میں نہیں لگا تا بمقدور اُس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔

مثال ۱

مثلاً طالوت اور جالوت کی لڑائی کا قصہ جو سورۂ بقرہ میں مذکور ہے، یہی قصہ شموئیل نبی کی کتاب میں بھی بیان ہوا ہے مگر اُس میں وہ مضمون نہیں ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے کہ:-

"اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ" لیکن یہی مضمون کتاب قضاۃ کے ساتویں باب میں جہاں جدعون کی مدیانیوں پر لشکرکشی کا ذکر ہے، مندرج ہے۔ اس لیے عیسائی مورخوں نے قرآن کے بیان پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں غلطی سے جدعون

کے لشکر کے واقعہ کو طالوت کے لشکر کے واقعہ سے ملا دیا ہے حالانکہ دونوں واقعے بالکل جدا جدا ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر واقع ہوئے ہیں۔

مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں علمائے مسیحی کے اقرار اور شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب شموئیل کے بعض ابواب کے متعدد درس صحیح نہیں ہیں اور جان کٹو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اُسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلاکم وکاست صحیح جانیں کیونکر ممکن ہے کہ جنھوں نے الحاق کیا تھا انھوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو" اس کے سوا یہودی اور عیسائی عالموں میں اختلاف ہے۔ بعض تین نبیوں کی اور بعض پر مباہ نبی کی لکھی ہوئی بتاتے ہیں اور بعض کی رائے ہے کہ شموئیل بنی کے بہت مدت بعد لکھی گئی ہیں اور اس سے بآسانی خیال میں آسکتا ہے کہ بعض واقعات الٹ پلٹ ہو گئے ہوں یا بعض تحریر میں نہ آئے ہوں

مثال ۲

یا مثلاً قرآن مجید میں جو عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات کے ضمن میں خلق طیر کے واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ موجودہ عہد جدید کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے اس لیے عیسائی اُس کو ایک غلط واقعہ بیان کرتے ہیں۔ مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ گو یہ واقعہ موجودہ عہد جدید میں نہیں ہے لیکن وہ انجیلیں جو اناجیل طفولیت کے نام سے اب تک موجود ہیں اور جن کو ایک زمانہ میں اکثر مشہور عیسائی عالم تسلیم کرتے تھے اور مدتوں ایشیا اور افریقہ کے گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھیں۔ اُن

میں یہ واقعہ جس کا قرآن میں اجمالی ذکر ہوا ہے، بہت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور ان انجیلوں کا تمام بیان جو اس واقعہ سے متعلق ہے تفسیر میں نقل کیا ہے جس سے عیسائیوں کو اب یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہی کہ خلق طیر کا ذکر جو قرآن میں آیا ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔

مثال ۳

یا مثلاً عیسائی قرآن کی اُن آیتوں کے مضمون پر اعتراض کرتے ہیں جن سے قوم عاد کا قوم نوح کے بعد ان کا جانشین ہونا اور حضرت ہودؑ کا قوم عاد کی ہدایت کے لیے مبعوث ہونا پایا جاتا ہے کیونکہ بائبل میں اس کا کچھ ثبوت موجود نہیں ہے۔ مگر سرسید نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں اُن کتبوں کے بموجب جو اوّل معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں عبدالرحمٰن حاکم یمن کو ملے تھے اور اب ۱۸۳۲ء میں انگریزوں کو یمن کی پیمایش کرتے ہوئے وہاں کے کھنڈرات میں دستیاب ہوئے ہیں، عیسائیوں کے دونوں اعتراضوں کو رد کیا ہے اور ریورنڈ فاسٹر نے جو غلط نتیجے اُن کتبوں سے نکالے ہیں اُن کی غلطی ثابت کی ہے۔

غرض کہ تاریخی اور جغرافی تحقیقات جو قرآن مجید کے قصوں سے متعلق ہے اس کی طرف سرسید سے پہلے ہمارے مفسروں نے بہت ہی کم التفات کیا تھا شاید اگلے زمانے میں اس کی ضرورت نہ ہو اور ہر مسلمان کے یقین کے لیے کسی قصہ یا واقعہ کا قرآن میں مذکور ہونا ہی کافی ہو لیکن اس زمانے میں اس کی نہایت ضرورت تھی۔ قطع نظر مخالفین کے اعتراضات کے جن کو ہر طرح کی نکتہ چینی کرنے کی آزادی ہے، خود تعلیم یافتہ مسلمانوں

کی تشفی کے لیے ہر قصہ اور ہر واقعہ اور ہر نام اور ہر مقام کو جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں، زمانۂ حال کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر منطبق کرنا اور درصورت عدم تطبیق کے تاریخی وجغرافی تحقیقات کو غلط ثابت کرنا ضرور ہے۔

اگر ہمارے قدیم مفسروں نے بھی اپنی تفسیروں میں امم سالفہ کے حالات کثرت سے قلمبند کیے ہیں لیکن اول تو ان کا ماخذ زیادہ تر وہ ضعیف روایتیں ہیں جو محدثین کے نزدیک اعتبار کے قابل نہیں اور اگر بالفرض ان روایتوں کو اصول حدیث کے موافق صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو بھی وہ صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے کافی ہوسکتی ہیں جن کے دل شکوک وشبہات سے بالکل پاک ہیں نہ کہ عیسائیوں کے لیے جو قرآن مجید کے قصوں پر مورخانہ نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور نہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو یوروپین مصنفوں کے اعتراضات اُن کی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں بعض ایسے قصے بھی بیان ہوئے ہیں جو بائبل میں مذکور نہیں ہیں جیسے ذوالقرنین کا قصہ یا اصحاب کہف کا قصہ۔ سرسید نے ان قصوں کی تحقیقات میں بھی کمابیغی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قصوں کے متعلق انھوں نے دو علیحدہ رسالے لکھے ہیں اور دونوں کا جس قدر بیان قرآن مجید میں ہوا ہے اس کے تمام جزئیات کو تاریخ مسلّمہ پر منطبق کرنے میں کوشش کی ہے۔ لیکن ذوالقرنین کے قصہ میں جو انھوں نے چی وانگٹی نغفور چین کو ذوالقرنین کا مصداق ٹھیرایا ہے اُس پر بلاشبہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرآن میں جس قدر قصے اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں اُن میں کوئی قصہ ایسا نہیں ہے جو عرب یا اُس کے

قرب وجوار میں مشہور و مسلم نہ ہو۔ پس کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ایسے اجنبی ملک کے بادشاہ کا قصہ جس کے حالات سے نہ صرف عرب بلکہ دنیا کی اکثر قومیں خاصکر نزول قرآن کے زمانہ میں بالکل بے خبر تھیں۔ اُس کتاب میں بیان کیا جائے جو عرب کے اُمیوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہو۔ اکثر مفسروں نے سکندر رومی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ اور ابوریحان بیرونی نے بنی حمیر کے بادشاہوں میں سے ابو کرب شمس بن عبیر بن افریقس کو اُس کا مصداق ٹھیرایا ہے مگر یہ دونوں قول سرسید کے قول سے بھی زیادہ مخدوش ہیں حق یہ ہے کہ اس قصہ کی کوئی تفسیر اب تک ایسی نہیں کی گئی جس میں اس کے تمام جزئیات کو تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر منطبق کیا گیا ہو اور باوجود اس کے قرآن کے وظیفہ مستمرہ کے بھی خلاف نہ ہو۔

دوسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ جو اعتراضات زمانہ حال کے نکتہ چین مسلمانوں کے اُن مسائل و معتقدات پر وارد کرتے ہیں جو اسلام کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں جیسے جہاد، حج، صوم رمضان، طلاق، حرمت ربا معراج، بہشت و دوزخ وغیرہ وغیرہ۔ ان اعتراضوں اور اُن مسائل و معتقدات پر جس صفائی کے ساتھ اس تفسیر میں بحث کی گئی ہے اور جن مناسب طریقوں سے مقتضائے وقت کے موافق ان کو دفع کیا گیا ہے اس کی نظیر قدیم تفسیروں میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ یہاں ہم اُن میں سے صرف دو مثالیں نہایت اختصار کے ساتھ بطور نمونہ کے ناظرین کی اطلاع کے لیے بیان کرتے ہیں۔

مثال نمبر ۱

سب سے بڑا معرکۃ الآرا جہاد کا مسئلہ ہے جس پر سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں تفسیر لکھنے سے پہلے کافی بحث کر چکے تھے مگر تفسیر میں مسئلہ مذکور کے متعلق اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جن کو تیرہ سو برس سے عیسائی قوموں نے اسلام کے مطعون کرنے کا ایک زبردست آلہ بنا رکھا تھا اور جن کی بدولت واقعۂ ۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو نہایت سخت صدمہ پہنچا تھا۔ انھوں نے اول سورۂ بقرہ کی اُن آیتوں کی تفسیر میں جن میں مشرکین مکہ سے قتال کرنے کا حکم ہے اجمالی طور پر جہاد کے متعلق ایک لطیف تقریر لکھی ہے جس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں " اکثر لوگ اسلام پر یہ طعن کرتے ہیں کہ اس میں تحمل اور بردباری اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں سے پہنچیں اُن کی صبر کے ساتھ برداشت نہیں ہے اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق کے برخلاف ہیں مگر یہ ایک بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے۔ بے شک قرآن مجید میں جو لڑائی کے احکام نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے اُن کو مسلمان بادشاہوں نے دینداری کے بہلانے سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لیے نہایت بد اخلاقی اور ناانصافی سے برتا اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کیے اور علمائے اسلام نے اُن کی تائید کے لیے ایسے مسئلے بیان کیے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے مگر اُن کے ایسا کرنے سے جو برائی قرار دی جاوے وہ انھیں پر محدود ہے جنھوں نے ایسا کیا، نہ اسلام پر۔"

"اسلام میں اگرچہ جابجا عفو و صبر و تحمل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور ان پر رغبت دلائی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ بدلا لینے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے۔ کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانون قدرت کے مناسب نہیں ہے! اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے؛ انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں اور سننے اور پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ ہوا کی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے اور چوں کہ وہ اصول فطرت انسانی بلکہ قانون قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں، کبھی ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔"

"کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بُرد بار و متحمل کرنے والی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھانے والی جس سے آنکھوں میں چکاچوند آجاوے نہیں ہے۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان کا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا! انجیل میں لکھا ہے کہ" اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دے"۔ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے! اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو! اسی طرح آباد رہے! اور اسی طرح لوگوں کی جان اور مال امن میں رہے! نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ جب سب ایسے ہی ہو جاویں تو دنیا سے شر اٹھ جاوے مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے! یا کبھی ہو گا! یہ سب ناشدنی باتیں

ہیں جو خیال میں شدنی قرار دے کہ انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے"

"عیسائی مذہب جس کی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق پر لگائی گئی تھی وہ پھولا اور پھلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اس کو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سرسبز ہوا، مگر دیکھو کہ اس نے کیا پھل پیدا کیا؟ ایک بھی نصیحت اُس کی کام نہ آئی اور خود مذہب نے جو خوں ریزی اور بے رحمی اور ناانصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھائی وہ شاید دنیا میں بے مثل ہوگی اور جس نیکی میں اس کی جڑ لگائی گئی تھی اس نے کچھ پھل نہیں دیا، کیونکہ وہ قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی، کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی، اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں۔ کیا یہ پھل اسی درخت کا ہے جس کی جڑ ایسی نیکی میں لگائی گئی تھی جو خلافِ قانون قدرت تھی: حاشا و کلا، بلکہ یہ اس کا پھل ہے کہ اُس درخت کو وہاں سے اکھاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانون قدرت کی زمین ہے اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اس کی جڑ میں لگی ہوئی ہے اسی قدر اس میں نقصان ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ رحیم مذہب کا حال سنو جس نے ایک چھوٹے سے چھوٹے جانور کی جان کو بھی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہے خون کا بہانا آدمی کا ہو یا درندے کا یا ایک پشہ کا خدا کی صنعت کو ضائع کرنا سمجھا ہے مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہے۔ اس اصول نے جو قانونِ قدرت کے مخالف تھا کیا نتیجہ دیا؟ قتل و خوں ریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہے جیسی کہ قانونِ قدرت سے ہونی چاہیے۔ وہی جو ایک پشہ کا مارنا گناہِ عظیم سمجھتے تھے، ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے

ہیں. پس کوئی قانون گو وہ ظاہر میں کیسا ہی چمکیلا اور خوشنما آیند ہو جبکہ وہ قانون قدرت کے برخلاف ہے محض نکما اور بے اثر ہے۔"

"اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُس کے تمام قانون، قانونِ قدرت کے مطابق اور عملدرآمد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ، جہانتک کہ قانوُن قدرت اجازت دیتا ہے، رحم ہے معافی کی جگہ معافی ہے۔ بدلے کی جگہ بدلا ہے۔ لڑائی کی جگہ لڑائی ہے۔ ملاپ کی جگہ ملاپ ہے اور یہی بڑی دلیل اُس کی سچائی کی اور قانون قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے۔

"اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جس نے اُن کو یعنی مسلمانوں کو، امن دیا ہو مسلمان ہو یا کافر اس کی اطاعت اور احسانمندی کی ہدایت کرتا ہے، کافروں کے ساتھ جو عہد و قرار ہوئے ہوں ان کو نہایت ایمانداری کے ساتھ پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ خودکسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خوں ریزی کی اجازت نہیں دیتا۔ کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اس میں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے، حملہ کرکے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ صرف دو صورتوں میں اس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے، ایک اُس حالت میں جب کہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے، نہ کسی ملکی اغراض سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں، خواہ مسلمان مسلمانوں میں اور خواہ مسلمان و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے، اس کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جب کہ اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو، اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں

اُن کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو مگر اس حالت میں بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اُس ملک میں بطور رعیت کے رہتے ہیں، گو صرف بوجہ اسلام کے اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی، یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اُس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خودمختار ہیں اور اُس ملک میں امن لیے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں، اُن کو مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے، یا اُن کے لیے امن اور مذہبی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اُس کو مذہب کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔"

"یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے، یہی لڑائی ہے جس کے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کے لڑنے والوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی ناانصافی اور زیادتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے! کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانونِ قدرت اور انسان کی فطرت کے مخالف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے! کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہوتا بلکہ، دوسرا گال پھیر دینا، خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا!

" لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے اس میں بجز اس کے کہ دشمنوں کو قتل کرو۔ لڑائی میں بہادری کرو، دل کو

مضبوط رکھو، میدان میں ثابت قدم رہو، فتح کر دیا مارے جاؤ اور کچھ نہیں
کہا جاتا، وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اُس
موقع اور محل کو جس کی نسبت قرآن میں لڑنے والوں کے دلوں کے مضبوط
کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں، چھوڑ کر اُن آیتوں کو عموماً خونخواری اور
خوں ریزی پر منسوب کرے۔ جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے۔
تو یہ خود اس کا قصور ہوگا نہ اسلام کا "

لڑائی میں بھی جو رحم قانون قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے
اس میں فرو گذاشت نہیں کیا، عورتوں کو، بچوں کو، بوڑھوں کو اور جو لڑائی میں
شریک نہ ہوئے ہوں ان کو قتل کرنے کی ممانعت کی، عین لڑائی میں اور
صف جنگ میں جو مغلوب ہو جاوے اُس کے قتل کی اجازت نہیں دی
صلح کو اور معاہدۂ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی باغ کو، کھیتوں کو
جلانے کی ممانعت کی، قیدیوں کو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا
حکم دیا، نہایت ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو عورت ہوں یا مرد غلام
اور لونڈی بنا لینے کا تھا اس کو معدوم کیا۔ اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں
انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے! ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اس میں
سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی، بلکہ برخلاف اس کے بے انتہا ظلم و ستم
کیے۔ مگر جبکہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اُس سے داغ
نہیں لگ سکتا۔ وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے جنھوں نے عمرؓ کو،
عثمانؓ کو، علیؓ، حسینؓ کو ذبح کر ڈالا تھا، کعبہ کو جلا دیا تھا، پس ان کے کردار
سے اسلام کو کیا تعلق ہے!"

"مشرکین مکہ نے اُن لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے۔ صرف اسلام

کی عداوت سے اور خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت سے ظلم کیے تھے اور تکلیفیں پہنچائی تھیں، قتل کے درپے تھے، یہاں تک کہ ایک دفعہ مسلمانوں نے حبشہ میں جا کر پناہ لی اور آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو چھوڑ کر مدینے چلے آئے، پھر انھوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا اور مکہ میں حج کے آنے سے روکا، لڑائی پر آمادہ ہوئے، تب اسلام نے اُن سے لڑنے کا حکم دیا، پس جس قدر احکام قتل مشرکین کے ہیں وہ سب انھیں لڑنے والوں سے متعلق ہیں، وہ بھی اُسی وقت تک کہ فتنہ و فساد رفع ہو جائے۔ جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے :" وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃٌ ویکون الدین اللہ ۔"

امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ "مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو مارتے تھے اور ایذا دیتے تھے، یہاں تک کہ تنگ ہو کر مسلمان حبش کو چلے گئے پھر بھی وہ برابر ایذا اور تکلیف دیتے رہے، یہاں تک کہ مسلمان مدینہ میں ہجرت کر گئے اور مشرکین کی غرض ایذاؤں اور تکلیفوں سے یہ تھی کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں سے لڑو جب تک کہ ان پر غالب ہو جاؤ" تاکہ وہ تم کو تمھارے دین سے پھیرنے کے لیے ایذا نہ دے سکیں اور تم شرک میں نہ پڑو " یکون الدین للہ" کا فقرہ بھی انھیں آیتوں کے ساتھ ہے جو مشرکین عرب کے حملہ کے دفع کرنے کو لڑنے کی بابت نازل ہوئی تھیں۔ اس کے یہ معنی سمجھتے کہ اتنا لڑنا چاہیے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے۔ یہ تو محض نادانی کی بات ہے جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے، اس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ اس قدر لڑنا چاہیے کہ اللہ کے دین کے بجا لانے میں جو کافر ہرج

ڈالتے ہیں وہ نہ رہے اور اللہ کے لیے دین ہو جائے کہ مسلمان خدا کے لیے اس کو بے ایذا کے بجا لا سکیں۔"

سرسید نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں مسئلہ جہاد کے متعلق صرف اسی اجمالی بیان پہ اکتفا کیا ہے۔ مگر سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کی تفسیر میں اس بحث کو نئے سرے سے بہت بڑے اہتمام کے ساتھ اٹھایا ہے اور اپنی تفسیر کی چوتھی جلد قریب نصف کے اسی مسئلہ کی تحقیقات پر لکھی ہے۔

انھوں نے سورۂ توبہ کی تفسیر میں اول بطور الزامی حجت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیوں کا مقابلہ حضرت موسیٰ کے قتل و غارت سے جو کہ توریت میں مذکور ہے کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیاں اُس کے مقابلہ میں بالکل رحمت تھیں اور جو لوگ توریت کو اور حضرت موسیٰؑ کو مانتے ہیں اُن کے لیے حضرت مسیحؑ کا یہ قول کافی ہے کہ "تو اس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے کیوں دیکھتا ہے اور جو شہتیر تیری آنکھ میں ہے اُسے دریافت نہیں کرتا۔" اس کے بعد وہ لکھتے ہیں "مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم صرف حجت الزامی پر اکتفا کریں بلکہ ہمارا مقصود ہر امر کی تحقیق کرنا اور اُس کی اصلیت کو ظاہر کرنا ہے اس لیے ہم اس امر کو بخوبی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے اُن تمام اعتراضات کا جو قدیم سے عیسائی اسلام کے مسئلہ جہاد پر کرتے چلے آئے ہیں، لب لباب بیان کر کے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہوئیں اُن سے صرف امن قائم رکھنا اور کفار کے شر سے اسلام اور اہل اسلام کو بچانا مقصود تھا نہ کہ زبردستی ہتھیاروں کے

زور سے، جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں۔ اسلام منوانا۔ اور اس کے ثبوت میں اول ان تمام واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس تک برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے مکہ معظمہ میں قریش کے ہاتھوں سے کیسی کیسی سختیاں اور ظلم و ستم برداشت کیے اور کیا کیا مصیبتیں جھیلیں اور کس بیم و ہراس کی حالت میں یہ زمانہ اسلام اور بانی اسلام پر گذرا یہاں تک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو دین اسلام کے معدوم کرنے یعنی رسول خدا صلعم کے قتل کا نہایت پختہ طور سے منصوبہ باندھا گیا۔ دو دفعہ انھیں سختیوں اور ظلم و ستم سے تنگ آ کر بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں ہجرت کر کے حبشہ کو چلے گئے اور آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے وطن مالوف چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ قریش نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے آزار پہنچانے میں کمی نہیں کی۔ حبشہ کے مہاجروں کا تعاقب انھوں نے سمندر کے کنارہ تک کیا اور جب وہ ہاتھ نہ آئے تو نجاشی کے پاس بہت سے تحفے اور ہدیے بھیج کر مسلمانوں کو اس سے مانگا مگر نجاشی نے ان کے دینے سے انکار کیا اہل مدینہ کے ساتھ بھی جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا وعدہ کیا تھا یا جو مکہ سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے۔ قریش نے برائی کرنے میں کچھ کمی نہیں کی اور مدینہ پر بھی قریش کے حملہ کرنے کا برابر خطرہ لگا رہا۔

جب کہ اسلام اور اہل اسلام کی یہ حالت تھی تو سرسید لکھتے ہیں کہ وہ ایسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مہاجرین و انصار کو اپنے اور مدینہ کی حفاظت اور امن قائم رہنے کے لیے۔ چار امر لازمی تھے کہ

بغیر اُن کے کبھی امن اور مطلوبہ حفاظت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

(۱) اس بات کی خبر رکھنی کہ قریش مکہ کیا کرتے ہیں اور کس منصوبہ میں ہیں۔

(۲) جو قومیں کہ مدینہ یا نواح مدینہ میں رہتی تھیں اُن سے امن کا اور قریش کی مدد نہ کرنے کا معاہدہ کرنا۔ لیکن عہد شکنی کی حالت میں اُن سے مقابلہ کرنا اس منصوبہ کے لیے ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ امن کا معاہدہ کرنا کیونکہ اگر عہد شکنی کی مکافات قائم نہ کیجائے تو کوئی معاہدہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتا اور امن مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) جو مسلمان کہ مکہ میں بہ مجبوری رہ گئے تھے اور موقع پاکر وہاں سے بھاگ آنا چاہتے تھے اُن کے بھاگ آنے پر جس قدر ہو سکے اُن کی اعانت کرنا چنانچہ جو قافلہ مکہ سے نکلتا تھا ہمیشہ احتمال ہوتا تھا کہ شاید اس کے ساتھ بہانہ کر کے کوئی مسلمان مدینہ کی طرف بھاگنے کے ارادہ سے نہ نکلا ہو۔

(۴) جو گروہ قریش کا مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کو نکلے یا کسی طرح پر احتمال ہو کہ وہ مدینہ پر آنے والا ہے اس کا ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا کیونکہ ایسا کرنا اُسی امن کے قائم رکھنے کے لیے لازمی اور ضروری ہے "

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ" ان کے سوا دو امر اور ہیں جو ہتھیاروں کے اٹھانے کا باعث ہوتے ہیں۔

(۱) یہ کہ کفار اُن مسلمانوں کو جو اُن کے قبضہ میں ہوں تکلیف اور ایذا دیتے ہوں اور ان کی مخلصی کے لیے لڑائی کیجاوے کون شخص ہے جو اس لڑائی کو انسانی اخلاقی اور انسان کے برخلاف کہہ سکتا ہے۔ اور یہ اتہام کر سکتا ہے کہ وہ زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے مذہب قبلوانے کے لیے ہے۔

(۲) یہ کہ کفار مسلمانوں کو ان کے احکام مذہبی ادا کرنے کے لیے مانع ہوں۔ بشرطیکہ وہ اُن کی عملداری میں رہتے نہ ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں اُن کو وہاں سے ہجرت کرنی لازم ہے نہ لڑائی۔ اگرچہ اس لڑائی کی بنیاد ایک مذہبی امر پر ہے لیکن اس کا مقصد اپنی مذہبی آزادی حاصل کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا منوانا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ" ایک اور امر ہے جو انھیں قسموں کی لڑائیوں کا ضمیمہ ہے۔ یعنی جس ملک یا قوم سے انھیں امور (یعنی مذہبی امور) کے سبب مخالفت ہے اور لڑائی مشتہر ہو چکی ہے اُس ملک یا قوم پر چھاپہ مارنا یا اُن کا اسباب اور اُن کی رسد اور اُن کے ہتھیاروں کو لوٹ لینا۔ اس زمانہ تہذیب میں بھی کونسی مہذب سے مہذب قوم ہے جو اس فعل کو نامہذب و ناجائز قرار دے سکتی ہے؛ اور کون ہے جو اُس کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا قبلوانا قرار دے سکتا ہے۔ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئیں وہ انھیں امور پر مبنی تھیں ایک لڑائی بھی اس غرض سے نہیں ہوئی کہ مخالفوں کو زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے اسلام منوایا جائے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ" اس دعوے کا ثبوت دو طرح پر ہو سکتا ہے۔ اول اُن احکام سے جو قرآن مجید میں لڑائیوں کی نسبت وارد ہیں اور جن سے ظاہر ہوگا کہ لڑائی کا حکم صرف امن قائم کرنے کے لیے تھا نہ زبردستی سے اسلام قبلوانے کے لیے۔ دوسرے اُن لڑائیوں کے واقعات پر غور کرنے سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں واقع ہوئیں۔ اس کے بعد ایک امر اور بحث طلب باقی رہ جائے گا (یعنی یہ) کہ ایک پیغمبر کو اس قسم کی لڑائیاں لڑنا بھی زیبا ہے یا خاموشی سے گردن کٹوا کر اور سر کو طشت

میں رکھوا کر دشمن کے سامنے جانے دینا! یا کافروں کے ہاتھوں میں اپنے تئیں ڈلوا کر صلیب پر چڑھنا اور جان دینا! سو ہم اس پر بھی اخیر کو بحث کریں گے!

اس کے بعد انھوں نے نہایت شد و مد سے دعوے کیا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں جبراً مسلمان کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مسلمان کرنے کے لیے صرف وعظ اور نصیحت کرنے کی ہدایت ہے۔ پھر وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں مذہب کی آزادی کا حکم ہے مثلاً سورۂ نحل میں آنحضرت کو حکم ہے کہ "دعوت اسلام کر حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان سے بحث کر پسندیدہ طریقہ کے ساتھ"۔ یا سورۂ نور میں حکم ہے کہ "خدا اور رسول کی فرماں برداری کرو اور اگر تم پھر جاؤگے تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف حکموں کا پہنچا دینا ہے"۔ یا سورۂ قاف میں فرمایا کہ "اے پیغمبر تو اُن پر جبر کرنے والا نہیں ہے"۔ اور سورۂ غاشیہ میں فرمایا کہ "اے پیغمبر تو صرف نصیحت کرنے والا ہے کچھ اُن پر کروڑا نہیں ہے"۔ اور سورۂ یونس میں فرمایا "اے پیغمبر کیا تو اُن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور سورۂ بقرہ میں صاف صاف فرمایا کہ "دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے"۔

اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ قرآن کی یہ نصیحتیں اسی وقت تک تھیں جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے مگر جب مدینہ میں چلے گئے اور مہاجرین و انصار ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسلام کو قوت حاصل ہو گئی اس وقت یہ نصیحتیں بدل دی گئیں اور تلوار کے زور سے مسلمان کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اِس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اول تو سورۂ نور اور سورۂ بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جب کہ

اسلام کو بخوبی قوت حاصل ہو گئی تھی، حالانکہ انھیں سورتوں میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، یہ حکم ہے کہ رسول کا کام صرف حکموں کو پہنچا دینا ہے اور دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے۔ دوسرے خدا کے احکام جو بطور اصل اصول کے نازل ہوئے ہیں وہ جگہ کے بدلنے یا قوت وضعف کے تفاوت سے تبدیل نہیں ہو سکتے پس جب کہ آپ مکہ میں تھے جب بھی اور جب مدینہ میں چلے گئے جب بھی یہی حکم تھا کہ کوئی شخص زبردستی سے مسلمان نہ کیا جائے۔ ہاں جب آپ یہاں تشریف لے گئے تو بیشک لڑائی کا حکم ہوا مگر نہ اس لیے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان کیا جائے بلکہ محض امن قائم کرنے کے لیے جیسا کہ آئندہ بہ تفصیل بیان کیا جائے گا۔

اس کے بعد صلح اور معاہدہ کی حالت میں جو مذہبی آزادی قرآن میں غیر مسلمین کو دی گئی ہے اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور قرآن کی وہ تمام آیتیں نقل کی ہیں جن میں صلح و معاہدہ کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ پھر قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں جن میں کفار سے لڑنے کا حکم ہے ایک ایک کر کے ذکر کی ہیں اور نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ ان سے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں صرف تین قسم کے لوگوں سے لڑائی کا حکم ہوا ہے۔

(۱) اُن لوگوں سے جو خود مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں۔

(۲) اُن لوگوں سے جنھوں نے دغابازی کی ہو اور معاہدوں کو توڑ دیا ہو۔

(۳) اُن لوگوں سے جنھوں نے مسلمانوں کو یا اُن کے بچوں اور عورتوں کو عذاب اور تکلیف میں ڈال رکھا تھا۔ ان تین صورتوں کے سوا کہیں قرآن مجید میں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا۔ پھر انھوں نے آنحضرت صلعم کے زمانہ کی تمام لڑائیاں جو غزوہ اور سریہ کے نام سے مشہور ہیں بلا استیعاب بیان کی ہیں

اور سلہ سے سلہ تک ۳۱ غزوات اور ۵۲ سرایا کا مفصل حال حدیث اور سیر اور جغرافیہ کی سولہ معتبر کتابوں سے لکھا ہے اور کمال خوبی اور صفائی کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان ۸۳ واقعات میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس غرض سے کیا گیا ہو کہ لوگوں کو بجبر و بزورِ شمشیر مسلمان کیا جائے بلکہ یہ تمام لڑائیاں اور مقابلے یا تو دشمنوں کی مدافعت اور ان کا حملہ روکنے کے لیے ہوئے تھے، یا اُن کا ارادۂ فاسد معلوم ہونے کے بعد اُن کو منتشر کرنے کو، یا اُن کی عہد شکنی اور دغابازی ظاہر ہونے کے بعد اور یا اُن لوگوں کی مدد کے لیے جو خبر رسانی کی غرض سے بھیجے گئے تھے اور دشمنوں سے اُن کا مقابلہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس نے ملک کا انتظام ہاتھ میں لیا ہو اور اس کو اس قسم کی لڑائیاں نہ پیش آئی ہوں۔ پھر ان لڑائیوں کی نسبت یہ کہنا کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے مسلمان کرنے کے لیے تھیں ایک ایسا غلط قول ہے جس کو کوئی ذی عقل بجز اُس کے جس کے دل میں تعصب بھرا ہو تسلیم نہیں کر سکتا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ "جس قوم کی کسی ملک میں حکومت ہو جاتی ہے قدرتی طور پر اُس قوم کے نہ صرف مذہب کو بلکہ رسم و رواج عادات و اطوار کو ترقی ہوتی ہے اور لوگ اُس کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں اور یہ مقولہ کہ اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْاَمَانِ" ہر ایک قوم اور ہر ایک مذہب پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے سبب اُسی قدرتی قاعدہ سے اسلام کی ترقی کو بھی مدد پہنچی۔ بلکہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا عجیب واقعہ پایا جاتا ہے جو اور کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ہے کہ فاتح قوم نے فتح کامل حاصل کرنے اور استقلال کامل پانے کے بعد اپنی مفتوح قوم (یعنی مسلمانوں)

(حاشیہ اگلے صفحہ ۱)

کا دفعتہً مذہب اختیار کر لیا۔"

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بت شکنی میں (جس کو مخالفین اسلام مثل سلاطین اسلام کی بت شکنی کے قابل الزام سمجھتے ہیں) اور محمود عالمگیر وغیرہ کی بت شکنی میں فرق بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ "کعبہ ایک مسجد تھی حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی خدائے واحد کی عبادت کے لیے۔ اس کے بعد جب عرب بت پرست ہو گئے تو اس مسجد میں انھوں نے بت رکھ دیے جن کا برباد کرنا اور دین ابراہیمؑ کا اس مسجد میں جاری کرنا ابراہیمؑ کے بیٹے کے فرزند کو لازم تھا۔ قوم عرب جس کا غالب حصہ ابراہیمؑ کی نسل سے تھا اور جس نسل میں خود آنحضرت صلعم بھی تھے اس قوم کو بتوں کی پرستش سے چھڑانا اور ابراہیمؑ کے خدا کی پرستش سکھانا ضرور تھا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی قوم کے بت توڑے تھے اس سے دیگر اقوام کے مذہب کی آزادی کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں بت شکنی اور غیر مذہب کے معبدوں کو برباد کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ اسی طرح ہزاروں مثالیں اس کے برخلاف موجود ہیں مسلمانوں کی سلطنت دنیا کے بہت

لہ یہاں فاتح قوم سے مراد خوانین تاتار ہیں جن میں سب سے زیادہ نامور چنگیز خاں اور ہلاکو خاں ہوئے ہیں جو مسلمانوں کے سخت دشمن تھے چنانچہ چنگیز خاں کا قول تھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں کے قلع قمع کے لیے بھیجا ہے: ان کی حکومت تمام ایران توران خوارزم۔ دشت قپچاق اور روس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی سلطنت اور حکومت کے زمانہ میں اول برکہ خاں چنگیز خاں کا پوتا مسلمان ہوا تھا۔ اور پھر سلطان احمد جس کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا اسلام لایا اور پھر رفتہ رفتہ تمام تاتاریوں میں اسلام پھیل گیا ۱۲۔

بڑے حصہ میں پھیلی ہوتی تھی، اس میں مختلف مذہب کی قومیں رہتی تھیں تمام سینیگاگ اور تمام گرجے جو زیادہ تر رومن کیتھلک مذہب کے تھے۔ بدستور قربانی اور گھنٹے بجاتے تھے، تمام ملک میں ناقوس کی آواز گونجتی تھی۔ مندروں میں بت موجود تھے، ہر ایک قوم اپنے مذہب میں آزاد تھی پس ان تمام حالات کو جو نہایت کثرت سے تھے، بھول جانا اور چند واقعات کو جو اس کے برخلاف شخصی طبیعت سے واقع ہوئے تھے، پیش کرنا اور کہنا کہ اسلام نے مذہبی آزادی کو مٹایا تھا محض نا انصافی ہے "

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی نسبت لکھے ہیں کہ "تمام انبیا جب کہ قوم کی اصلاح اور اُن کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً اُن کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں، اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا! اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر بعد حضرت مسیح کے اس کے لیے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اُس کے پیروؤں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزور حکومت اس کو ترقی دی گئی۔ قرآن میں نہایت عمدہ اور بالکل سچ بات خدا تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا (یعنی اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو ڈھا دی جائیں عیسائیوں اور درویشوں کی خانقاہیں اور یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں بہت زیادہ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے) پس یہ کہنا کہ انبیا کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں ایک ایسا قول ہے جس کو قانون قدرت مردود ٹھیراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی

اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں، مگر حضرت مسیح نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اُس وقت سے اُن کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گذرا تھا اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) اُن پر ایمان لائے تھے، اُن کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں حاصل نہیں ہوئی تھی اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا اس کے بعد اگر اس کے (یعنی دین مسیحی کے) ایسی حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکتے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلعم کو روحانی بادشاہی کے سوا سلیمانؑ جیسی سلطنت کے انتظام میں داخل ہوتے میں بہت بڑی مجبوری تھی، عرب میں بادشاہت کا وجود نہ تھا، ہر ایک قبیلے کا سردار اُن کا حاکم ہوتا تھا اور جس کو سب لوگ بڑا سمجھتے تھے اُس مجبوری افسر بننا اور تمام ملکی انتظام کرنا لازم تھا جبکہ تمام قبائل رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے تو امکان سے خارج تھا کہ وہ لوگ سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو اپنا سردار تسلیم کرتے اور تمام معاملات ملکی بجز آنحضرت صلعم کے حکم کے اور کسی کے حکم سے تعمیل پاتے۔ پس ہر بات پر انصاف سے غور کرنا چاہیے نہ تعصب سے۔"

سرسید کی ان تمام تحریروں کا جو کہ انھوں نے جہاد کے متعلق ۱۸۵۷ء سے لکھنی شروع کی تھیں اور جن کا تفسیر القرآن پر خاتمہ ہوگیا، یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بہت سے منصف مزاج انگریزوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ دینِ اسلام میں جبراً مسلمان کرنے اور کفار سے عموماً جہاد کرنے کا حکم نہیں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اواخر ۱۸۷۱ء میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے عربی داں

حاکم نے "ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ" جہاد از روئے اصول اسلام اُن لوگوں کے مقابلہ میں ہونا چاہیے جو صرف کافر ہی نہیں بلکہ تعمیل شرائط اسلام میں مزاحمت بھی کرتے ہوں۔ الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ جہاد کی شرط ضروری یہ ہے کہ حاکم کی طرف سے احکام اسلام کی تعمیل میں مسلمانوں پر جبر و تعدی یا مزاحمت ہوتی ہو...... اور جبر اور تعدی و مزاحمت جو وجوب جہاد کے لیے شرط ہے وہ بھی معاملات باہمی میں معتبر نہیں بلکہ معاملات مذہبی میں ہونی ضرور ہے...... مسلمان جو انگریزی عملداری کے ظل حمایت میں رہتے ہیں جہاد کے باب میں اُن کو شریعت نے ایسی سخت قیود کے ساتھ جکڑ رکھا ہے کہ جب تک وہ تمام شرائط نہ پائے جائیں جہاد پر اقدام نہیں کر سکتے حالانکہ انگریزی عملداری میں اُن میں سے کوئی شرط بھی پائی نہیں جاتی بلکہ فی زمانہ مسلمانوں کو وہ امن حاصل ہے۔ جو پیغمبر صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کو نجاشی نصرانی فرمانروائے ابیسینیا کی حمایت میں حاصل تھا پس جب تک اس طرح کا امن باقی ہے بغاوت کو ایک شرعی گناہ سمجھا جائے گا۔

مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جو ایک نہایت سچے اور منصف مزاج عیسائی ہیں، انھوں نے تو اپنی کتاب پریچنگ اوف اسلام میں (جو ابھی شائع ہوئی ہے) اس بحث کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے کہ قرآن کی رو سے غیر مذہب والوں کو بزور شمشیر مسلمان کرنے کا حکم ہے یا بذریعہ وعظ و نصیحت کے! اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو اس میں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ جن اسباب سے پروفیسر ممدوح کے دل میں پریچنگ اوف اسلام پر کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور اس میں کامیابی کی امید بندھی اُن میں ایک بڑا محرک سرسید کی تحریرات کا مطالعہ تھا۔

مثال ۲

معراج کے مسئلہ پر بھی سرسید نے تفسیر میں نہایت مفصل بحث کی ہے جو اُن سے پہلے کسی مفسر نے نہیں کی۔ معراج جسمانی پر جو عیسائی یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ عقل کے بالکل خلاف ہے اُس کے الزامی جواب ازالہ الاوہام وغیرہ میں عہد عتیق و عہد جدید کے حوالوں سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں، مگر یہ جوابات اُن لوگوں کے لیے کافی نہ تھے جو توریت و انجیل کو نہیں مانتے یا بالکل قید مذہب سے آزاد ہیں اس لیے ضرور تھا کہ معراج کے سوال پر محققانہ بحث کی جائے اور معراج کی حقیقت جو قرآن و حدیث سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے اُس کو ظاہر کیا جائے۔ سرسید نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر کے ۴۰ صفحہ میں نہایت بسط کے ساتھ بحث کی ہے مگر ہم اس موقعہ پر صرف اس کا لُب لباب بیان کریں گے جن کو تفصیل دیکھنی منظور ہو وہ اصل تفسیر کو ملاحظہ کریں۔

انھوں نے اُن تمام روایتوں میں سے جو معراج کے متعلق حدیث اور سیر کی کتابوں میں قلمبند کی گئی ہیں، غالباً کوئی روایت باقی نہیں چھوڑی اور چونکہ ان روایتوں میں اس قدر اختلاف ہے کہ شاید ہی کسی اور مضمون کی روایت میں ایسا اختلاف ہوگا۔ اس لیے معراج کے تمام جزئیات کے متعلق جس قدر اختلاف ہیں اُن سب کو اول جدا جدا بیان کیا ہے مثلاً اس بات میں اختلاف کہ معراج کب ہوئی؟ یا یہ کہ معراج اور اسراء (جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے) ایک واقعہ تھا یا دو جداگانہ واقعات تھے؟ یا معراج ایک دفعہ ہوئی یا دو دفعہ؟ یا معراج جسد کے ساتھ بیداری میں ہوئی یا روح کے ساتھ رؤیا میں؟ غرض

اسی کے بے شمار اختلافات جو روایات متعلقہ واقعہ معراج میں پائے جاتے ہیں اُن سب کو مع ہر ایک روایت کے بیان کیا ہے۔ پھر ان اختلافات کے اسباب اور وجوہ جو قرینِ قیاس تھے، بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ معراج اور اسرا، درحقیقت ایک ہی واقعہ تھا اور وہ ابتدا سے اخیر تک روح کے ساتھ اور خواب کی حالت میں واقع ہوا تھا اور اس دعوے پر پانچ دلیلیں لکھی ہیں جن میں سے پہلی دلیل گویا اس شبہ کا جواب ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت جس میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جانا بیان ہوا ہے اُس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو خواب میں جانے پہ دلالت کرتا ہو۔ سو اس کے جواب میں انھوں نے سورۂ یوسف کی یہ آیت کہ "اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا" اور صحیح مسلم کی چند حدیثیں پیش کی ہیں جن میں کوئی لفظ خواب پر صراحۃً دلالت نہیں کرتا حالانکہ سب کے نزدیک اُن میں خواب کا بیان ہے۔ دوسری دلیل میں سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت پیش کی ہے۔ "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" (یعنی ہم نے نہیں گردانا اُس خواب کو جو تجھے دکھلایا مگر ایک امتحان لوگوں کے لیے) قطع نظر اس کے کہ یہ آیت اُسی سورۂ بنی اسرائیل میں واقع ہوئی ہے جس میں اسراء کا ذکر ہوا ہے، صحیح بخاری سے دو حدیثیں عبد اللہ ابن عباسؓ کی نقل کی ہیں جن میں صاف صاف اس بات کی تصریح ہے کہ جس رؤیا کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہی رویا ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ الاسراء میں دکھایا گیا۔ تیسری دلیل میں بخاری اور مسلم سے مالک ابن صعصعہ اور انس ابن مالک کی روایتیں نقل کی ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ معراج کے وقت آپ سوتے تھے۔ چوتھی دلیل یہ لکھی ہے کہ منجملہ صحابہ کے معاویہؓ، حسنؓ، حذیفہؓ بن الیمان اور حضرت

عائشہ کا یہ مذہب تھا کہ معراج خواب میں واقع ہوئی ہے نہ بیداری میں
پانچویں دلیل موافق اصول علم حدیث کے یہ لکھی ہے کہ جب عقل اور نقل
میں بظاہر اختلاف پایا جائے تو نقل کے معنی اس طرح بیان کرنے چاہییں
جو عقل کے مطابق ہوں اور بڑے بڑے علما مثل امام سخاوی، ابن جوزی، ابوبکر
بن الطیب وغیرہم کے اقوال اس باب میں نقل کیے ہیں کہ حدیث کے
موضوع ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس کا مضمون عقل
یا حس و مشاہدہ کے خلاف ہو۔ اس دلیل کے ذیل میں ایک لطیف بحث
اس مضمون پر کی ہے کہ حدیثیں جو کتب احادیث میں جمع کی گئی ہیں ان کے الفاظ
بعینہٖ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ راویوں کے الفاظ ہیں
جو انھوں نے اپنی سمجھ کے موافق بیان کیے ہیں اور اس کے ثبوت میں تابعین
و تبع تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے حسن اور سفیان ثوری کا یہ قول
ہے کہ اگر ہم حدیث اسی طرح بیان کرنی چاہیں جس طرح سنی ہے تو ایک
حرف بھی نہ بیان کر سکیں۔ غرض کہ اس مطلب کو نہایت خوبی سے ثابت
کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ معراج کی حدیثوں میں جس قدر واقعات
عقل کے خلاف پائے جاتے ہیں ضرور ہے کہ ان کی تاویل عقل کے مطابق
کی جائے یہ کہ جن روایتوں سے معراج کا خواب میں ہونا پایا جاتا ہے ان کو
تاویلات بعیدہ اور رکیکہ اور دلائل فرضیہ و دوراز کار سے ایسا واقعہ بنا دیا جائے
جو حقیقت اور عقل دونوں کے خلاف ہو۔

تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ اس میں برخلاف قدیم

تفسیروں کے روایات کی طرف بغیر سخت ضرورت کے بہت ہی کم رجوع کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری قدیم تفسیریں باتفاق تمام محققین اہل اسلام کے عموماً بے سند اور موضوع و ضعیف حدیثوں اور یہودیوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں اور اس کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جس قدر روایتیں تفسیر القرآن کے متعلق صحاح میں وارد ہوئی ہیں اگر ان سب کو بعد حذف استاد کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو تمام مجموعہ معدود صفحات سے زیادہ نہ ہوگا حالانکہ کتب تفاسیر کی روایتوں اور قصوں کو اگر جمع کیا جائے تو کم سے کم ایک ضخیم جلد مرتب ہوسکتی ہے۔

اگرچہ روایات کے باب میں مفسرین کی بے احتیاطی اور عدم مبالات قدیم زمانہ میں بھی قابل الزام تھی لیکن اس زمانہ میں، جبکہ ہر مذہب پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے کی ہر شخص کو آزادی ہے اور الحاد و دہریت کا ہر طرف زور شور ہے، ایسی روایتوں اور قصوں اور سوپر نیچرل افسانوں کو تفسیروں میں درج کرنا صرف یہی نہیں کہ اسلام کو مخالفین کے اعتراضوں کا نشانا بنانا ہے بلکہ خود مسلمان نوجوانوں کو جو اس زمانہ کے علوم کی تعلیم پاتے ہیں اسلام سے بدگمان بلکہ متنفر کرتا ہے۔

چوتھی خصوصیت

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس تفسیر میں برخلاف اکثر قدیم تفسیروں کے ہر ایک آیت کی تفسیر کے متعلق تمام اقوال مختلفہ نقل کرکے ناظرین کے ذہن کو پریشان نہیں کیا گیا بلکہ جو قول راجح معلوم ہوا صرف اس کو ذکر کیا گیا ہے اور باقی مرجوح اقوال کو یا تو بالکل ذکر نہیں کیا اور یا بشرط ضرورت ہر ایک قول میں جو کمزوری یا ضعف دیکھا اس کو بھی

بیان کر دیا ہے۔ آج کل ایسی تفسیریں، جن میں قرآن کے معنی معین نہیں کیے جاتے اور ایک ایک آیت یا ایک ایک لفظ کی شرح میں متعدد احتمالات اور مختلف اقوال نقل کیے جاتے ہیں، ان لوگوں کے دل میں، جو مذہب کو موروثی چیز نہیں سمجھتے اور تقلید کی قید سے آزاد ہیں بجائے اس کے کہ مفسر کے تبحر اور احاطۂ علمی کا نقش جمائیں، ممکن ہے کہ دوسری قسم کے خیالات پیدا کریں اور جس کتاب کی نسبت خدا نے یہ فرمایا تھا کہ " لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا " اس میں بے شمار اختلافات دیکھ کر طرح طرح کے شکوک و شبہات میں پڑ جائیں پس اس وقت زمانہ کا اقتضا ہرگز یہ نہیں کہ آیات قرآنی کی تفسیر میں متعدد اقوال اور مختلف رائیں بیان کر کے ان کو اسی طرح غیر منفصل چھوڑ دیا جائے اور قرآن کے معنی معین نہ کیے جائیں۔

پانچویں خصوصیت

پانچویں سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا خصوصیت اس تفسیر کی جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے، یہ ہے کہ اسلام میں جہاں تک کہ معلوم ہے سب سے پہلی کوشش ان شبہات کو رفع کرنے کے لیے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے قرآن مجید کے بعض مضامین کی نسبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتے تھے اس تفسیر میں کی گئی ہے۔ اس باب میں جو کوشش بلیغ سرسید نے کی ہے۔ اس کا پورا پورا اندازہ بغیر اس کے کہ ان کی تفسیر کو اول سے آخر تک دیکھا جائے، کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مگر چونکہ اس میں بمقابلۂ علوم جدیدہ کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور صدہا مقامات میں جمہور مفسرین سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص اصول کے موافق بیان کیے گئے ہیں اس لیے ممکن نہیں

کہ مفسر کے بیان میں کچھ لغزشیں نہ ہوئی ہوں لیکن ایسے مستثنیات سے تمام تفسیر کی خوبی زائل نہیں ہو سکتی بلکہ انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ اگر تمام تفسیر میں ایک آیت کے معنی بھی اسلوب قرآن اور اصول عربیت کے موافق ایسے بیان کیے گئے ہوں جن کی رو سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے یقیناً رفع ہوتا ہے ہو تو گو وہ معنی تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے نہ لکھے ہوں، بلا شبہ تسلیم کرنے کے قابل ہیں۔

اگرچہ ہمارا ارادہ جیسا کہ دیباچہ میں اشارہ کیا گیا ہے اس تفسیر کی مذکورہ بالا خصوصیت پر مفصل بحث کرنے کا تھا لیکن چونکہ یہ بحث بہت طولانی ہے جس کی ایک بائیوگرافی متحمل نہیں ہو سکتی اس کے سوا عام ناظرین کو اس مضمون سے چنداں دلچسپی بھی نہیں ہوتی اس لیے جو کچھ اس کے متعلق ہم نے لکھا ہے یا آئندہ لکھیں گے اس کو کسی باوقعت میگزین کے متعدد نمبروں میں وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا۔

ریفارمیشن اور اُسکا منشا

ظاہر ہے کہ سرسید نے اپنی تصنیفات اور عام تحریروں اور پبلک اسپیچوں کے ذریعہ سے اور نیز خود مثال بن کر قوم کے پولٹکل اور سوشل خیالات اور خاصکر اُردو لٹریچر میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اور اسلئے اُن کو قوم کا پولیٹیکل، سوشل اور لٹریری ریفارمر کہا جاسکتا ہے لیکن اس مقام پر ریفارمیشن سے ہماری مراد قوم کے مذہبی خیالات کی اصلاح ہے جو فی الواقع ایک نہایت سخت دشوار کام تھا اور جس کی وجہ سے اُس قوم کے فدائی کو کافر و جاہل ملحد اور مرتد سب کچھ کہا گیا۔

اگرچہ سرسید کا اصل مقصد مسلمانوں کی پولٹکل اور سوشل حالت کا درست کرنا تھا لیکن چونکہ مسلمان اپنے مذہب کو ہمیشہ سے دین اور دنیا دونوں کا رہبر سمجھتے رہے ہیں اور کسی بات کو خواہ دینی ہو خواہ دنیوی جب تک کہ اس کا ثبوت مذہب کی رو سے نہ دیا جانے تسلیم نہیں کرتے اور نیز مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت کو بہت کچھ تعلق اُن کے مذہب کے ساتھ تھا، اس لیے سرسید کو ۱۸۵۷ء کے بعد سے اخیر دم تک برابر مذہبی مباحث میں مشغول رہنا پڑا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس طرح ہر مذہب میں جس قدر کہ بانی مذہب کا زمانہ بعید ہوتا جاتا ہے اسی قدر بہت سی باتیں جن کو اصل مذہب میں چنداں دخل نہیں ہوتا داخل ہوتی جاتی ہیں اسی طرح دین اسلام میں رفتہ رفتہ بہت سے امور ایسے شامل ہو گئے جو درحقیقت دین کی ذاتیات سے خارج تھے۔ مثلاً اصول عقائد میں صدہا مسائل ایسے داخل کر دیے گئے جن کا صدر اسلام میں کہیں پتا نہ تھا مگر اب وہی علم جس میں ان مسائل پر بحث کیجاتی ہے منجملہ علوم دینیہ کے ایک نہایت مہتم بالشان علم، موسوم بہ علم کلام سمجھا جاتا ہے۔ یا مثلاً

فروع میں بے شمار جزئیات جن کی بنیاد محض قیاس پر ہے مثل نصوص کتاب وسنت کے واجب التسلیم سمجھی جاتی ہیں۔ مفسرین کی رائیں اور ان کے اقوال جو انھوں نے آیات قرآنی کی تفسیر میں بیان کیے ہیں وہ بھی مثل آیات قرآنی کے واجب الاذعان مانے جاتے ہیں۔ اصول فقہ جو بڑھتے بڑھتے ایک وسیع علم بن گیا ہے، وہ بھی دینیات میں ایک نہایت ضروری علم شمار ہوتا ہے۔ جس قدر رطب ویابس روایتیں اور بے سروپا قصے کتب تفسیر وسلوک و سیر میں درج کیے گئے ہیں وہ سب بغیر اس کے کہ ان کو اصول تنقید کے موافق جانچا جائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں صحاح میں جو حدیثیں امت کی اصلاح معاش سے علاقہ رکھتی ہیں اور جن کی آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" وہ بھی ان حدیثوں کی طرح جو تبلیغ رسالت سے متعلق ہیں تعلیم دین میں شمار کیجاتی ہیں اس کے سوا جب متعدد فرقے اسلام میں پیدا ہو گئے تو بہت سے خیالات دور از کار اپنے اپنے مذہب کی طرفداری اور تعصب کی وجہ سے ہر مذہب کے اجزائے غیر منفک بن گئے، پھر جہاں اسلام پہنچا ان ملکوں کی اکثر رسمیں اور رواجات اور اوہام شدہ شدہ مذہب کے رنگ میں رنگے گئے اور اس طرح اسلام جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "الدین یسر" ایک دفتر بے پایاں کا نام ہو جو دائرہ حصر واحصا سے خارج ہے، قرار پا گیا اور ان تمام حشو وزوائد کا اصل دین سے جدا کرنا ایسا ہی مشکل ہو گیا جیسا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا۔ اگرچہ علم کلام علم فقہ اصول فقہ اور تفسیر مسلمانوں کے لیے سرمایۂ افتخار اور قوم کی اعلیٰ درجہ کی دماغی اور ذہنی قابلیت کے نہایت روشن ثبوت ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ دین اسلام کو ان سے بے انتہا مدد پہنچی ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دینیات میں ان کو کتاب وسنت کے برابر درجہ دیا جائے ورنہ ضرور ہے کہ عربی

صرف و نحو و معانی و بیان و لغت کو بھی دینیات میں وہی درجہ دیا جائے جو علوم مذکورۂ بالا کو دیا گیا ہے کیونکہ اسلام کو ان علوم سے بھی کچھ کم مدد نہیں پہنچی۔

اگرچہ اسلام کے ہر طبقہ اور ہر دورہ میں ایسے آزاد طبع اور روشن ضمیر لوگ ہمیشہ اٹھتے رہے ہیں جنھوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر میدان تحقیق میں قدم رکھا ہے اور بڑے بڑے مہتم بالشان مسائل کے متعلق مذہب جمہور کی غلطیاں ظاہر کی ہیں لیکن چونکہ وہ زمانہ اسلام کی حکومت اور مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا تھا اور معترضین اسلام کی زبانیں آج کل کی طرح کھلی ہوئی نہ تھیں لہذا جو ضرورتیں اسلام کو موجودہ زمانہ میں پیش آئیں ان سے وہ بزرگ بالکل بے خبر تھے۔ اس کے سوا ممالک اسلامیہ میں علمائے اسلام کو یہ آزادی نہ تھی کہ بادشاہ وقت کے مذہب کے خلاف کوئی بات بیباکانہ زبان سے نکال سکیں اس لیئے علمائے سلف میں کسی ایک شخص نے عام اصلاح کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ کسی نے احادیث کی تنقید کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور ان کے جانچنے کے قواعد مقرر کیے۔ کسی نے شرائع اور مصالح میں تفرقہ کیا اور جو حدیثیں شرائع سے متعلق تھیں ان کے لیے الگ اور جو مصالح سے متعلق تھیں ان کے لیے الگ درجہ قرار دیا۔ کسی نے تقلید کی بندشوں کو توڑا۔ کسی نے اجماع اور قیاس کے حجت ہونے سے انکار کیا۔ کسی نے آیات متشابہات میں تاویل کرنے کی راہ کھولی۔ کسی نے مفسرین و واعظین کے بے سروپا قصوں اور بے سند روایتوں کی بے اعتباری ظاہر کی۔ کسی نے آیات منسوخہ کو جن کی تعداد پانسو تک پہنچ گئی تھی بلکہ حصر و احصا سے خارج ہو گئی تھی بیس سے بھی کم میں محدود کیا۔ کسی نے متکلمین کے منطقیانہ استدلالات و توجیہات کو جو کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی نصرت و حمایت کے لیے آیات قرآنی کی تفسیر میں کرتے تھے مقصد شارع کے خلاف ثابت کیا۔ کسی نے تعمق و تشدد پر رد و قدح کی۔ کسی نے شرک و بدعت کے

استیصال پر کمر باندھی اسی طرح مختلف زمانوں میں خاص خاص خرابیوں کی اصلاح ہوتی رہی مگر عام طور پر کسی کو اس بات کے کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ خاص اسلام کی تعلیم قرآن مجید اور حدیث صحیح میں منحصر ہے باقی جو کچھ ہے وہ اسلام کی حقیقت سے خارج ہے نہ اسلام اس کا جوابدہ ہے اور نہ مسلمان اس پر اعتقاد رکھنے کے مکلف ہیں۔

سرسید نے، اگر غور کر کے دیکھا جائے، تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ جو صداقتیں اہل اسلام کی تصنیفات میں فرداً فرداً صرف ضبط تحریر میں آئی تھیں اور سا کابر علماء کے سوا اُن سے کسی کو اطلاع نہ تھی، سرسید نے اُن سب کو ایک ہی بار خاص وعام پر علی الاعلان ظاہر کر دیا، کیونکہ جو ضرورتیں اس وقت خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھیں وہ کسی خاص خرابی کی اصلاح سے رفع نہیں ہو سکتی تھیں مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان سے جا چکی تھی اور قومی تعصبات، جو بعد سلب حکومت کے مفتوح قوم کو فاتح قوم کے ساتھ ایک مدت تک ضرور باقی رہتے ہیں، مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کر رہے تھے جس سے حکمران قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور اُن کا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا، مسلمانوں سے جو بُری بات سرزد ہوئی تھی وہ اُن کے مذہب کی طرف منسوب کیجاتی تھی، فقہا کے فتوے جو مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے مانع تھے، اکثر انھیں قومی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمان اُن کو وحی منزل کی طرح دل وجان سے قبول کرتے تھے، عیسائی مشنری مسلمانوں کی سیر اور تاریخ کی کتابیں اور اُن کی تفسیریں دیکھ دیکھ کر اسلام اور بانی اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور اسلام کو اُن کا جوابدہ سمجھ کر مسلمانوں سے جواب طلب کرتے تھے تعلیم یافتہ مسلمان بہت سی باتیں مروجہ اسلام میں سائنس کے خلاف دیکھ

دیکھ کر اسلام کی خالص تعلیم سے جو کتاب و سنت میں منحصر ہے بد اعتقاد ہونے لگے تھے، اور یہ تمام حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ خالص اسلام میں اور اُن چیزوں میں جو اسلام میں مِل جل کر اُس کی ذات میں داخل ہو گئی ہیں امتیاز قائم کیا جائے اور جو مشکلات اس اختلاط اور امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔

اگرچہ سر سید نے اپنی ریفارمیشن میں اُن اصول سے جن پر قدیم محققین کی اصلاحیں مبنی تھیں، بہت ہی کم تجاوز کیا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ زمانۂ حال کی ضرورتوں کے اقتضا سے قدیم اصلاحوں میں خود بخود ایک قسم کی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خبر متواتر اور خبر مشہور کے سوا جن کی تعداد کتب احادیث میں نہایت قلیل ہے۔ جو حدیثیں خبر احاد کہلاتی ہیں اور جن سے صحاح ستہ اور تمام احادیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں مفید یقین نہیں ہیں۔ بلکہ اُن میں احتمال صدق اور کذب کا باقی ہے اور اس اصول سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خبر واحد بشرطیکہ صحت کے درجہ کو پہنچ جائے، اس پر صرف عمل کرنا واجب ہے مگر اُس پر اعتقاد رکھنا ضروری نہیں اور بعض کے نزدیک عمل اور اعتقاد دونوں ضروری نہیں سر سید نے اس نتیجہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ اُن کی یہ رائے ہے کہ جب خبر واحد میں صدق و کذب کا احتمال باقی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جس خبر واحد کی رو سے اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو خواہی نخواہی اس خبر کو تسلیم کر لیا جائے اور بعد تسلیم کر لینے کے اُس اعتراض کے جواب میں صرف اسی قدر کہنا کافی ہے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں اور اس لیے جو اعتراض اس کی رو سے وارد ہوتا ہے۔ اسلام اس کا جوابدہ نہیں ہے۔ یہ رائے صرف سر سید ہی کی نہیں بلکہ اُن سے پہلے بھی علمائے اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا۔

سبب ہے۔ امام رازی سے فرقہ حشویہ کے ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی کہ "ما کذب ابراھیم الا ثلث کذبات" (یعنی ابراہیم نے صرف تین جگہ جھوٹ بولا ہے) امام نے کہا "بہتر ہے کہ ایسی روایتیں قبول نہ کیجائیں" اس نے بطور تعجب کے کہا "اگر ہم اس روایت کو قبول نہ کریں تو راویوں کی تکذیب لازم آئیگی" امام نے کہا "اے مسکین اگر ہم قبول کر لیں تو ہم کو ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنی پڑتی ہے اور اگر اس کو نہ مانیں تو راویوں کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا ہوگا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ابراہیمؑ کو جھوٹ سے بچانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ چند مجاہیل کو جھوٹ سے بچایا جائے۔

یا مثلاً اول اول سلف صالح آیات متشابہات کی تاویل بالکل جائز نہیں سمجھتے تھے پھر جب یونانی فلسفہ کا اسلام میں رواج ہوا اور آیات متشابہات کے ظاہری معنوں پر جو کہ علمائے اسلام بیان کرتے تھے۔ ملاحدہ اور مخالفین اسلام نکتہ چینی کرنے لگے تو علما کو متشابہات کی تاویل کرنی پڑی مگر نہایت محدود آیتیں تھیں جن کے حقیقی معنوں پر اس زمانہ کے لوگ اعتراض کرتے تھے اس لیے صرف وہی آیتیں مجازی معنوں پر محمول کی گئیں۔ اب چونکہ زمانہ علم و حکمت کی ترقی کا ہے اس لیے سرسید نے تاویل کو اغلب آیتوں میں محدود نہیں رکھا بلکہ اور بہت سی آیتوں کو جیسا کہ دوسری جگہ ہم نے مفصل بیان کیا ہے مجاز و استعارہ و تمثیل پر محمول کیا ہے۔

یا مثلاً آیات منسوخہ کی تعداد پہلے پانسو سے بھی زیادہ مانی جاتی تھی، پھر جیسا شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں لکھا ہے۔ سیوطی وغیرہ نے ان کو بیس میں محصور کیا۔ پھر شاہ ولی اللہ نے نسخ کو صرف پانچ آیتوں میں محدود کر دیا۔ سرسید نے جب دیکھا کہ آیات منسوخہ کی تعداد پانسو سے گھٹتے گھٹتے

پانچ تک پہنچ گئی تو ان کو یقین ہو گیا کہ قرآن مجید میں نسخ حقیقی بالکل واقع نہیں ہوا اور قرآن کی جس آیت سے مفسرین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ قرآن کی آیتیں ایک دوسرے کی ناسخ و منسوخ ہیں اس آیت کا سیاق و سباق، جیسا کہ خطبات احمدیہ میں مفصل مذکور ہے۔ صاف دلالت کرتا ہے۔ کہ وہاں نسخ سے مراد شرائع سابقہ کا قرآن سے منسوخ کرنا ہے نہ کہ قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت کو منسوخ کرنا پس عیسائیوں کا اعتراض جو کہ وہ مسلمانوں کے مسئلہ نسخ پر کرتے ہیں، قرآن مجید پر وارد نہیں ہوتا

یا مثلاً اگلے محققین نے فروع میں تقلید شخصی کو اس بنا پر ضروری نہیں سمجھا کہ حق چاروں مذہبوں میں دائر ہے مگر سرسید جس طرح تقلید کو فروع میں ضروری نہیں سمجھتے اسی طرح اصول میں بھی نہیں سمجھتے کیونکہ جس بنا پر حق چاروں مذہبوں میں دائر سمجھا گیا ہے۔ اسی بنا پر اس کو اشاعرہ اور معتزلہ اور دیگر فرق اسلامیہ میں بھی دائر سمجھنا ضروری ہے۔ اور اسی وجہ سے انھوں نے اکثر اصولی مسائل میں معتزلہ کی پیروی کی ہے۔ اس رائے میں بھی سرسید منفرد نہیں بلکہ اگلے محققین اہل سنت نے بھی اکثر مسائل میں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کیا ہے چنانچہ اسی اختلاف کے سبب جب امام غزالی پر لے دے ہوئی تو انھوں نے ایک رسالہ موسوم بہ "تفرقہ بین الاسلام والزندقہ" لکھا جس میں اپنے مخالفوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ "وہ مذہب اشاعرہ سے الگ ہونے کو گو کہ وہ بالشت بھر ہی کیوں نہ ہو، اور اُن کے خلاف کرنے کو، گو کہ وہ ذرا سی چیز ہی میں کیوں نہ ہو، گمراہی جانتے ہیں۔" مگر چونکہ امام غزالی کے وقت میں سلطنت کی طرف سے علما کو پوری مذہبی آزادی نہ تھی اس لیے انھوں نے چند جزوی باتوں کے سوا اشاعرہ کے اصول سے اختلاف نہیں کیا۔ لیکن سرسید بلا قید جس مسئلہ میں اختلاف کی ضرورت سمجھتے ہیں اشاعرہ کے اصول سے

اختلاف کرتے ہیں۔

الغرض سرسید کی اصلاحات کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے اُن میں بہت ہی کم اصلاحیں ایسی ہوں گی جن کی اصل محققین اہل اسلام کی تصنیفات میں موجود نہ ہو البتہ اگلے محققین کی اصلاحیں اسی حد تک محدود رہیں جہاں تک کہ اس زمانہ کی حالت اور ضرورت مقتضی تھی اور سرسید کی اصلاحات میں موجودہ زمانہ کی حالت اور ضرورت کے موافق زیادہ وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

سرسید کی ریفارمیشن کا منشاء جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں، یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اسلام میں ایک نیا فرقہ قائم کریں اور خود اُس فرقہ کے سرگروہ بنیں۔ وہ جس طرح نبی کے سوا کسی امام یا مجتہد یا اور کسی اُمتی کے مقتدا بنانے کو شرک فی النبوۃ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اسی طرح خود کسی فرقے کا مذہبی پیشوا بننے کو اشتراک فی النبوۃ سمجھتے تھے چنانچہ لاہور میں جو انھوں نے اسلام پر لکچر دیا تھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "میری یہ خواہش نہیں ہے کہ کوئی شخص، گو وہ میرا کیسا ہی دوست سے دوست ہو، میرے خیالات کی پیروی کرے۔ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں، جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جس کو مذہب کہتے ہیں، وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کا ازلی مذہب خدا ابد الآباد تک قائم رکھے (اور ضرور قائم رکھے گا، کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے) ختم ہوگیا۔" پس ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ لوگ اُن کی پیروی کریں اور اُن کو اپنا مذہبی پیشوا جانیں بلکہ اُن کی ریفارمیشن کا اصل مقصد صرف مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے موانع کو دور کرنا اور عیسائی قوموں کے اعتراض کو دفع کرنا تھا کہ "اسلام ترقی اور شائستگی کے ساتھ

جمع نہیں ہو سکتا" اور چونکہ اس زمانہ میں مغربی تعلیم کے سوا کوئی ذریعہ دنیوی ترقی کا نہیں ہے اس لیے جو شبہات مغربی تعلیم سے اسلام کی نسبت پیدا ہونے ممکن تھے اُن کا رفع کرنا بھی ضرور تھا۔ پس یہی دو مقصد تھے جن کے لیے سرسید کو مذہبی مباحث میں پڑنا اور بہت سی باتوں میں جمہور سے اختلاف کرنا پڑا۔

سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم نے ایک کونسل علما اور عقلا کی اس امر کی تحقیقات کے لیے منعقد کی تھی کہ دین اسلام دنیوی ترقی کا مانع ہے یا نہیں کونسل نے اپنی تحقیقات کے بعد جو رپورٹ لکھی اس کا ماحصل یہ تھا کہ " اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں جو دنیوی ترقی کی مانع ہو مگر مسلمانوں کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں مگر حال کے زمانہ میں نہایت مضر ہو گئیں چھوڑنا ضرور ہے" ظاہر ہے کہ کونسل نے جو کچھ اسلام کی نسبت لکھا وہ[1] بالکل قرآن اور حدیث کے مطابق تھا بلکہ ہمارے نزدیک صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے کہ باوجود اُس کی سخت پابندی کے انسان دنیوی ترقی اور شائستگی کو کمال کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے بخلاف دیگر مذاہب کے جن سے دست بردار ہوئے بغیر ترقی کے میدان میں ایک قدم نہیں رکھا جا سکتا لیکن اگر کونسل سے پوچھا جاتا کہ وہ کونسی رسوم و عادات ہیں جن کے چھوڑنے کے بعد مسلمان اپنے موجودہ مذہب کے موافق ترقی کی دوڑ میں شریک ہو سکتے ہیں ؛ تو اس کا جواب دینا نہایت مشکل تھا۔ سرسید نے یہی مشکل کام اپنے ذمہ لیا تھا اور جو مشکلات ان کو اس کام میں پیش آئیں وہ عنقریب کسی قدر اختصار کے ساتھ بیان کی جائیں گی۔

---

[1] خدا تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے: "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" اور رسول خدا صلعم نے فرمایا "انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین" اور فرمایا "الدین یسر" اور ابو موسیٰ اور معاذ بن جبل کو جب یمن میں بھیجا تو یہ نصیحت کی "یسرا ولا تعسرا"۔

سرسید کی نسبت یہ اعتراض اکثر سنا گیا ہے کہ مصلح یا مجدد مذہب ایسا شخص کیونکر ہو سکتا ہے جو علوم مروجہ اسلام میں متوسط درجہ سے بھی کم درجہ رکھتا ہو۔ لیکن یہ اعتراض اُس شخص کی نسبت زیادہ موزوں ہو سکتا ہے جو علوم مروجہ اہل اسلام میں کمال حاصل کرنے کے بعد مصلح یا مجدد مذہب بننے کا دعویٰ کرے انسان جس مذہب کی سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے، اس مذہب کے ساتھ اس کو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے، پھر جب اسی مذہب کی تعلیم پاتا ہے تو وہ مدنر بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ تعلیم کمال کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ تو اس مذہب کی تقلید اور اس کا تعصب اس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور کسی بات میں خود غور اور تحقیق کرنے کی مطلق قابلیت باقی نہیں رہتی۔ اگر مثلاً حنفی مذہب کی تعلیم اُس کو ہوئی ہے تو اس کے دل میں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس مذہب میں کوئی غلطی ہوگی۔ یہ اصول بھی کہ حق چاروں مذہب میں دائر ہے محض تقلیداً مانتا ہے کیونکہ عملاً حنفی مذہب کے ایک مسئلہ میں بھی غلطی کا ہونا اس کے نزدیک محال معلوم ہوتا ہے۔ باوجودیکہ بخاری کو اصح الکتب بعد کلام اللہ جانتا ہے مگر بیسیوں حدیثیں جو اس میں صریح حنفی مذہب کے خلاف ہیں اُن کو قابل عمل نہیں سمجھتا۔ ایسا شخص بلاشبہ کسی مذہب کا مصلح یا مجدد نہیں ہو سکتا بلکہ یہ منصب اس شخص کا ہے جو حق و باطل اور خطا و صواب میں تمیز کر سکتا ہے۔ ہر ایک امر پر غور کرتا ہے۔ اور جو بات صحیح جانتا ہے پھر جب اس میں غلطی معلوم ہوتی ہے تو اسی بات کو غلط قرار دیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ غلط بات کو صحیح اور صحیح بات کو غلط سمجھ جائے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس بات کو غلط جان لے اس کو دنیا کی شرم یا اعتراض کے خوف سے صحیح کہے جائے۔ مصلح یا مجدد کو علوم مروجہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے کہ حق بات

کے کہنے میں لومتہ لائم سے نہ ڈرے کیونکہ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو صداقتیں محققین کی تحقیقات میں موجود ہیں اور تقلید نے ان کی طرف سے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، ان کو علی الاعلان ظاہر کرتا ہے۔

سرسید میں ابتدا سے وہ تمام خاصیتیں جو ایک مصلح یا مجدد یا ریفارمر میں ہونی ضروری ہیں، موجود تھیں۔ ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ حق کی تلاش میں گذرا، کبھی صوفیت کا رنگ چڑھا کبھی وہابیت کا زور شور رہا کبھی غیر مقلدی کی لے بڑھی اور آخر کو تمام جستجو اور تلاش اس نتیجہ پر آ کر ختم ہو گئی کہ الاسلام ھو الفطرۃ والفطرۃ ھو الاسلام بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید کے مذہبی خیالات میں اس قدر تبدیلیوں کا ہونا ان کے متلون مزاج ہونے کی دلیل ہے مگر یہ ان کی نادانی ہے حق بات تک ہمیشہ اسی طرح بتدریج رسائی ہوتی ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ نے پہلے ستارے کو پھر چاند کو اور پھر سورج کو اپنا رب سمجھا تب اس نتیجہ پر پہنچے کہ "انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین" محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر وہ عقبات پیش نہ آتے جو حق تک پہنچنے سے پہلے پیش آتے ہیں تو قرآن میں آپ کی نسبت یہ ارشاد نہ ہوتا کہ "وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى" جب انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ہو تو اور لوگ جو طالب حق ہیں، جب تک کچھ دنوں ادھر ادھر ڈانواں ڈول نہ پھریں کیونکر ایک ہی جست میں منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں! ہاں جو لوگ تقلید کے دائرہ سے قدم باہر رکھنا نہیں چاہتے اور جن کا یہ قول ہے کہ "اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ" ان کو کچھ دشواری نہیں ہے انھوں نے جس لیک پر اگلوں کو چلتے دیکھا ہے اسی پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔

بہرحال اگر سرسید مشرقی تعلیم کی اس حد سے آگے بڑھ جاتے جس پر ان کی تعلیم آ کر ٹھہر گئی تو تقلید کے پھندے سے تا زیست ان کا چھٹکارا ہونا دشوار

تھا۔ پس علوم وجبہ کی تکمیل بجائے اس کے کہ اُن کے کام میں کچھ مدد دیتی، وہ تمام قدرتی قابلیتیں جو اُن کی طبیعت میں رکھی گئی تھیں بالکل فنا کر دیتی اور جس دلیری اور آزادی سے انھوں نے ریفارمیشن کا کام انجام دیا اس کا حوصلہ اُن میں مطلقاً باقی نہ رہتا۔

وہ ایک خط میں جو انھوں نے ۱۲۸۹ھ میں سید مہدی علی خاں کو لکھا تھا لکھتے ہیں "میرے پیارے مہدی! میں ہمیشہ آپ کو کہا کرتا ہوں کہ جو خراب اثر مشرقی طریقۂ تعلیم کا انسان کے دل اور طبیعت پر ہوتا ہے اُس سے آپ کبھی ایمن نہ رہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ نبیٔ آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُمّی محض رکھنے میں کیا حکمت تھی؟ یہی حکمت تھی کہ نیچرل فیض جو اندرونی چشموں کا جاری رہتا ہے، اُس کو کوئی بیرونی چیز مزاحم نہ ہو اور جو کچھ باہر نکلے خالص بے میل ہو۔ پس ہمیشہ نیچر کے سرچشمہ کے جاری رہنے پر متوجہ رہا کریں اور جس علم کی نسبت کہا گیا ہے کہ "العلم حجاب الاکبر" اس کے پیرو ہرگز نہ ہو دیں۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو شخص مذہبی خیالات کی اصلاح کا دعویٰ کرے اس میں مذہبی تقدس جو علمائے دین کا شعار ہے، ضرور ہونا چاہیے۔ پس سر سید جیسا دنیادار آدمی جو نماز روزہ تک کا پابند نہ ہو اس منصب جلیل کے کیونکر لائق ہو سکتا ہے؟ سو اس اعتراض کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکے کہ مذہبی تقدس جو ہمارے علمائے دین کا شعار ہے۔ اگر سر سید کو یہ درجۂ عالی حاصل ہو جاتا تو مسلمانوں کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کرنے کی اُن کو فرصت ملنی دشوار تھی، کیونکہ اُن کی تمام عمر کسی مسلمان فرقہ کا رد لکھنے اور کسی کو کافر اور کسی کو فاسق بنانے اور طبقات دوزخ کے تقسیم کرنے میں گذر جاتی اور اگر بالفرض اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا سچا جوش بھی اُن کے دل میں ہوتا تو بھی وہ اس قابل نہ ہوتے کہ اسلام کی

کچھ حمایت کر سکیں، یا مسلمانوں کے مصائب کا کچھ تدارک کر سکیں۔ یعنی اس بات کا سمجھنا اُن کی طاقت سے باہر ہوتا کہ اسلام اور اہل اسلام کو کن مشکلات کا سامنا ہے اور ان مشکلات کا کیونکر مقابلہ ہو سکتا ہے! کیونکہ مذہبی تقدس کی پہلی شرط یہ ہے کہ دنیا اور اہل دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر ہوں۔

بات یہ ہے کہ مذہبی تقدس اور مشائخ و علماء کی زمرے میں رہنا اور زہاد و عباد کیسی زندگی بسر کرنا اُن لوگوں کے لیے ضرور ہے جو مذہبی پیشوا کہلاتے ہیں جیسے واعظین جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں یا مشائخ و اہل اللہ جو تزکیہ نفس و تصفیہ باطن کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ خود اُن صفات کا عمدہ نمونہ نہ بنیں جو اوروں میں پیدا کرنی چاہتے ہیں تو اُن سے لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا، برخلاف اس شخص کے جو محض قوم کی اصلاح معاش کا ارادہ رکھتا ہوں اُن کو تنزل کے گڑھے سے نکالنا اور ان کے تنزل کے اسباب اور ترقی کے موانع دریافت کرنے چاہتا ہوں، حکمران قوم کو جو اُس کے ہم مذہبوں کی نسبت غلط فہمی ہو اُس کو رفع کرنا چاہتا ہو، علمی دنیا میں جو خیالات مذہب کی نسبت پھیل رہے ہوں اُن سے آگاہی حاصل کرنے کی فکر میں ہو، ایسا شخص جب تک گوشۂ عزلت سے نکل کر دنیا کے بیچوں بیچ زندگی بسر نہ کرے اور عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اُس کے نشیب و فراز اور گرم و سرد کی آزمائش میں نہ گزارے اور حاکم و محکوم دونوں کے خیالات سے واقف نہ ہو وہ کیونکر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے!

یہی سبب ہے کہ ہمارے مقدس علما، جو دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے سبب دُنیا کے حالات سے بے خبر ہیں، اُن کی تحریریں جو اس آزادی اور نکتہ چینی کے زمانہ میں انھوں نے مذہب کے متعلق لکھی ہیں یا لکھتے ہیں، وہ بجائے

اس کے کہ غیر قوموں کے دل میں اسلام کی نسبت حسن ظن پیدا کریں الٹی دین کے مضحکہ کا باعث ہوتی ہے۔ پس اس زمانہ میں مذہبی مصلح جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح معاش اور اسلام کی حقیقت دنیا پر ظاہر کرنا ہو، اس شخص کے سوا جو دنیا داری کے بازار میں زندگی بسر کرے اور دنیا کے حالات سے باخبر ہو دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ایک مصلح مذہب میں اس مشہور مقولہ کے موافق کہ "اُنظُر الی ما قال و لا تنظر الی من قال" مقتضائے عقل یہ ہے کہ بجائے افعال کے زیادہ تر اس کے اقوال کو دیکھا جائے مع ذالک ہم سرسید کے افعال اور اخلاق و عادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشائخ و اہل اللہ میں نہیں دیکھی گئیں اور جن کو ہم آگے چل کے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ بلاشبہ وہ آخر عمر میں بسبب فربہی مفرط اور کبر سن کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے لیکن اپنے قصور کا اعتراف کرتے تھے جس کی نسبت کہا گیا ہے۔ "الاعتراف یھدم الاقتراف" حج اور زکوٰۃ کی ان میں کبھی استطاعت نہیں ہوئی اور قرض روپیہ لے کر جس طرح کہ انھوں نے لندن کا سفر کیا اس طرح سفر حج کرنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ بیسیوں عیب، جو بڑے بڑے دینداروں اور پرہیزگاروں میں دیکھے گئے ہیں ان سے یہ شخص بالکل پاک تھا، اور امت کی خیر خواہی جس میں مخبر صادق نے تمام دین کو حصر کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ "اَلدِّینُ النَّصِیحَۃُ" اس میں تمام قوم سے سبقت لے گیا تھا۔ اس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کے لیے زہد و تقدس کی نہیں بلکہ عقل اور راستبازی کی ضرورت تھی جس کی نسبت عمر فاروق نے فرمایا ہے کہ "لَا تَنظُرُوا اِلٰی صَلٰوۃِ امرءٍ وَلَا صِیَامِہٖ وَلٰکِن انظُرُوا اِلٰی عَقلِہٖ وَصِدقِہٖ" (یعنی کسی کے نماز روزہ پر نظر نہ کرو بلکہ اس کی عقل اور سچائی کو دیکھو)۔

مذہبی مسائل میں علمائے سلف سے اختلاف

سرسید نے جن مسائل میں علمائے سلف سے اختلاف کیا ہے وہ دو قسم کے مسائل ہیں ایک وہ جن میں جمہور علمائے اہل سنت ان کے خلاف ہیں مگر محققین اہلِ اسلام میں سے اور لوگ بھی اُس طرف گئے ہیں دوسرے وہ جن میں سرسید بظاہر متفرد معلوم ہوتے ہیں اور یہ دوسری قسم کے اختلافات زیادہ تر قرآن کی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہیں۔

دونوں قسم کے مذکورۂ بالا اختلاف کا منشا، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ ہرگز نہ تھا کہ سرسید کوئی نیا فرقہ قائم کرنا اور خود اس فرقہ کا سرگروہ بننا چاہتے تھے، بلکہ یہ تمام اختلافات محض اس بات پر مبنی تھے کہ آج کل جو اعتراضات اسلام پر مخالفین اسلام کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں، یا جو شکوک و شبہات تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں اُن کو رفع کیا جائے اسی لیے ہم اُن تمام اختلافات کو اس عنوان کے ذیل میں درج کرنا چاہتے ہیں مگر جن دلائل پر یہ اختلافات مبنی ہیں اُن کو سرسید کی تصنیفات میں دیکھنا چاہیے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر مسئلۂ مختلف فیہ کی نسبت جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہی صحیح ہے اور ہر ایک اختلاف میں انھیں کی رائے صائب ہے لیکن چونکہ انھوں نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی ہے اس لیے جو لوگ دین اسلام کے دوست ہیں اور اس کو ہر قسم کے

اعتراضات اور شکوک و شبہات سے پاک جانتے ہیں اُن سے اُمید ہے کہ سرسید کے مندرجہ ذیل اختلافات کو صرف اس نظر سے کہ وہ جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں ناقابل التفات نہ سمجھیں گے بلکہ ہر ایک اختلاف پر جو دلائل سرسید نے قائم کیے ہیں اُن پر نہایت بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ غور کریں گے۔ اُن کا فرض ہے کہ ہر ایک مسئلہ مختلف فیہ کے متعلق اول اس بات پر غور کریں کہ جس اعتراض یا شبہ کے رفع کرنے کی غرض سے انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ فی الواقع اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس کو رفع کیا جائے دوسرے یہ کہ جمہور سے اختلاف کیے بغیر وہ اعتراض یا شبہ رفع ہو سکتا ہے یا نہیں؛ تیسرے جس طریقے سے سرسید نے اس کو رفع کرنا چاہا ہے اُس طریقے سے اس کا رفع ہونا ممکن ہے یا نہیں؛ اُمید ہے کہ اگر ان تینوں باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا تو اسلام کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے۔

اس وقت تمام علمی دنیا میں مذہب کی صداقت کا معیار یہ امر قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصول تمدن کے برخلاف ہو وہ مذہب سچا نہیں ہو سکتا۔ اس معیار نے جو نتائج مذاہب کے حق میں پیدا کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام قومیں جو علمی اور تمدنی ترقی کی طرف متوجہ ہوئی ہیں وہ سب رفتہ رفتہ مذہب سے دست بردار ہوتی جاتی ہیں۔ عیسائیوں نے بائبل کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا اور فی الواقع اگر وہ بائبل کے احکام یا نصیحتوں پر کاربند ہوتے تو ترقی کے میدان میں اُن کا قدم رکھنا ناممکن تھا، برہم سماج والوں نے ویدوں میں سے فقط ڈھائی اپنچھر پرہم کے لیے ہیں اور باقی کو بالکل خیر باد کہہ دیا ہے۔ آریہ سماج والے ویدوں کا جو مطلب بیان کرتے ہیں اُس کو نہ سناتن دھرم کے ہندو تسلیم کرتے ہیں اور نہ یورپ کے بڑے بڑے سنسکرت داں اور وید کے محقق

صحیح جانتے ہیں، پس درحقیقت انھوں نے بھی ویدسے اپنے تئیں آزاد کرایا ہے۔
سرسید کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا میں جتنی کتابیں آج الہامی مانی جاتی ہیں اُن میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نہ کوئی چیز حقائق موجودات کے خلاف ہے اور نہ تمدن اور حسن معاشرت کی مانع۔ پس مسلمان عالموں کا اس بات پر غور کرنا کہ جو کچھ سرسید نے اسلام کی غرض سے لکھا ہے اُس کی اس زمانہ میں فی الواقع ضرورت تھی یا نہیں اور اگر تھی یا نہیں اور اگر تھی تو سید کی تحریرات سے وہ ضرورت رفع ہوتی ہے یا نہیں ؛ کچھ ضروری نہیں ہے۔

اب ہم اُن اختلافات کا خلاصہ لکھتے ہیں جن میں دیگر محققین اہل اسلام بھی سرسید کے ساتھ شریک ہیں :

۱- اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔

۲- قیاس حجت شرعی نہیں ہے۔

۳- تقلید واجب نہیں ہے۔

۴- قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کہ مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا قرآن کی کسی آیت کا ناسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اُس کی بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے۔

۵- قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا، وہ جس طرح اور جس قدر نازل ہوا تھا اسی قدر زمانۂ نزول سے آج تک محفوظ ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا ناوارد ہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع و مفتری ہیں۔

۶۔ صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو جب تک کہ اصولِ علم حدیث کے موافق ان کی جانچ نہ کی جائے قابلِ وثوق نہیں سمجھنا چاہیئے۔

۷۔ شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان میں جو نفس امارہ یا قوت بہیمیہ ہے وہ مراد ہے۔

۸۔ طیور منخنقہ جن کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو ان کا کھانا حلال ہے۔

۹۔ چونکہ خبرِ واحد میں احتمال صدق و کذب باقی رہتا ہے اس لیے جو اعتراض اخبار آحاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں اسلام ان کا جوابدہ نہیں ہے۔

۱۰۔ سوا ان کفار و مشرکین کے جن کا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہوں کہ "انما ینھاکم[1] اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم" تمام کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کو نا جائز ہے۔

۱۱۔ عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں میں تحریف لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریف معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ ان کا اول سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلّم ہے

۱۲۔ ہر شخص ان مسائل میں جو قرآن یا حدیث صحیح میں منصوص نہیں ہیں آپ اپنا

---

[1] یعنی خدا تم کو منع نہیں کرتا مگر ان لوگوں کی دوستی سے جو تم سے دین کی بابت لڑتے اور جنھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے پر اوروں کی مدد کی ۱۲۔

مجتہد ہے۔

۱۳۔ حضرت ہاجرہ جو اسمٰعیلؑ کی ماں ہیں وہ جیساکہ بعض روایتوں میں مذکور ہے، درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رقیُون بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں اور رقیون نے اُن کو صرف تربیت کے لیے حضرت سارا کے ساتھ کر دیا تھا۔

۱۴۔ وضع ولباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبّہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔

۱۵۔ قرآن کی کسی آیت سے جبر یا قدر کسی سے قدر پر استدلال کرنا جیساکہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے مقصد شارع کے برخلاف ہے کیونکہ جن آیتوں سے اس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے ان آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسئلہ مذکور کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضبناک ہو کر یہ نہ فرماتے کہ "اَبِهٰذا اُمِرْتُمْ اَمْ بِهٰذا اُرْسِلْتُ"

۱۶۔ معراج اور شق صدر دونوں رؤیا میں واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں کیا مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک اور کیا مسجد اقصیٰ سے آسمانوں تک۔

۱۷۔ اگرچہ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوقات موجود ہے اسی طرح اس سے بالاتر مخلوقات جس کا ہم کو علم نہیں، موجود ہو لیکن ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں ان سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے۔ بلکہ خدا تعالےٰ نے جو مختلف قُوٰی اپنی قدرت کاملہ سے مادّے میں ودیعت کیے ہیں، جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوت جذب ودفع وامثال ذالک، انھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۸۔ آدمؑ اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی

خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات اور قوت بہیمیہ جو اُس میں ودیعت کی گئی ہے اس کی برائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔

۱۹- معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔

۲۰- قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے

۲۱- آیۃ "الذین اٰتینٰھم الکتٰب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے وہ، جیسا کہ عام مفسرین لکھتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد نہیں ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے۔ تحویل قبلہ کے معاملہ کی طرف پھرتی ہے۔ جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کیا گیا ہے۔

۲۲- آیۂ میراث سے وصیت کا حکم، جو آیۂ وصیت میں والدین اور دیگر ورثہ کے لیے تھا، منسوخ نہیں ہوا، پس جو وصیت وارث کے حق میں کیا جائے وہ نافذ ہے

۲۳- جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیۂ "وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین" کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر علماء فدیہ کی اجازت کو خاصکر معمر لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، مگر سرسید کے نزدیک یہ حکم عموماً اُن سب لوگوں کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو خواہ بڈھے ہوں اور خواہ جوان لیکن بہ نسبت فدیہ دینے کے اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے۔

۲۴- جس ربا یعنی سود کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اس سے اسی قسم کا ربا مراد ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سود خواروں اور مہاجنوں میں، جن کا پیشہ سود خواری ہے، پائی جاتی ہے۔ مگر

اس سے اُس منافع کی حرمت جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے ثابت نہیں، ہوتی اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیے روپیہ قرض لے اُس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا کسی رفاہ عام کے کام کے لیے چندہ جمع کرے، اس روپیہ کا سود میں لگانا اور اس کے منافع سے رفاہ عام کے کام کرنا یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے۔

۲۵- قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰؑ کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہو۔

۲۶- شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ اُن کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اس لیے اُن کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابل تقلید چھوڑنا مراد ہے، نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں۔

۲۷- صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگھے یا سنکھ یا تُرہی وقرنا کے مراد نہیں ہے بلکہ یہ محض استعارہ ہے کہ جس طرح تُرہی کی آواز پر لشکر جمع ہو جاتے ہیں اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے بعث و حشر واقع ہوگا۔

۲۸- خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و افعال متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے۔ جیسے بعث و نشر حساب و کتاب، میزان صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ۔ وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر

۲۹- قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے۔ اس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ خدا تعالےٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے

کے بعد ساتویں دن آرام لیا۔ اور اسی لیے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلق زمین و آسمان کی نسبت تھا اس کو قرآن میں اُسی طرح بیان کر کے فرمایا "وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ" کیونکہ شارع کا مقصد حقائق اشیا سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں ان پر رد و قدح کرنا نہیں ہے، بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہ نشین ہوں اُن کا زائل کرنا ہے۔

۴۰۔ قرآن میں جا بجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بد اخلاقیاں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلہ سے، کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی عذاب سے اور کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ در حقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک حادثے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب واقع ہوتے ہیں اور انبیا کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں اگر وہ خیالات مقاصد نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُن کی تائید کرنے والے ہیں تو وہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ انھیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں۔

۴۱۔ خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں نہ ان ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے نہ دل کی آنکھوں سے۔

۴۲۔ قرآن مجید میں جو جنگ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے اس سے ان لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا

۴۳۔ صفات باری تعالیٰ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات اور نہ لا عین و لا غیر

جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے۔

۳۴۔ حضرت عیسیٰؑ کا بن باپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا۔

۳۵۔ کوئی امر عادتِ الٰہی یا قانون طبیعی کے خلاف کبھی وقوع میں نہیں آتا۔

۳۶۔ قرآن میں جو کفار سے بطور معاوضہ کے کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب کے من عند اللہ ہونے میں شک ہو تو اُس کی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ، اس سے جیسا کہ اکثر اہل اسلام خیال کرتے ہیں یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صحرا نشین، بدوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لیے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو، بنا لینا تمہاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔

۳۷۔ نبوت کاملہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "النبی نبیٌّ ولو کان فی بطن اُمّہ" وہ ماں کے پیٹ سے نبی پیدا ہوتا ہے اور جس طرح تمام ملکات اور قوائے فطری بتدریج ترقی کرتے ہیں اسی طرح ملکۂ نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اُس کا مقتضا ہوتا ہے اور جس کو عرف عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں، اسی لیے جو وحی اُس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایلچی یا قاصد (یعنی فرشتہ) کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اُسی کے دل سے اٹھتی ہے اور اُسی پر گرتی ہے۔

۳۸۔ قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں اور اُن میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے۔

ہیں وغیرہ وغیرہ ثابت نہیں ہوتا
۳۹- انبیائے بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں اُن میں جس قدر باتیں بظاہر قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں وہ سب درحقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرین اہل اسلام نے یہودیوں کی پیروی سے اُن کے معنی ایسے بیان کیے ہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہیں۔
۴۰- طوفان نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا بلکہ اُسی قوم اور اُسی ملک میں محدود تھا جس پر حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے تھے۔
۴۱- حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت حضرت سارا کی عمر اُس حد کو نہیں پہنچی تھی جبکہ عادۃً اولاد کا ہونا غیر ممکن ہے۔

اگر سرسید کی تصنیفات کو بالاستیعاب اول سے آخر تک دیکھا جائے تو غالباً مذکورہ بالا مسائل کے سوا اور مسائل میں بھی بہت سے اختلافات نکلیں گے مگر یہ سب اختلافات ایسے ہیں جن میں سرسید متفرد نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسئلہ میں کم یا زیادہ وہ لوگ اکابر علمائے اسلام میں سے سرسید کے ساتھ متفق الرائے ہیں جیسے امام غزالی، امام رازی، امام الحرمین، قاضی ابن رشد، شیخ اکبر، شاہ ولی اللہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی کو ان سب بزرگواروں کے نام اور اُن کے اقوال دیکھنے ہوں تو سرسید کی تصنیفات میں اور مولوی سید مہدی علیخاں کے مضامین میں جو زیادہ تر تہذیب الاخلاق کی سب سے پہلی جلدوں میں اور کسی قدر اخیر زمانہ کی جلدوں میں شایع ہوئے ہیں، دیکھ لے۔ اُن میں وہ لوگ بھی ہیں جو معجزہ کو دلیل نبوت نہیں سمجھتے، خرق عادت کا واقع ہونا محال سمجھتے ہیں، قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزہ کا ذکر ہونا تسلیم نہیں کرتے، آیات قرآنی جو بظاہر انبیائے بنی اسرائیل کے معجزات پر دلالت کرتی ہیں اُن کو ماؤل سمجھتے ہیں، عیسٰی

کا بن باپ کے پیدا ہونا تسلیم نہیں کرتے، ملائکہ سے توائے عالم اور شیطان سے انسان کی قوت بہیمیہ و سبعیہ مراد لیتے ہیں جن کے وجود سے، جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ انکار کرتے ہیں۔ نبی پر متعارف فرشتوں کی وساطت سے وحی کا آنا تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن کو محض باعتبار فصاحت و بلاغت کے معجز نہیں مانتے۔ شہدا کو درحقیقت زندہ اور کھاتے پیتے نہیں سمجھتے، مبدأ و معاد کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اُس کو مجازی معنوں پر محمول کرتے ہیں، طیور منخنقہ اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے حلال جانتے ہیں۔ قرآن میں نسخ کے قائل نہیں ہیں۔ غرض کہ جس قدر سرسید کے اختلافات ہم نے اوپر بیان کیے ہیں اُن میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے۔ جس میں کچھ نہ کچھ لوگ محققین اہل اسلام میں سے سرسید کے ہمزبان نہ ہوں ہاں چند اختلاف سرسید نے علمائے سلف سے ایسے بھی کیے ہیں جن میں ظاہرا وہ متفرد معلوم ہوتے ہیں لیکن یقیناً نہیں کہا جاسکتا کہ سلف میں سے کوئی اس طرف نہیں گیا اور وہ اختلاف یہ ہیں۔

۱۔ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے اور آیۂ من و فدا جو سورۂ محمد میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔

۲۔ دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے "الدعا ھو العبادۃ" پس دعا کے مستجاب ہونے سے اس مطلب کا جس کے لیے دعا کیجاتی ہے حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں

۳۔ آیت یا آیات یا بینات کے الفاظ جو قرآن مجید میں جا بجا آئے ہیں، اُن سے وہ احکام یا مواعظ و نصائح مراد ہیں جو خدا تعالیٰ نے بذریعۂ وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں، نہ کہ معجزات جیسا کہ عموماً علمائے اسلام نے بیان کیا ہے۔

۴- حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُن کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا، یہ دونوں قول غلط ہیں۔ بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لیے قرآن میں مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کے الفاظ واقع ہوئے ہیں جس سے یہ مراد ہے کہ موت مصلوب کرنے سے مقصود تھی وہ واقع نہیں ہوئی۔

۵- اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت کر سکیگا تو اُس کو ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۶- سارق کے لیے قطع ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو فقہا اُس کو مال مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد مرتبوں پر سارق کو صرف قید کی سزا دیجاتی۔

۷- قرآن میں جن اور جنّہ کے الفاظ سے چھپے ہوئے یا پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو دیو اور بھوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے۔

۸- سورۂ فیل (الم ترکیف) میں جن الفاظ سے اصحاب فیل پر ابابیل کا کنکریاں پھینکنا مراد لیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرض چیچک سے استعارہ ہے جس کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرض چیچک عرب میں اسی سال نمودار ہوا ہے جبکہ ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔

۹- حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور تمام انبیائے سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلاف قانون فطرت معلوم ہوتے ہیں، جیسے ید بیضا، عصا کا اژدہا بنجانا، فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلی کا ہونا، گوسالۂ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، من وسلوے کا اترنا، یا عیسیٰؑ کا گہوارہ میں بولنا، خلق طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول

وغیرہ وغیرہ ، اُن کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا۔

۱۰۔ قرآن مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے ایک ....
مقصود اور دوسرا غیر مقصود۔ پس جو کلام غیر مقصود ہے۔ اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا مثلاً کفار کے رحمت الٰہی سے محروم ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ " لاتفتح لھم ابواب السماء " چونکہ اصل مقصود ان کے حرمان کا بیان ہے اور اُس کو اس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اس سے اس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں استدلال نہ ہو سکے گا۔

۱۱۔ شریعت اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں ایک اصلی اور دوسرے محافظ احکام اصلی۔ جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکام اصلی ہیں جن میں حکم ایسا نہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہو، اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں، پس اُن کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانون فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توجہ الی اللہ ہے باقی جس قدر احکام اس سے متعلق ہیں مثل وضو اور قیام و قعود و رکوع و سجود اور استقبال قبلہ وغیرہ یہ سب اس کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجا لانا ضروری ہے۔

فارمیشن کی مخالفت

اگرچہ مذہب کے متعلق رائے ظاہر کرنے کی موجودہ گورنمنٹ کی طرف سے آزادی تھی پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اول تو مذہبی خیالات ایسی چیزیں ہیں کہ جس طرح اُن کا یقین کسی دلیل سے پیدا نہیں ہوتا اسی طرح وہ کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہوتا۔ اس کے سوا اسلامی سلطنتوں میں اگرچہ غیر قوموں کے مذہب سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا مگر خود مسلمانوں کو مذہبی آزادی جیسی کہ چاہیے، کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ جس ملک میں جو فرقہ برسرِ حکومت ہوا اُس ملک میں ہمیشہ اُسی فرقہ کے مذہب نے رواج پایا، باقی تمام فرقے مضمحل و متلاشی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آزادیِ رائے بالکل معدوم ہو گئی اور تعلید کی بدترین غلامی تمام قوم کا شعار بن گئی۔ پس ایک ایسی آواز جس سے کبھی کسی کے کان آشنا نہ ہوئے تھے اُس کو مسلمان کیونکر بغیر نفرت اور کراہت کے سن سکتے تھے۔ دوسرے آزادیِ رائے ایک ایسی چیز ہے کہ جب دفعتہً کسی غیر تربیت یافتہ قوم کو حاصل ہوتی ہے تو اختلافِ آرا جو آزادی کو لازم ہے اُس قوم میں ہمیشہ مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے آزادی اُن کو اختلاف کرنا سکھا دیتی ہے۔ مگر بسبب تربیت یافتہ نہ ہونے کے وہ اختلاف اور مخالفت میں کچھ فرق نہیں کر سکتے، وہ جس رائے سے اختلاف کرتے ہیں اُن کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ یا اُس کو توڑ دیں یا خود ٹوٹ جائیں۔ مسلمانوں نے چونکہ انگریزی سلطنت میں آزادی کا نیا

نیا سبق پڑھا ہے اس لیے جو بات ان کی رائے یا عقیدے کے خلاف یا ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اُس سے ہمیشہ ایسا اختلاف کرتے ہیں جو آخر کو منجر بہ مخالفت ہو جاتا ہے۔

ایک اور عام سبب مخالفت کا خاصکر مسلمانوں میں قومی تنزل ہے جس کے سبب سے ہمیشہ گری ہوئی قوموں میں خود غرضی بعض حسد جہالت وغیرہ خود بخود بڑھ جاتے ہیں لوگ عموماً لڑائی جھگڑے مول خریدنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مخالف پارٹیاں قائم ہو جاتی ہیں یہ ایسی مخالفت ہے کہ اگر سرسید ریفارمیشن کا کام اختیار نہ کرتے اور مذہبی امور میں ایک حرف بھی جمہور کے خلاف زبان سے نہ نکالتے بلکہ عام انگریزی اسکولوں کے نمونہ پر ایک مدرسہ قائم کر دیتے تو بھی مخالفت سے ہرگز نہ بچ سکتے تھے جب ندوۃ العلما جو خاصکر دینی تعلیم اور دینی اغراض کے لیے اکثر علمائے اسلام کے اتفاق سے قائم ہوئی ہے۔ مخالفت سے نہ بچی تو اور کسی کو اس سے بچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو کوئی اسلامی انجمن کوئی اسلامی مدرسہ اور کوئی مسلمانوں کی عام بھلائی کا کام آج کل ایسا نہیں کیا جاتا جس کی مخالفت نہ ہوتی ہو، پس سرسید کو مخالفت سے کسی طرح مفر نہ تھا۔

اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات کی نسبت اسی وقت بدگمانی شروع ہو گئی تھی جب کہ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز ترک کر دیا تھا، مگر جب کہ انھوں نے "تبیین الکلام" کی پہلی جلد شایع کی تو اس بدگمانی کو زیادہ ترقی ہوئی، سید مہدی علیخاں جو آخر کو سرسید کی ریفارمیشن کے سب سے بڑھ کر مدد گار ہوئے، اُن کو تبیین الکلام کا دیباچہ دیکھ کر ایسا جوش آیا کہ باوجود جان پہچان نہ ہونے کے اُسی جوش و خروش میں انھوں نے سرسید کے دیباچۂ مذکور کے

برخلاف ایک طول طویل خط لکھ کر بھیجا۔ سرسید نے نہایت نرم الفاظ میں یہ جواب لکھا کہ اب تقلید کا زمانہ نہیں رہا بلکہ عقل و ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔ اس کے بعد جب سرسید کے پاس علیگڑھ جانا ہوا اور ان کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں دل میں خدشہ تو تھا ہی، یہ سمجھے کہ جدھر سرسید نماز پڑھ رہے ہیں یہ قبلہ کا رخ نہیں ہے جب وہ نماز پڑھ چکے تو اپنا شبہ ظاہر کیا۔ سرسید نے یہ آیت پڑھی۔ "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" جب اس پر خوب بحث ہو چکی تو سرسید نے کہا میں نے اس کوٹھی کو ٹھیک قبلہ رُخ بنایا ہے پھر کمپاس لگا کر اُن کو اپنے کہنے کا یقین دلایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سرسید کی سچائی کا نقش اُن کے دل میں بیٹھا۔

جب سرسید نے غازیپور میں مدرسہ قائم کیا اگرچہ وہاں مسلمانوں کی طرف سے کچھ مخالفت نہیں ہوئی مگر پادریوں نے سخت مزاحمت کی اور مسٹر سپٹ جج غازیپور اور کرنل گریہم ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے سوا ضلع کے تمام افسر پادریوں کے طرفدار ہو گئے مگر آخر کار سرسید کامیاب ہوئے اور مدرسہ قائم ہو گیا۔

جب وہ غازیپور سے بدل کر علیگڑھ میں آئے اور سائنٹفک سوسائٹی اور اس کا پریس بھی جو اس وقت تک سرسید کا پرائیویٹ چھاپہ خانہ تھا اُن کے ساتھ علیگڑھ میں منتقل ہو گیا اور سوسائٹی کا مکان بھی تیار ہو گیا اب سوسائٹی نے باقاعدہ اپنا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے الفنسٹن ہسٹری آف انڈیا کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہونے لگا اور اس کے اجزا چھپ چھپ کر ممبروں کو تقسیم ہونے لگے۔ مصنف نے مسلمانوں کی سلطنت ہند کا حال شروع کرنے سے پہلے جہاں اسلام کا آغاز اور عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا وہاں آپ کی نسبت (معاذاً باللہ) پیغمبر باطل کا لفظ

لکھا تھا اُردو میں بھی اُس کا اسی طرح ترجمہ بے کم و کاست کیا گیا۔ مگر سرسید نے جارج سیل کے ترجمہ قرآن اور اس کے دیباچہ سے اور کرنل کینیڈی کی کتاب سے اور نیز تاریخ طبری سے چند مقام جن سے مصنف کے قول کی تردید ہو سکتی تھی فٹ نوٹ میں نقل کر دیے تھے مگر اُن نوٹوں سے مسلمانوں کی ناراضی کم نہیں ہوئی۔ جب یہ حصہ چھپ کر ممبروں کے پاس پہنچا تو مولوی سمیع اللہ خاں نے اس امر پر کہ پیغمبر کے لفظ کیساتھ باطل کیوں ترجمہ کیا گیا۔ سخت مخالفت کی اور ایک تحریر جس میں (بقول سرسید کے) اُن کے کفر و ارتداد پر اسی لفظ کے ترجمہ ہونے سے استدلال کیا گیا تھا، اخباروں میں شایع کرائی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو شخص سوسائٹی میں شریک ہو وہ کافر ہے چنانچہ اکثر مسلمان بزرگوں نے سوسائٹی کی ممبری سے استعفا دے دیا۔

اگرچہ ممکن تھا کہ ترجمہ میں باطل کا لفظ نہ لکھا جاتا مگر سرسید کا مقصد مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا تھا کہ عیسائی اسلام اور بانی اسلام کی نسبت کیا خیالات رکھتے ہیں اور اب اپنے مذہب کے طعنوں سے کان بند کر لینے کا وقت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ غیر قومیں جو کچھ اسلام کے برخلاف کہتی ہیں اُس سے اطلاع حاصل کیجائے اور اُن کی غلط فہمیوں کو رفع کیا جائے یا اُن کے تعصبات کی قلعی کھولی جائے۔ اخیر دم تک اُن کی یہی رائے رہی کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ مسلمان مخالفوں کے اعتراضوں اور طعنوں اور بدزبانیوں سے بے خبر رہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں میں جو ایک نیٹو کرسچن نے ایک سخت کتاب موسوم بہ امہات المومنین چھاپ کر مسلمانوں کو مفت تقسیم کی تھی اکثر ذی علم مسلمانوں نے ناگواری کے سبب اُس کو فوراً جلا دیا لیکن سرسید نے اُس کی جلد بندھا کر اُس کو اول سے آخر تک دیکھا اور فوراً اُس

کا جواب لکھنا شروع کیا جس کو مرض الموت نے افسوس ہے کہ ختم نہ ہونے دیا۔

پھر لت دن جانے سے پہلے جب انھوں نے ایک رسالہ احکام طعام اہل کتاب پر لکھ کر شایع کیا تو عموماً ان کو کرسٹان کا خطاب دیا گیا اور جا بجا اس کے چرچے ہونے لگے جب ولایت کے سفر میں چند روز باقی رہ گئے تو انھوں نے اس خیال سے کہ انگریزی طریقہ پر کھانا کھانے سے بخوبی واقفیت ہو جائے، یہ معمول باندھ لیا تھا کہ مسٹر سماتیہ جو بنارس میں ایک سوداگر تھے اور سرسید کی کوٹھی سے ان کی کوٹھی ملی ہوئی تھی ایک دن شام کا کھانا یہ اُن کے گھر پر جا کر کھاتے تھے اور ایک دن وہ اُن کے گھر پر آکر کھاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ " اتفاق سے انھیں دنوں میں مولوی سید مہدی علیخاں مرزا پور سے بنارس میں مجھ سے ملنے کو آئے رات کا وقت تھا اور میرے ہاں کھانے کی باری تھی۔ ہم دونوں میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مہدی علی آ پہنچے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ مولوی مہدی علی نے ایک مسلمان کو اس طرح ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا تھا، سخت نفرت ہوئی اور باوجود میرے ہاں مہمان ہونے کے کھانا نہ کھایا اور کہا کہ میں کھا چکا ہوں۔ صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس وجہ سے کھانا نہیں کھایا میں نے کہا کہ اگر آپ کو یہ طریقہ ناپسند ہو تو دوسرا بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے سوچا کہ شرعاً تو ممنوع نہیں ہے صرف عادت کے خلاف دیکھنے سے نفرت ہوئی ہے آخر قبول کر لیا اور سب سے پہلی دفعہ دن کا کھانا میرے ساتھ میز پر کھایا۔ دن تو اس طرح گذر گیا مگر رات کو یہ مشکل پیش آئی کہ رات کا کھانا مسٹر سماتیہ کے ہاں تھا میں نے اُن سے پوچھا کہ اگر آپ کو وہاں کھانے میں تامل ہو تو یہاں انتظام کیا جائے انھوں نے پھر اسی خیال سے کہ شرعاً ممنوع نہیں، اقرار کر لیا کہ میں بھی وہیں کھاؤں گا چنانچہ

رات کو وہیں کھانا کھایا پھر ایک آدھ روز بعد مرزا پور واپس چلے گئے۔ الٰہ آباد میں ان کے ایک دوست کو یہ معلوم ہوگیا انھوں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا یہ خبر سچ ہے؛ مولوی مہدی علی نے سارا حال مفصل لکھ بھیجا انھوں نے وہ خط بجنسہ ہمارے ایک نامہربان دوست کے پاس جو اٹاوہ میں رونق افروز تھے۔ بھیجدیا انھوں نے تمام شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ مہدی علی کرسٹان ہوگئے مولوی صاحب کے گھر کے پاس ہی ایک پنیٹھ لگا کرتی تھی ہمارے شفیق نامہربان نے اس گنوارہ دل میں جاکر خط کا مضمون ایک ایک آدمی کو سنایا اور تمام پنیٹھ میں مناری کردی کہ بھائیو! افسوس ہے مولوی مہدی علی کرسٹان ہوگئے، جو سنتا تھا۔ افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا خدا سید احمد خاں پر لعنت کرے۔"

اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر حلال خور نے کمانا، سقے نے پانی بھرنا، اور سب گھے بندھوں نے آنا جانا چھوڑ دیا کہ گھر والوں نے اُن کو لکھا کہ تمہاری بدولت ہم پر سخت تکلیف گذر رہی ہے تم جلدی آؤ اور اس تکلیف کو رفع کرو۔ انھوں نے ایک طول طویل خط انھیں بزرگ کو جنھوں نے یہ افواہ اڑائی تھی حلت طعام اہل کتاب کے باب میں لکھا اور پھر خود اٹاوہ میں آئے اور سب کو سمجھایا کہ میں کرسٹان نہیں ہوں جیسا پہلے مسلمان تھا ویسا ہی اب ہوں غرض بڑی مشکل سے لوگوں کا شبہ رفع کیا۔

جب سرسید لندن جانے لگے کسی نے یہ مشہور کیا کہ مکہ کے بدلے لندن کے حج کو جاتے ہیں اور کسی نے کہا کہ لندن جاکر ٹکسالی کرسٹان ہوکر آئیں گے۔ غرض جو جس کے دل میں آیا سو کہا مگر سرسید نے جو کچھ دل میں ٹھان لیا تھا اس پر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور تاریخ معین پر بسم اللہ مجریھا ومرسٰھا کہہ کر جہاز میں سوار ہو لندن روانہ ہوگئے۔ راہ میں وہ دریائی سفر کے حالات اور جہاز کے واقعات لکھ کر وقتاً فوقتاً سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کو بھیجتے جاتے تھے، اسی

کے ضمن میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ "جہازمیں باورچی اور جانور ذبح یا صاف کرنے والا انگریز ہے، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ جو بڑے جانور ہیں اور جن میں خون زیادہ ہے، جیسے بھیڑ، بکری، مینڈھا وغیرہ، اُس کو تو وہ ہمیشہ گردن کی شہ رگ میں آر پار چھری مار کر ذبح کرتے ہیں کیونکہ اُن کے ہاں بھی دم مسفوح ناجائز یا حرام ہے یا اُس کے اخراج کا رواج ہے اور پرندوں کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ پرندوں میں مثل چوپاؤں کے دم مسفوح نہیں ہے اور اُن کی مثال دریائی جانوروں جیسی ہے۔ پس اُن کا ذبیحہ صرف اُن کا مار ڈالنا ہے اس لیے پرندوں کو ذبح نہیں کرتے بلکہ توڑ کر مار ڈالتے ہیں" چونکہ اہل کتاب کا ذبیحہ مطلقاً جس طرح کہ وہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے موافق کھانا جائز ہے اس لیے سرسید نے لکھا تھا۔ کہ "میں نے اور میرے ساتھیوں نے اُن دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت مٹن اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھائے۔ والحمد للہ الذی جعل دیننا یسرا واعسر الصلوۃ والسلام علی صاحب الشریعۃ السہلۃ الحقہ اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے تمام ترک اور مصر و شام کے مسلمان جو عیسائی قوموں کے جہازوں میں سفر کرتے ہیں وہ بھی عموماً اسی طرح عیسائیوں کے ساتھ انھیں کے باورچیوں کے ہاتھ کا صاف یا ذبح کیا ہوا اور انھیں کے ہاتھ کا پکایا ہوا بے تکلف کھاتے ہیں۔

جب یہ خبر ہندوستان میں پہنچی تو مخالفین کو ایک اور ہتھیار سرسید پر ہاتھ صاف کرنے کو ملا عیسائیوں کے ہاتھ کی گردن مروڑی مرغی کھانے کو انھوں نے سید کے کافر ہونے کا نہایت بڑا ثبوت قرار دیا کیونکہ قرآن مجید کی رو سے منخنقہ حرام ہے۔ پس جس شخص نے قرآن کے حکم سے انحراف کیا اُس کے کافر اور مرتد ہونے میں کیا کلام ہے؟

پھر لندن سے جو تحریر سر سید کی آئی تھی اور سوسائٹی کے اخبار میں چھپتی تھی اُس پر عام اخباروں میں برابر اعتراضوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ ان کی ایک تحریر میں یہ فقرہ تھا کہ "ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ تربیت و شائستگی میں وہ نسبت رکھتے ہیں جو ایک وحشی بدصورت ایک لائق اور خوبصورت آدمی کے ساتھ رکھتا ہے" اس پر مدت تک اخباروں کے کالم سیاہ ہوتے رہے اور عام مجلسوں میں بہت دن تک اس کا چرچا رہا چنانچہ انھیں دنوں میں ایک جلسہ کی کیفیت جو بتقریب دعوت صاحبزادہ عبید اللہ خاں فیروز جنگ مولوی سید مہدی علی خاں کے مکان پر منعقد ہوا تھا اور جس میں صاحبزادۂ موصوف اور مولوی صاحب اور دیگر شرکائے جلسہ کے درمیان خوب مباحثہ ہوا تھا، سوسائٹی کے اخبار میں مفصل چھپی تھی۔

جب یہ تمام نکتہ چینی سے بھرے ہوئے اخبار سر سید کے پاس لندن میں پہنچے تو انھوں نے ایک مضمون جس کا عنوان "عذر از طرف گنہگار سید احمد" تھا سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجا جس میں اول تمام وطن کے نکتہ چینوں کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انھوں نے میرے عیبوں سے مجھے آگاہ کیا اور آخر میں اہل وطن سے مخاطب ہو کر لکھا تھا کہ "وہ دن آنے والا ہے کہ تم میرے ان لفظوں کو جنھیں اب گالیاں سمجھتے ہو سر اہیاں سمجھوگے...... اے یاران وطن ع

"رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت   صلح کیجیے بس لڑائی ہو چکی"

شکوہ و شکایت ہو چکے بس اب گلے مل لیجیے اور اپنے ملک کی بھلائی پر متوجہ ہو جیئے اپنے ملک کے بچوں کی تربیت کا بندوبست کیجیے اور جو جو الزام ہمارے ملک پر ہیں اُن کو مٹائیے دنیا میں اپنے ملک کو تربیت یافتہ اور شائستہ کر کے دکھلائیے اور جلنے والوں کو انگار کیجیے۔

جب اس پر بھی اہل وطن کی مخالفت کم نہ ہوئی اور اخباروں میں برابر مخالفانہ مضامین چھپتے رہے تو انھوں نے ایک تحریر جس کا عنوان "عرضداشت بخدمت اہل وطن" تھا، سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس کی ابتدائی سطروں سے کسی قدر اُس مخالفت کا اندازہ ہوتا ہے جو اُس وقت تک ہندوستان کے مختلف اطراف سے ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کام اور کوشش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "پس جو میرا گناہ ہے وہ بجز اپنے ہموطنوں کی عموماً اور اسلام کی خصوصاً خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے نیست یارانِ طریقت غیر ازیں تقصیر ما..... اگرچہ میری اس دلسوزی کو میرے ہموطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ اُلٹا سمجھا اور کوئی الزام اور عیب اور برائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی کہ علانیہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی ہو، مگر چونکہ میری دلسوزی اپنے ہموطنوں سے یا ہم قوموں سے کسی صلہ کی توقع پر نہ تھی بلکہ اس کا اجر خدا سے لینا ہے اس لیے میرے ہموطنوں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی، مجھ کو ناگوار نہیں گذری اور خدا نے مجھ کو اپنے ارادہ پر مستحکم رکھا۔ نہ پرانے دوستوں کی باتیں بری معلوم ہوتی ہیں، نہ نئے شفیقوں کی تشنیع رنج دیتی ہے۔ نہ کانپور کی مہیب آواز سے رنج ہوتا ہے، نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے، نہ الٰہ آباد اور آگرہ کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں، نہ مرادآباد اور رامپور کے فتوے اور دہلی کے اہل جبہ و خانقاہ حاجیان حرمین شریفین کی گفتار و رفتار دل کو دکھاتی ہے۔ عام جہلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی والحمد للہ علی ذالک"

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے جو بڑے بڑے منصوبے باندھے تھے اُن پر خاص کر مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفتوں کے ہونے کا اُن کو کامل یقین تھا اور ولایت سے وہ اُن مخالفتوں کے جھیلنے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔

وہ ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو اخبار شعلۂ طور کانپور کی مخالفانہ تحریر کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں "جو مضمون کہ اس میں لکھا گیا آپ نے پڑھا ہو گا اور امید ہے کہ اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اگرچہ ایسی باتوں سے کبھی دل کو ملال ہوتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے مگر فی الفور رفع ہو جاتا ہے۔ اور دل کو صرف دو خیالوں سے تسلی ہوتی ہے۔ اول تو اس خیال سے کہ آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں ہوا جس کے مقابل میں کوئی نہ کوئی مخالف نہ کھڑا ہوا ہو آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ عیسیٰؑ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے اربعہؓ، محی الدین جیلانیؒ مجدد الف ثانیؒ محمد اسمٰعیل دہلوی، و علیٰ ہذا القیاس۔ پس میں تو اُن کی جوتیوں کی برابر بھی نہیں ہوں، میری مخالفت پر کمر باندھنی کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ دوسرے اس خیال سے کہ میں دیکھتا ہوں جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے ووں ووں نیکی بڑھتی گئی ہے، پس اگر میرا کاروبار و میری نیت سچی اور نیک ہے تو انشاء اللہ تعالےٰ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا اور اگر وہ نیک نہیں ہے اور میں غلطی سے اس کو نیک خیال کر رہا ہوں تو بلاشبہ ٹوٹ جائے گا اور مخالف جو اس صورت میں ضروری ہے کہ نیکی پر ہونگے کامیاب ہونگے اور ایسی حالت میں مجھکو بھی اُن کی کامیابی پر خوشی کرنی ہوگی، نہ اپنی تدابیر کے ٹوٹنے اور اپنے دھوکے میں پڑے ہونے کا رنج"

اس خط اور نیز اُن کے دیگر خطوط سے، جو ولایت سے اُنھوں نے مولوی صاحب ممدوح کو لکھے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اپنی سچائی پر اور اس کی وجہ سے اپنی کامیابی پر پورا پورا بھروسا تھا اور لوگوں کی مخالفت کی اُن کو مطلق پروا نہ تھی۔ ایک خط میں خطبات احمدیہ کی نسبت مولوی مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں "بعد چھاپے کے چند نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا تا دانم کہ مخدومم چہ میگوید؟

خدایا مخدوم مہدی اگر مرا کافر و مرتد داند باک نیست زیرا کہ ایں معاملہ مرا بآنست نہ با مخدوم من مہدی. لیکن محبت من از دو محبت او از من کم مگردان او خدا وانندۂ رازہائے پوشیدہ در دلِ سینہا تو میدانی کہ من با تو و با دین حقہ اسلام دادہ تو چہ میکنم و چہ اعتقاد دارم؛ پس اگر مرا محبوب من مہدی لا مذہب یا کافر گوید یا سمیع اللہ و امداد العلی مرتد داند مرا چہ باک؛ تو بر من مہربان باش ؟

الغرض جب سر سید لندن سے واپس آئے اور الہ آباد میں پہنچے تو اُن کو معلوم ہوا کہ اضلاع شمال مغرب اور دہلی میں اس مضمون کے خطوط اور اشتہار جاری ہوئے ہیں کہ کوئی سید احمد خاں سے نہ ملے اور نہ اُن کے ساتھ کھانا کھاوے اور جو ایسا کرے گا وہ دائرۂ اسلام اور جماعت اہل اسلام سے خارج ہو جائے گا ہم نے سنا ہے کہ اسی مضمون کا ایک خط نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم رئیس لوہارو کے پاس بھی جو سر سید کے بڑے گاڑھے دوست تھے، دہلی میں پہنچا تھا۔ انھوں نے خط پڑھ کر کہا کہ "خدا مارے یا چھوڑے سید احمد کافر ہو یا مسلمان، مجھ سے تو نہ ہو سکے گا کہ میں سید احمد خاں سے نہ ملوں اور ان کے ساتھ کھانے اور کھلانے سے پرہیز کروں۔" سر سید کی زبانی معلوم ہوا کہ ولایت سے آنے کے بعد بہت دن تک اکثر لوگ اُن کے ساتھ کھانے سے پرہیز کرتے رہے مگر رفتہ رفتہ بیمار اچھے ہونے لگے، پرہیز ٹوٹتا گیا یہاں تک کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ کھانا، جیسا کہ ظاہر ہے اب ایک عام بات ہو گئی ہے۔ وہی لوگ جو میز اور کرسی اور چھری کانٹے کے نام سے بدکتے تھے اب انگریزوں کو اپنے گھر بلا کر اور خود اُن کے ہاں جا کر اسی طریقہ سے اُن کے ساتھ کھانا کھانا فخر سمجھتے ہیں اور کوئی شخص اُن کو کرسٹان نہیں جانتا۔

لیکن مذکورہ بالا مخالفتوں کو بمقابلہ اُس طوفان عظیم کے، جو آگے چل کر اٹھنے

والا تھا، محض ایک چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک سمجھنا چاہیے۔ جونہی سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور کالج کے قائم کرنے کے لیے کوشش شروع کی، مخالفت کی گھٹا چاروں طرف سے امنڈ گھمنڈ کر اُٹھی۔

مدرستہ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رعب ہونے کے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جج گورکھپور اگرچہ یہ دونوں صاحب مذہبی عقاید و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا، باوجود اس کے مدرستہ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہمزبان اور متفق الکلمہ تھے، یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع انھیں دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔ اگر ان کی مخالفت کا باعث مذہبی جوش اور حمیت اسلامی ہوتی تو اُن کا کام نہایت تعریف کے لائق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام مخالفتوں کی طرح اُن کی مخالفت بھی محض ذاتیات پر مبنی تھی جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ ایک اور وجہ اُن کی مخالفت کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرستہ العلوم کے سخت مخالف تھے اور اُن میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا اس لیے سرسید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ اُن کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا تھا۔

پھر بہت سے دیسی اخباروں نے جب دیکھا کہ سرسید سے بہت سے مسلمان عموماً بدگمان اور متنفر ہوتے جاتے ہیں تو انھوں نے اپنے اخباروں کی گرم بازاری اسی میں دیکھی کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی پرچہ ایسا نہ نکلے جس میں

سرسید اور ان کے اعوان و انصار پر اعتراضوں کی بوچھاڑ نہ ہو. بعض مولوی جو زمانہ کے انقلاب سے نہایت کس مپرسی حالت میں تھے انھوں نے سرسید کی عام مخالفت سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہا کہ اُن کی تصنیفات کا رد لکھنے پر کمر باندھی اور فی الواقع اس سے اُن کو بہت بڑی کامیابی ہوئی اُن کی کتابیں تمام ہندوستان میں شایع ہوگئیں اور کئی کئی بار اُن کے چھپنے کی نوبت آئی۔

الغرض سرسید کے خیالات اور اُن کی تحریرات کے برخلاف مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے. رسالہ طعام اہل کتاب کی رد میں مولوی امداد العلی نے امداد الاحتساب لکھی، مولوی محمد علی نے مزیل الاوہام نام ایک رسالہ شایع کیا، تہذیب الاخلاق کے توڑ پر خاص خاص اخبار اور رسالے جاری ہوئے. کانپور سے نور الآفاق اور نور الانوار اور مراد آباد سے لوح محفوظ نکلا. آگرہ سے تیرھویں صدی شایع ہوا، اور امداد الآفاق، شہاب ثاقب اور تائید الاسلام وغیرہ اضلاع شمال مغرب سے اور اشاعۃ السنہ پنجاب سے شائع ہوئے سرسید کو ملحد، لامذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، کافر، دجّال اور کیا کیا خطاب دیئے گئے اُن کے کفر کے فتووں پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہریں اور دستخط کرائے گئے یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے اُن کی بھی تکفیر ہونے لگی، سرسید کے نام گالی اور دشنام کے بھرے ہوئے گمنام خط چاروں طرف سے آنے لگے اور ان گمنام خطوں کا سلسلہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے کم و بیش اخیر تک جاری رہا. سرسید نے ان نالائق خطوں میں سے ایک آدھ خط راقم کو بھی دکھایا ہے اور ایک خط جب کہ منشی سراج الدین احمد سرسید کی لائف لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے سرسید کے پاس آیا تھا اور اُن کے پاس سرسید نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ اُس کو نہایت جلی حرفوں میں

میری لائف میں درج کر دیا چنانچہ وہ خط منشی صاحب کے مسودات میں ہم کو دستیاب ہُوا ہے جس میں اول سے آخر تک نہایت مغلظ گالیاں جو رذیل سے رذیل آدمی کی زبان پر بھی نہیں آ سکتیں، بھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ وہ خط بجنسہٖ ان کی لائف میں درج کیا جائے مگر ہماری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اس ملعون تحریر کو سرسید کی لائف میں نقل کر کے قوم کی نالائقی تمام دنیا پر ظاہر کریں۔

چونکہ سرسید کے مخالفوں کی عام تحریریں اور رسالے اور کتابیں اور میگزین اور اخبار زیادہ تر کذب و افترا اور تہمت و بہتان اور معاندانہ کج بحثیوں سے بھرے ہوتے تھے اس لیے سرسید جہاں تک ہو سکتا تھا کسی کا جواب نہیں دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی جواب دینے سے منع کرتے تھے مگر اول اول جبکہ مخالفوں نے سرسید اور ان کے بعض دوستوں کی نسبت غلط افواہیں اڑانی شروع کیں اور لوگوں نے سرسید کو مجبور کیا کہ بالتوان باتوں کا جواب دیجیے ورنہ سمجھا جائے گا کہ آپ کی نسبت مخالفوں کے الزامات سب صحیح ہیں اور نیز ان تحریروں سے چندے کے رک جانے کا بھی اندیشہ تھا اس لیے کبھی کبھی سرسید اور مولوی سید مہدی علی نے تہذیب الاخلاق میں ان کے جواب لکھنے پر قلم اٹھایا ہے۔ ازانجملہ سرسید کا مضمون "واقع البہتان" اور سید مہدی علی کا مضمون "تکفیر مسلمان" اور "سوال و جواب" خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے لائق ہے۔

"واقع البہتان"، سرسید کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے مولوی علی بخش خاں مرحوم سب آرڈینیٹ جج گورکھپور کی کتاب تائید الاسلام کے جواب میں لکھا تھا اس مضمون کو سرسید نے ذیل کے فقرہ پر ختم کیا ہے:

"جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کیے ہیں؛ ظاہرا اسکا سبب ...... یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ

رسالہ لکھا ہے قریب اُسی زمانہ کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کرلیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہی ہوجاویں گے جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بدپرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہوگئے ہوں اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کیے ہیں جب تک میں ہی نہ معاف کروں، معاف نہیں ہوسکتے پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ حج دیگر کا احرام باندھیے اور گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہوجائے گا۔"

ایک اور مضمون سرسید نے انھیں مخالفتوں کے ہجوم کے زمانہ میں لکھا تھا جس کا عنوان "حال خود و یاران خود" ہے۔ یہ مضمون بھی نہایت لطیف اور دلچسپ ہے۔ جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

"ہمارے اور ہماری قوم کے حال پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی   جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

پرانے دل بعضے تو ہم کو بُرا کہتے کہتے ٹھنڈے ہوگئے ہیں اور بعضے نئے دل جوش پر ہیں اور ہم کو بُرا کہنے پر نہایت تیز زبان مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے۔ ہم کو وہی جوش محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے اُن کی دین و دنیا کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کی دن رات فکر ہے، ان کے غصہ سے ہم کو رنج نہیں، اُن کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے۔۔۔ ہم کو پچھلوں کے حالات سے اور خود

اپنے دادا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بالکل تسلی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمر باندھی ہے اور اپنی قوم کی بہتری و بہبودی میں کوشش کی ہے اُن کو دنیا کے ہاتھ سے اور بالتخصیص اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا ملا؛ کوئی سولی دیا گیا، کوئی آرہ سے چیرا گیا، کوئی جلاوطن کیا گیا۔ پس ہم کو جو اپنی قوم کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تھا اُس کا کروڑواں حصہ بھی ابھی نہیں ہوا۔ ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم نے ہم سے کیا کیا؛ کچھ نہیں کیا، بہت کیا تو یہ کیا کہ دو چار خط گمنام دشنام کے لکھ بھیجے، ہم نے شکر کیا کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگڑا اور اُن کا دل ٹھنڈا ہوگیا۔ اس سے زیادہ کسی کو غصہ آیا اور کوئی اخبار نویس بھی اتفاق سے اُن کا دوست ہوا یا دو پتھر اور ایک کاٹھ کی کل اُن کے ہاتھ میں ہوئی تو انھوں نے اپنے دل کے غصہ کو جھوٹ سچ باتیں چھاپ کر یا چھپوا کر ٹھنڈا کیا ہم تو اس پر بھی راضی ہیں، مگر اُس دن کا ہم کو افسوس ہے جب کہ وہ لوگ خود اپنی باتوں پر افسوس کریں گے اور سمجھیں گے جو سمجھینگے۔

ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرالزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کیے ہیں، کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اُس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں ہمارے جدامجد ابراہیمؑ اپنے باپ آزر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لا

مذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں، کیونکہ ہم اُن کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

مگر طرفہ یہ ہے کہ ہم کو کرسٹان بھی کہتے ہیں اور ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپا کہ ہم عیسائی ہوگئے اور ایک گرجا میں جاکر بپتسما یعنی اصطباغ لیا۔ ہم کو اپنی قوم کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہوگیا ہے کہ علانیہ جھوٹ بولتے اور جھوٹ چھاپتے ہیں کچھ شرم و غیرت وحیا نہیں آتی۔ قومی ہمدردی جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے، خدا نے ہماری قوم کے دل سے کیسی مٹادی ہے۔ اُس شخص کو یہ بھی غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان شخص کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹ بات چھاپے دوں۔ ان باتوں سے ہم کو بہ لحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوتا۔ مگر جو رنج و غم اور افسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خفگی ہے جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہیں۔ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔

مولوی امداد العلی نے جو تین استفتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیجکر سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کیے تھے ان میں سے ایک استفتا اس مضمون کا تھا کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقاید اور اقوال و افعال ہوں وہ مسلمان ہے یا نہیں؛ اور دوسرا اس مضمون کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہتا ہے اس میں چندہ دینا اور اس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے یا نہیں؛ اور تیسرا اسی تاریخ ہندوستان کے ترجمہ کرانے کی بابت تھا جس میں مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اپنے عقیدہ کے موافق سخت اور نا ملائم الفاظ لکھے تھے۔ یہ تمام

فتوے اور استفتے مولوی امداد العلی نے اپنے ایک رسالہ کے آخر میں جس کا نام " امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب پرچہ تہذیب الاخلاق " ہے چھاپ کر اُس رسالہ کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا تھا۔ اس کی ایک جلد ہماری نظر سے بھی گذری ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں کیا سُنی کیا شیعہ، کیا مقلد کیا غیر مقلد، کیا وہابی کیا بدعتی سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاصکر سُنی مولویوں میں سے اکثر نے بہت شرح اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔ ازانجملہ دلی اور لکھنؤ کے دو سب سے بڑے عالموں کے جواب میں سے کچھ کچھ فقرے بطور نمونہ کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

مولوی کریم اللہ صاحب مرحوم دہلوی لکھتے ہیں " درسنوح ایں سانحہ ایمان ربوا ایں وقوع ایں واقعہ ہوش ربا وظہور ایں معائنہ فجیعت افزاد حدوث ایں حادثہ الحاد افشا کے تعمیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرنی ایسے طلبہ کی اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور سہم پایہ ہونا اُس خوش عقیدہ کے کہ جس کا حال بدمآل اس سوال میں مذکور ہے۔ بالکل باطل، اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہے۔ اعوذ باللہ من الحور بعد الکور بلکہ بالکل باطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم، اور ایسے بے عمل میں ساعی ہونا ہیمہ اور حطب بننا لازم ..... الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان اور مال کی اور للہ سمجھنا اپنے ال کا خیال خام ہے - بانی نے یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں، پس مرد دیندار بلکہ تمام سُنی و شیعی و خارجی و سائر

ہنود و تمامی سکنائے اہل زمین پر واجب او متحتم ہے کہ ایسے کلام واہی اور ایسے عقیدہ واہی پر عقیدہ اپنا نہ جماویں بلکہ ہر فرد ہر مذہب کا اس شخص کو ہادم بنائے اپنے مذہب کا بوجھے اور اس امر لوچ پر دل نہاد نہ ہووے ۔ اور اپنے دل میں اس کا انجام سوچے کہ کیا جال بچھایا ہے ۔"

مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی، جو علمائے فرنگی میں نہایت نام آور رہ تھے ۔ مقفے عبارت میں تحریر فرماتے ہیں " وجود شیطان اور اجنہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اس کا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں اور وجود آسمان منصوص قرآنی ہے منکر اس کا بتلائے وسواس شیطانی ہے ۔ حرمت مختنقہ طیور منصوص کلام رب غفور ہے ، اور سلف سے ناخلف اتفاق اس پہ ماثور ہے ، انکار اس کا موجب گمراہی و فجور ہے ۔ مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے ، ہر متشرع اور متدین کو اس کے قبول سے ابا ہے .... ہر مسلمان کو حق جل شانہ اتباع شریعت محمدیہ پر قائم رکھے ، اور مذہب نیچر اور مشرب بدتر سے محفوظ رکھے جو شخص کہ اعتقادات اس کے فاسدہ ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں وہ شخص مخرب دین ابلیس لعین کے وسوسہ سے صورت اسلام اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدید مدرسہ جدید افساد شریعت اس کی منظور نظر ہے ۔ جو چیزیں کہ اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں ۔ فالحذر الحذر یا ایہا المسلمون والہرب الہرب یا ایہا المومنون "

ان تمام فتووں کا جواب اور جن عقائد و اقوال پر سرسید کی تکفیر کی گئی ہے ۔ ان کا ثبوت محققین اہل اسلام کی تصنیفات اور ان کے کلام سے مولوی سید مہدی علیخاں نے ان دو مضمونوں میں جو " تکفیر مسلماناں " اور " سوال و جواب " کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں اسی زمانہ میں چھپے تھے اور نیز دیگر مضامین

میں لوجہ استیفا دیا ہے اور سرسید کی تصنیفات میں بھی اُن کے جوابات متفرق طور پر مل سکتے ہیں اس لیے اُن تمام استفتاؤں اور فتووں اور اُن کے جوابات کا اس مقام پر نقل کرنا کچھ ضرور نہیں ہے مگر سرسید کے دو ایک لطیفے جو مخالفوں کی نسبت تحریر کی رو میں اُن کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لطیفہ: جس زمانہ میں سرسید ولایت میں تھے اُن کے پاس اخبار شعلۂ طور کانپور میں مولوی سید امداد العلی کا ایک مضمون سرسید کے خلاف چھپا ہوا پہنچا تھا، اُس میں تاریخ الفنسٹن کا وہی ترجمہ جس پر آخر کار سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لکھا گیا بعینہٖ نقل کر کے صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے"۔ سرسید ولایت سے ایک خط میں مولوی مہدی علیخاں کو لکھتے ہیں "دیکھو دشمنی آدمی کو ایسا اندھا کر دیتی ہے اُسی اخبار شعلہ طور، میں تاریخ ہندوستان کے مضمون کو نقل کر کے بشدومد لکھا ہے کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے۔ حالانکہ خود بھی اُسی عبارت کو لکھتے ہیں، پھر مجھ میں اور اُن میں کیا فرق ہے؛ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور انھوں نے اُردو سے"۔

یہ صرا لطیفہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس فتوے کے موافق جو مفتی سعد اللہ صاحب نے اسی ترجمہ کی بابت سرسید کی نسبت دیا ہے، مولوی امداد العلی بھی تکفیر کے مستحق ٹھہرتے ہیں، کیونکہ مفتی صاحب اپنے فتوے کی تائید میں شفائے قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ "ایک شخص نے امام مالک سے پوچھا کہ اُس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے؛ امام مالک نے حکم دیا کہ ان الفاظ کا بولنے والا کافر ہے اُس کو قتل کر ڈالو۔ اُس نے کہا حضرت میں نے تو

دوسرے شخص کا قول نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہم نے تو تجھی سے سُنا ہے۔"

لطیفہ پھر جب کہ سر سید ولایت سے واپس آگئے اور تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا اُس وقت مولوی امداد العلی نے سر سید کے پاس ایک اپنا رسالہ چھپا ہوا بھیجا جس میں اسی فتوے کی دھمکی دی گئی تھی اور لکھا تھا کہ "مفتی سعد اللہ صاحب[1] کا فتوے تکفیر میں جناب احمد خاں کی، جو ترجمۂ تاریخ پہ مرتب ہوا ہے، راقم کے پاس موجود ہے بمعلوم نہیں کہ سید احمد خاں کے حواریین اُس فتوے پہ بھی ایمان رکھتے ہیں یا نہیں" سر سید تہذیب الاخلاق میں اسی دھمکی کی نسبت لکھتے ہیں "پہلے تو ہم گھبرائے کہ یہ مفتی سعد اللہ صاحب کون ہیں؛ یہ وہی ہیں جن کو ہم نے دلّی میں دیکھا ہے؛ اور یہ وہی مفتی سعد اللہ صاحب ہیں جنھوں نے لکھنؤ میں ایک نیک بخت مسلمان آل رسول ابن علی اولاد نبی کے کفر اور قتل کا فتویٰ دے کر عشرۂ محرم میں اُن کا سر ہنومان گڑھی سے نیزہ پر چڑھا کر لکھنؤ میں لانا چاہا، تو ہمارا

---

[1] مفتی سعد اللہ صاحب ہندوستان کے ایک مشہور عالم تھے جن کا قدیم وطن مرادآباد تھا جس زمانہ میں سر سید کی آمد و رفت مفتی صدرالدین خاں مرحوم دہلوی کے مکان پہ بہت زیادہ تھی غالباً اسی زمانہ میں مفتی سعد اللہ صاحب بطور طالب علموں کے دلّی میں وارد تھے اور مفتی صدرالدین خاں سے پڑھتے تھے جب یہ تمام علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں جب کہ غالباً امجد علی شاہ زندہ تھے اُن کو مذہب اہل سنت کے افتا کا معزز عہدہ مل گیا تھا اور اُس وقت سے واجد علی شاہ کے اخیر زمانہ تک یہ اسی عہدہ پر مامور رہے اسی زمانہ میں وہاں ایک بہت بڑا واقعہ مولوی سید امیر علی صاحب کے قتل کا گزرا تھا۔ ہنومان گڑھی میں ہندوؤں نے ایک مسجد ڈھا کر مندر بنانا چاہا تھا اور اہل دربار کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا تھا سید امیر علی کچھ جمعیت لے کر وہاں ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کو پہنچے چونکہ سید امیر علی سنی المذہب تھے اس لیے نائب نے مفتی سعد اللہ سے اس کو بات کا فتوے لکھوا لیا کہ فوج بھیج کر سید امیر علی کو اس ارادہ سے روکا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو اُن کو قتل اور اُن کی جمعیت کو پراگندہ کر دیا جائے چنانچہ سید امیر علی شہید کیے گئے ۱۲۔

دل ٹھنڈا ہو گیا اور سمجھے کہ آل رسول کے قتل و کفر پر فتوے دینا اُن کا قدیمی پیشہ ہے۔

اگرچہ مولوی امداد العلی کی کوشش سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کرنے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی تھی، دلی، رام پور، امروہہ، مراد آباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے ساٹھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتووں پر مہریں اور دستخط کیے تھے، گویا ہندوستان کے تمام اہل حل و عقد کا اس حکم پر اجماع ہو گیا تھا، صرف خدا کی طرف سے اس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خاں نے یہ کمی پوری کر دی، انھوں نے غالباً اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ معظمہ میں جا کر مذاہب اربعہ کے مفتیوں کے سامنے دو استفتے عربی زبان میں پیش کیے جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے:"

"آپ کیا فرماتے ہیں اُس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجود خارجی سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس سے مراد قوت بہیمیہ ہے جو نفس انسان میں ہے اور ملائکہ کا سجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اُس سے قویٰ کا مطیع ہونا مراد ہے اور ابیٰ واستکبر سے عدم اطاعت قوت بہیمیہ مراد ہے جو آدمی کی اغوا کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدہ سے انکار کرنا۔ اور کہتا ہے کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ اُن سے فضائے بسیط یا سبع سیارات مراد ہیں اور کہتا ہے کہ لونڈی غلام بنانا حرام ہو گیا ہے۔ آیۂ اِمّا منّاً بعد و اِمّا فداءً سے اور یہ آیت نازل ہوئی ہے فتح مکہ میں اور یہ سب سے اخیر آیت ہے جو قیدیوں کے باب میں نازل ہوئی ہے، اور کہتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی تھی اور جسم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے سے انکار کرتا ہے شق صدرِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کہتا ہے کہ گلا گھونٹے ہوئے

پرندہ حلال ہیں، پس ایسے شخص کے باب میں کیا حکم ہے؟

اس استفتے کے جواب میں مذاہب اربعہ کے چاروں مفتیوں[1] نے جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں علیحدہ علیحدہ عبارت لکھی ہے اور ان چاروں صاحبوں کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ "یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ وہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے خدا اس کو سمجھے۔ واجب ہے اولوالامر پر اس شخص سے انتقام لینا۔ اس کو تنبیہ کرنی چاہیے اور اگر جاہل ہو تو سمجھانا چاہیے پھر اگر باز آوے تو بہتر ہے ورنہ ضرب اور حبس سے اس کی تادیب کرنی چاہیے اگر وُلاۃ اسلام میں کوئی صاحب غیرت ہو۔ نہیں تو خدا اُس کو سمجھے گا اور اُس کی ضلالتوں اور رسوائیوں کی سزا دے گا" اس کے بعد سید محمد کتبی حنفی مدرس حرم شریف اور مولانا رحمت اللہ مرحوم ہندی مہاجر مکہ معظمہ نے چاروں مفتیوں کے جوابوں کی تصویب کی ہے۔

پھر مولانا علی بخش خاں مدینہ منورہ گئے ہیں اور اسی قسم کا استفتا شیخ محمد امین بالی مفتی احناف کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اُن کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ "جو کچھ دُرِ مختار اور اُس کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہو گیا ہے۔ یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا یا اِباحی ہے کیونکہ منخنقہ کا کھانا مباح بتلاتا ہے۔ اور اہل مذہب حنفی کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے

---

[1] یعنی شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ عبداللہ سراج مفتی حنفیہ اور احمد بن زینی دحلان مفتی شافعیہ اور محمد بن عبداللہ بن حمید مفتی حنابلہ اور حسین بن ابراہیم مفتی مالکیہ ۱۲۔

لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اُس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے دین کی حفاظت کے لیے اور وُلاۃ امر پر واجب ہے کہ ایسا کریں۔"

دوسرے استفتے کا ملخص یہ ہے کہ "اُس مدرسہ کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے بانی کے ایسے اور ایسے عقاید اور اقوال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہل اسلام کے اخلاق مہذب نہ ہوں گے جب تک کہ وہ سنّۂ ضروریہ میں یورپ کے فلاسفۂ جدید کی پیروی نہ کریں گے اور یہ کہ تمام علوم دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدوّن کیے ہیں بے فائدہ ہیں اس لیے ضرور ہے کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں علوم جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہل یورپ کے طریقہ پر سنّۂ ضروریہ سکھائے جائیں اور کتب دینیہ میں سے ایسے مضامین انتخاب کیے جائیں جو فلسفۂ جدیدہ کے خلاف نہ ہوں۔ اور جب لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہوگا۔ اور اُس کی اعانت سے انکار کیا تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کروں گا اور اپنے ارادہ سے بھی باز نہ آؤں گا مگر مدرسہ کا جو انتظام ہوگا وہ مجلس شوریٰ کی رائے کے موافق ہوگا۔ حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اُسی کے گروہ کے ہیں اور اُن کی رائیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پچھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہیں۔ پس ایسی حالت میں آیا مسلمانوں کو اس کی اعانت کرنی جائز ہے یا نہیں! بیّنوا توجروا۔"

اس کا جواب بھی حرمین شریفین کے مفتیوں نے الگ الگ لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اُس کے بانی کو ہلاک کرے اس کی اعانت جائز نہیں ہے اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم

کرنا اور اس کے بانی سے اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے اور ہر شخص پر جس میں حمیت اسلامی ہو واجب ہے اس مدرسہ کی مخالفت جہاں تک کہ قدرت ہو اور ادنےٰ درجہ یہ ہے کہ دل سے اُس کا مخالف ہو۔"

حسن اتفاق سے جس زمانہ میں یہ فتویٰ مولوی علی بخش خاں حرمین شریفین میں وہاں کے علما اور مفتیوں سے لکھوا رہے تھے حافظ محمد حسین نام ہندوستان کے ایک بزرگ وہاں موجود تھے جو حج اور زیارت کے ارادہ سے وہاں گئے تھے۔ اُدھر تو مولوی علی بخش خاں نے عرب سے آکر مذکورۂ بالا فتووں کی ہندوستان میں منادی کرنی شروع کی اور اِدھر اُس نیک دل مسلمان نے باوجودیکہ سرسید سے مطلق شناسائی نہ تھی ایک طول طویل مضمون سرسید کی تکفیر کی تردید میں انھیں دنوں میں اخبار کوہِ نور لاہور میں چھپوایا جو تہذیب الاخلاق میں نقل کیا گیا تھا اور جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے مناسب سمجھتے ہیں۔

وہ علمائے حرمین شریفین کے فتووں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فتوے لکھنے لکھانے کا جو حال یہاں ہے (یعنی ہندوستان میں) وہی وہاں (یعنی حرمین شریفین میں) ہے جس مضمون سے چاہا فتوے لکھ لیا جس سے دستخط کراتے ہوئے جو چاہا سمجھا کر دستخط کرا لیے۔ جیسے عالم یہاں ہیں ویسے ہی وہاں ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ ان کی زبان ہندی ہے اُن کی عربی۔ وہاں جو ہندوستانی اہل سنت وجماعت کے عالم ہیں وہ دو گروہ ہیں ایک بدعتی، دوسرے وہابی جو بدعتی ہیں وہ وہابیوں کو کافر کہتے ہیں جو وہابی ہیں وہ بدعتیوں کو بُرا کہتے ہیں جب بدعتیوں کا وار چل جاتا ہے وہابیوں کو نکلوا دیتے ہیں، جب وہابی غالب ہو جاتے ہیں بدعتی چپ ہو جاتے ہیں۔ اُن دنوں بدعتیوں کا وار چل رہا ہے۔ سید احمد خاں صاحب حرمین شریفین میں بھی مشہور ہیں۔ اکثر ہندوستانی اور بعض

عرب اُن کے نام اور اُن کے خلاف واقع حال سے واقف ہیں۔ وہاں مشہور ہے کہ سید احمد خاں لندن گئے تھے وہ انگریزوں سے اقرار کر کے آئے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو جہاں تک ہو سکے گا کرسٹان کریں گے اور دین اسلام سے پھیریں گے اب وہ اپنے اقرار کے موافق مسلمانوں کو بہکا کر دین اسلام سے پھیرتے ہیں اور نئے نئے عقائد سکھلاتے ہیں۔ یہ جو فتوے میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے بھی اُن کا فتنہ بڑھ کر ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ظاہر میں مسلمان رہ کر اور دین اسلام کے نام سے وعظ و نصیحت کر کے عیسائی کرتے ہیں۔ جس کسی نے سید احمد خاں صاحب کا یہ حال سنا، وہ اُن سے نفرت کرنے لگا اور بُرا جاننے لگا۔ جب سے واقعی حال کہا گیا کہ سید احمد خاں ایسے آدمی نہیں ہیں، پکے مسلمان ہیں ظاہر اور باطن میں یکساں ہیں مسلمانوں کو مسلمان رکھنا چاہتے ہیں، قرآن کے معنی جو ہیں وہی کہتے ہیں حدیث کو معتبر جانتے ہیں، جو حدیث نہیں ہے اسکو بے اعتبار سمجھتے ہیں، اہل کتاب کے ذبیحہ کو قرآن مجید کے موافق حلال کہتے ہیں، سور اور شراب کو حرام سمجھتے ہیں، انسانوں سے انسانیت کی وجہ سے قرآن مجید کے مطابق دوستی رکھتی اور ہر ایک کی بھلائی چاہنی موجب ثواب بتاتے ہیں، شیطان اور آسمان کے منکر نہیں مقر ہیں، صورت اور طرح میں جو بعض عالموں نے بیان کی ہے اُن کے ہمزبان ہیں اکثروں کے ساتھی نہیں، امام کو امام جانتے ہیں پیغمبر نہیں مانتے، مفسر کو مفسر مانتے ہیں الہامی نہیں جانتے، مجتہد کو مجتہد کہتے ہیں۔ خاتم المجتہدین نہیں سمجھتے ہر وقت اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کی دین و دنیا درست ہو، ہزاروں روپئے اپنے خرچ کرتے ہیں، دل و جان سے ہر وقت اسی کے خواستگار ہیں، اپنا جان و مال مسلمانوں کے واسطے وقف کر رکھا ہے، چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا میں مالدار ہو جائیں اور دین میں

ایماندار، یہ سن کر وہ سید احمد خاں کی تعریف کرنے لگا، ہندوستانی نے کہا بہت اچھے آدمی ہیں اور عرب نے کہا طَیِّب۔ جناب مولانا علی بخش خاں صاحب بہاور جب تک مکۂ معظمہ میں رہے ان کو یہی شغل رہا۔ جب مدینہ منورہ پہنچ گئے وہاں بھی انھیں فتووں کی فکر رہتی، حالانکہ مدت قیام مدینہ منورہ کی تھوڑی تھی یعنی آٹھ سات روز کہ ضروری کام اور زیارات طیبات بھی مشکل سے انجام ہوتے ہیں۔ مولانا صاحب اسی انتظام میں رہے۔ سوالات کا مسودہ مسجد نبوی میں روضۂ مطہرہ کے رو برو ہوا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اکثر ہندوستانی اور عرب سے مولانا صاحب یہی ذکر فرماتے رہتے اور اسی کی بحث ہوتی رہتی مولانا صاحب شہاب ثاقب اور ایک اور رسالہ کی کئی جلدیں لے گئے تھے وہ بھی وہاں تقسیم فرمائیں۔ سید احمد خاں صاحب کا کفر اور اسلام اور ان کے کفر کے فتووں کا مدار ان کا حال بیان کرنے والوں پر منحصر ہے۔ نہ مکہ والے ان کو جانیں نہ مدینے والے ان سے واقف۔ اگر کوئی چاہے تو سو فتوے اُن کے اسلام کے حرمین شریفین سے واقعی حال بیان کر کے لا سکتا ہے۔ سید احمد خاں صاحب کا اسلام مسلمانوں کے دلوں پہ نسلاً بعد نسلٍ کندہ ہوتا چلا جائے گا اور تھوڑے عرصہ بعد سید احمد خاں صاحب کے نام کے ساتھ مجتہد و مجدد کا لفظ لکھنا شروع ہو جائے گا۔ اُن کے اسلام کے ثبوت میں کاغذ اور سیاہی کی مدد ضرور نہیں۔ جو بات کفر کی ہے وہ کفر کی ہے اور جو اسلام کی ہے وہ اسلام کی۔ سید احمد خاں صاحب صرف اس سبب سے کہ حرمین شریفین کے عالموں نے اُن کے کفر کے فتوے دے دیئے۔ کافر نہیں ہو سکتے جیسے یہاں کے عالم ہیں ویسے ہی وہاں کے۔ صرف زبان کا فرق ہے، انھیں کتابوں سے وہاں والے فتوے لکھتے ہیں انھیں سے یہاں والے۔"

اسی مضمون میں وہ ایک جگہ ہندوستانی مولویوں کا، جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں۔ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں" دو تین مولانا صاحبوں کے سامنے میں نے سید احمد خاں صاحب کی تعریف کی اور واقعی حال اُن کا بیان کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ فلاں مولانا صاحب یا حکیم صاحب یا منشی صاحب ابھی ہندوستان سے آئے ہیں۔ وہ اس کے خلاف کہتے ہیں، تم ہرگز سید احمد خاں کا کہنا نہ مانو، ورنہ کافر ہو جاؤ گے میں نے کہا بہت اچھا سید احمد خاں صاحب کا کہنا نہ مانوں گا، اُن کو برا جانوں گا مگر پھر کس کا کہا مانوں؟ آپ کا؟ سو آپ کو بھی تو فلاں مولانا کافر کہتے ہیں اس کا کیا علاج؟ غرض ہندوستانی عالموں اور جاہلوں کا وہاں بھی یہی خراب حال اور لڑائی ہے۔"

اگرچہ حافظ محمد حسین صاحب نے حرمین شریفین کے فتووں کی حقیقت اپنے مضمون میں اچھی طرح ظاہر کر دی ہے پھر بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے ساٹھ عالموں کا سر سید کی تکفیر پر اتفاق کرنا اور حرمین شریفین کے مفتیوں اور دیگر عالموں کا ان کے ساتھ ہمزبان ہونا بعض ناواقف لوگوں کو سر سید کے مسلمان ہونے کی نسبت شبہ میں ڈالے اور ممکن ہے کہ بعض ناظرین کتاب کے دل میں یہ خیال گذرے کہ تیس برس بعد ان دبے دبائے فتووں کا سر سید کی لائف میں ذکر کرنا گویا اُن کی تکفیر میں از سر نو جان ڈالنی ہے، مگر ہمارے نزدیک سر سید کی لائف ناتمام رہتی اگر اُن فتووں کا ذکر اس میں نہ کیا جاتا درحقیقت یہ کفر یا ارتداد کے فتوے نہیں ہیں بلکہ سر سید کے اعلیٰ درجہ کے مسلمان ہونے کے وثیقے ہیں، یہ تمغے ہمیشہ انھیں لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکتے۔ امام غزالی اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ "جس شخص پر لوگ حسد نہ کریں اس کو حقیر جان؛ اور جس کو کافر اور

گمراہ نہ کہیں اُس کو نا چیز سمجھ" ابوالائمہ علی مرتضیٰؓ نے جو ایمان کی تعریف بتائی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنے زمانہ میں اُس کا صحیح مصداق سید احمد خاں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا، وہ فرماتے ہیں۔ الایمان ان تؤثر الصدق حیث یضرک علی الکذب حیث ینفعک (یعنی ایمان کے یہ معنی ہیں کہ جب سچ کہنا مضر ہو اور جھوٹ کہنا مفید اس وقت سچ کو جھوٹ سے مقدم سمجھا جائے) سر سید کو اپنی سچائی کی بدولت صرف مسلمانوں ہی کی مخالفت کا نشانہ بننا نہیں پڑا بلکہ اکثر موقعوں پر محض ملک اور قوم کی خیر خواہی کی بدولت جیسا کہ اُن کی بائیوگرافی جا بجا شہادت دیتی ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر افسروں اور حاکموں کی خفگی اور حد سے زیادہ ناراضی، برداشت کرنی اور بعض اوقات اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا پڑا ہے۔ خدا تعالےٰ نے ایمان کی سچائی کا معیار یہ نہیں بتایا کہ کسی مفتی نے اُس کے کفر کا فتوےٰ نہ دیا ہو بلکہ اس کا صحیح معیار آزمائش میں پورا اترنے کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (یعنی کیا لوگ یہ سمجھے ہیں کہ صرف اتنا کہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور اُن کی آزمائش نہ کیجائے گی) اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس معیار کے موافق سیّد احمد خاں کا ایمان کامل ٹھیرتا ہے یا اُن لوگوں کا جنھوں نے اُس کو کافر اور واجب القتل ٹھیرایا؛ غدر کے بعد جب کہ مسلمانوں کی حمایت کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا، اور دین اسلام امن اور انتظام کا دشمن اور فتنہ و فساد کا بانی خیال کیا جاتا تھا، اس سے زیادہ حمیت اسلامی اور جوش ایمانی کے امتحان کا وقت اور کونسا ہو سکتا ہے؛ اُس وقت اُسی کافر واجب القتل کے سوا اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لیے نہ اُن مستفتیوں میں سے کوئی اٹھا جنھوں نے اُس کے کافر و مرتد ہونے کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیوں میں سے جنھوں نے اُس کے کفر و ارتداد کے فتووں پر آنکھیں بند

کر کے مہریں اور دستخط کیے۔

~ "در معد چو او یکے وآں ہم کافر   پس در ہمہ ہند یک مسلماں نبود"

باوجود ان تمام مخالفتوں کے سرسید نے اپنے سخت ترین مخالفوں سے جب کہ وہ کفر اور واجب القتل ہونے کے فتوے تمام ملک میں شایع کر چکے تھے، التجا کی کہ مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم جس میں میری مداخلت سے آپ کو اندیشہ ہے اس کا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھ میں لیجیے، میں اس میں کسی طرح کی شرکت نہیں چاہتا۔ اس پر مولوی امداد العلی نے اُن کو لکھا کہ "تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرو اور ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں" مگر مولوی علی بخش خاں نے اس شرط پر منظور کیا کہ آپ کو اور آپ کی کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کو امور مذہبی میں مداخلت نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کیجائے جس کے وہی لوگ ممبر ہوں جن پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہے اور جو لوگ مذہبی تعلیم کے واسطے چندہ دیں اُس روپیہ سے سود حاصل نہ کیا جائے اور اُس کی آمدنی جائز صرف مذہبی تعلیم میں خرچ کیجائے۔ سرسید نے اُن کی تمام شرطیں منظور کرلیں اور اُن کو قواعد مدرسۃ العلوم میں داخل کر دیا اور مولوی صاحب کو لکھا کہ میں عنقریب یہ تمام خط و کتابت ممبران کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کے پاس بھیج کر منظوری حاصل کر لیتا ہوں۔ اگرچہ بعض ممبروں نے اس بات سے سخت اختلاف کیا کہ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کو تعلیم مذہبی سے کچھ تعلق نہ رہے، مگر کثرت رائے سے وہی تجویز جو مولوی علی بخش خاں چاہتے تھے، منظور ہوگئی اور یہ قرار پایا کہ اہلسنت کے مشہور دیندار عالموں میں سے جن بزرگوں کی خدمت میں درخواست کیجائے کہ وہ تعلیم مذہب اہل سنت وجماعت کی کمیٹی کے ممبر انتخاب کریں۔ البتہ اتنا گناہ ہوگیا کہ مذہبی کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب کرنے والوں میں بشمول مولوی

علی بخش خاں علمائے اہل سنت کے بہت سے نام کمیٹی خزینۃ البضاعۃ نے خود تجویز کر دیئے اور منجملہ بیس بزرگوں کے دو یا تین ممبر خزینۃ البضاعۃ کے بھی مذہبی کمیٹی کے ممبر انتخاب کرنے کے لیے نامزد کیے گئے جس وقت مولوی علی بخش خاں کے پاس اس روئداد کی نقل پہنچی وہ سخت ناراض ہوئے آٹھ سو روپیے کا چندہ جو انھوں نے مدرسۃ العلوم میں دینے کا وعدہ کیا تھا اُس کے دینے سے انکار کیا اور مدرسۃ العلوم کی مذہبی کمیٹی کے اہتمام وغیرہ سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے۔ جن دین دار عالموں سے درخواست کی گئی تھی کہ کمیٹی مذہبی کے ممبر انتخاب کریں اُن میں سے اکثر نے جواب تک نہیں دیا اور مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب نے یہ جواب دیا کہ ہرگاہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے۔

ان تمام واقعات کی طرف سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں اشارے کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب نے لکھا کہ "تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کر دو اور ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں۔" اگرچہ اس امر کو اس بات سے جو پیش کی تھی کچھ تعلق نہ تھا یا اینہمہ میں اُس کو قبول کر لیتا مگر مجھے خیال ہوا کہ اگر ہمارے محب قلبی منشی چراغ علی صاحب (جو شیعہ مذہب رکھتے تھے) مجھ سے کہیں کہ تم ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں " تو پھر میں کیا کروں گا ! بقول شخصے کہ " گوری کا جوبن چٹکیوں ہی میں گیا " میرا تو دیں ہی تکا بوٹی ہو سے گا۔ جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو متعصبانہ جواب دیا اس سے ہر شخص جس کو خدا نے عقل اور محبت اور حب ایمانی دی ہوگی نفرت کرتا ہوگا۔ شیعہ مذہب کی تعلیم کا سلسلہ بالکل علیحدہ ہے جس سے اہل سنت

وجاہت کو کچھ تعلق نہیں، پس یہ کہنا کیسا بیجا تعصب ہے کہ ہرگاہ اُس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے۔ خدا کہے کہ وہ یہ خیال فرماکر کہ ہندوستان میں شیعہ بھی رہتے ہیں، مکہ معظمہ کو سدھاریں مگر افسوس ہے کہ میں سنتا ہوں حج اور طواف میں بھی شیعہ ہوتے ہیں۔"

"افسوس ہے کہ شیعہ و سُنی میں اس زمانہ میں بہ نسبت اُس زمانہ کے جب کہ امام محمد اسمٰعیل بخاری شیعوں سے روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں فرماتے تھے۔ نفاق اور شقاق بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ مگر حالت زمانہ کی ایسی ہے کہ اگر شیعہ اپنے تعصب سے سنیوں کو چھوڑیں اور سنی اپنے تعصب سے شیعوں کو چھوڑیں تو دونوں غارت اور برباد ہوجائیں گے۔ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں، عہدوں میں کم ہیں۔ اگر پھر اُن میں[1] بھی شیعہ و سُنی وخارجی و ناصبی اور وہابی و بدعتی کا تفرقہ پڑے تو بجز برباد اور غارت ہونے کے اور کیا نتیجہ ہے! ارے کمبخت متعصبو! تم آپس میں لڑا کرنا اور ایک دوسرے کو کافر کہا کرنا مگر جو بات سب کے فائدے کی ہے اس میں کیوں ایک دل ہوکر شریک نہیں ہوتے! عالمگیر نے ایک عامل کی بد دیانتی کا ذکر نظیراً کسی دوسرے عامل سے کیا، اُس نے عرض کیا "حضور! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔" عالمگیر نے کہا "ہاں ہاں مگر بوقت خوردن ہمہ برابر میشوند" پس اے بزرگو! اس بات میں کیوں تعصب کو کام فرماتے ہو جس میں سب کا فائدہ مشترک ہے۔"

"جناب سید الحاج مولانا حاجی علی بخش خاں صاحب سے جو معاملہ پیش آیا

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ سرسید کی چیخ پکار سے ہمارے علما اب اس تفرقہ کو مٹانے کی فکر میں ہیں چنانچہ ندوۃ العلما نے سب فرقوں کو شریک کرنے کا ارادہ کیا ہے اگرچہ بعض علما اس کے خلاف ہیں ۱۲۔

وہ تو ظنت اسلام ہے۔ اُن کی اور ہماری تو وہی مثل ہوگئی "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" یعنی وہ ہم کو بدعہد کہتے ہیں ہم اُن کو بدعہد کہتے ہیں۔ بہر حال کسی نے بدعہدی کی ہو، وہ بات جس سے کھنڈت پڑ گئی ہو اس قدر ہے کہ تمام امور تعلیم مذہبی تنہا جناب ممدوح کو کیوں نہ سپرد کیے گئے دیگر بندگان دین کو کیوں شریک کیا، وما ھذا الا شقاقٌ مبین"

سرسید کی مخالفت اگر محض دینداری اور حمیت اسلامی کی بنیاد پر کی جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی بلکہ اُس کا نہ ہونا تعجب تھا کیونکہ اُس سے پایا جاتا کہ مسلمانوں کو دین و مذہب کی کچھ پروا نہیں رہی، چنانچہ اسی خیال سے سرسید اکثر کہا کرتے تھے کہ "جو لوگ میرے مخالف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اسلام کے برخلاف ہوں اور میرے خیالات سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے پس جو کچھ کہ وہ اپنی دانست میں اس خیال سے کرتے ہیں اس پر وہ بزرگ تعریف کے لائق ہیں نہ مذمت کے" مگر افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ زیادہ مخالفتیں محض نفسانیت خود غرضی، یا عناد پر مبنی ہوتی تھیں اور اسی لیے بجائے اس کے کہ سرسید کے اقوال جو انھوں نے مذہبی مسائل کے متعلق جمہور کے خلاف لکھے ہیں راست راست لے کم و کاست بیان کیے جاتے، بیسیوں باتیں اُن کی نسبت غلط مشہور کی گئیں، اُن کی تفسیر کی نسبت اس بات کو عموماً شہرت دی گئی کہ سید احمد خاں نے قرآن کے تیس پاروں میں سے دس چھانٹ لیے ہیں اور بیس نکال ڈالے ہیں، اکثر یہ بھی سنا گیا کہ انھوں نے سورۂ الرحمن میں "فبایِّ اٰلاءِ ربّکما تکذّبان" صرف ایک جگہ رکھا ہے باقی مکرر سمجھ کر سورت میں سے نکال ڈالا ہے۔

مولوی علی بخش خاں نے جو ایک کتاب موسوم بہ تائید الاسلام سرسید کے خلاف لکھی تھی اور جس کی بہت سی جلدیں وہ عرب میں شائع کرنے کو لے

گئے تھے اُس میں بشیار عقائد سرسید کی طرف ایسے منسوب کیے ہیں جو بالکل خلاف واقع ہیں، مثلاً یہ کہ مادہ مثل ذات باری تعالیٰ ازلی ہے، یا ذات باری تعالیٰ خود مادی ہے، یا یہ کہ باوجود قانون قدرت کے بعثت انبیا کی ضرورت نہیں، یا یہ کہ جب علوم جدیدہ یا انگریزی پڑھنے سے معلوم ہو کہ مذہب اسلام میں ضعف پیدا ہوگا تو مذہب اسلام کا ترک کر دینا لازم ہے۔ یا یہ کہ نبوت انبیائے سابقین یا کتب سماویہ کے انکار سے، یا معاذ اللہ قرآن شریف کے عمداً بول و براز میں آلودہ کرنے یا اُس کے پھینک دینے سے، یا حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھیرانے سے، یا معاذ اللہ کسی نبی کو گالی دینے سے، یا بہشت و دوزخ اور قیامت کے انکار سے یا ضروریات دین کے انکار سے آدمی کافر نہیں ہوتا، یا یہ کہ گرمی کے موسم میں رمضان کے تیس روزے فرض نہیں ہو سکتے، یا تھوڑی سی شراب جو پکا متوالا نہ کر دے یا اتنا جوا کھیلنا جو بے قید نہ بنا دے حرام نہیں ہو سکتا، یا یہ کہ صلوٰۃ سے مراد مطلق دعا پڑھ لینا ہے اور وہی واسطے ادائے فرض کے کافی ہے۔ باقی جو ترکیب صلوٰۃ پنجگانہ کی مقرر ہے وہ اصول مخترعہ علما کا اتباع ہے۔ اسی طرح اور بہت سے اتہامات سرسید کی نسبت کتاب مذکور میں کیے گئے ہیں جن کو سرسید نے اپنے مضمون واقع البہتان میں ایک ایک کر کے لکھا ہے اور ہر ایک کے تحت میں یہ فقرہ لکھتے جاتے ہیں کہ " لعنۃ اللہ علیٰ قائلہ و علیٰ معتقدہ "

مذہبی عقائد اور اقوال کے سوا اور طرح طرح کے اتہامات اس خیر خواہِ خلائق پر لگائے جاتے تھے۔ اس بات کا تو سرسید کی وفات تک ہزاروں آدمیوں کو یقین تھا کہ انھوں نے اپنا سر دس ہزار روپے کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ بعد مرنے کے انگریز ان کا سر کاٹ کر لندن لیجائیں گے اور لندن کے عجائب خانہ میں رکھیں گے۔

ایک بار یہی سر بیچنے کا تذکرہ سرسید کے سامنے ہوا، اُس وقت راقم بھی موجود تھا اس مرحوم نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ فرمایا کہ "جو چیز خاک میں مل کر خاک ہو جانے والی ہے اُس کے لیے اس سے زیادہ اور کیا عزت ہو سکتی ہے کہ دانشمند لوگ اس کو روپیہ دے کر خریدیں اس کے ڈسیکشن سے کوئی علمی نتیجہ نکالیں، اور اُس کی قیمت کا روپیہ قوم کی تعلیم میں کام آوے دس ہزار چھوڑ دس روپئے بھی اگر اس کی قیمت میں ملیں تو میرے نزدیک سستے ہیں"

منجملہ اُن بیشمار اتہامات کے جو سرسید پر لگائے جاتے تھے ایک وہ صریح بہتان تھا جو ۱۸۷۶ء میں بمقام بنارس اُن پر لگایا گیا۔ سرسید پنشن لے کر علیگڑھ آنے سے چند مہینے پہلے، جب کہ حضور پرنس اوف ویلز بنارس میں تشریف لائے، اُن کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک شفاخانہ بنارس میں بننا تجویز ہوا تھا اور جو کمیٹی یادگار قائم کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی اُس کے ایک ممبر سرسید بھی تھے، کمیٹی کی درخواست پر میونسپلٹی بنارس نے شفاخانہ کے لیے ایک قطعہ زمین دینا تجویز کیا جس میں علاوہ اور کچے گھروں کے ایک چھوٹا سا خام چبوترہ بھی تھا جس کو مسلمانوں نے نماز پڑھنے کے لیے عارضی طور پر بنا لیا تھا۔ میونسپلٹی نے خود اس میدان کو صاف کرا دیا اور جس طرح اور گھروں کے مالکوں کو کمیٹی یادگار سے معاوضہ دلوایا تھا اسی طرح اُس چبوترے کے معاوضہ میں ۳۲ روپلے دینے تجویز ہوئے۔ سرسید نے اس خیال سے کہ یہ قلیل رقم مسلمانوں کے کس کام آئے گی، نواب لفٹنٹ گورنر سے جو اُن دنوں بنارس آئے ہوئے تھے، عرض کر کے اُسی میدان کے قریب مسجد کے لیے ایک دوسرے قطعہ کے ملنے کی اجازت دلوادی اور شفاخانہ کے چندے میں سے ڈھائی ہزار روپیہ مسلمانوں کو دلوا کر وہاں

مسجد تعمیر کرادی بنارس کے مسلمان سرسید کے نہایت شکرگزار ہوئے اور مسجد کے پیش طاق پر یہ بیت کندہ کرانی تجویز کی۔

" درآوان معید دا ز برائے طاعت یزداں
بناگردید ایں مسجد ز سعی سید احمد خاں "

مگر سرسید نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور اس بیت کے کندہ کرانے کی اجازت نہیں دی۔

بنارس میں تو یہ کارروائی ہو رہی تھی اور تمام ہندوستان کے دیسی اخباروں میں یہ لکھا جا رہا تھا کہ سید احمد خاں نے شفاخانہ کے واسطے مسجد منہدم کرادی۔ یہ شور و شغب ایک مدت تک ہندوستان کے نالائق اخباروں میں رہا مگر سرسید نے اس کی کچھ پروانہ کی اور اصل حال سے اخباروں کو مطلع نہیں کیا۔ آخر سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر نے ایک پرچہ میں لکھدیا کہ ہم اصل حالات دریافت کرکے اپنے اخبار میں چھاپیں گے۔ سرسید نے اڈیٹر کی یہ تحریر اخبار میں دیکھ کر اُس کو لکھ بھیجا کہ مجھ پر سے الزام رفع کرنے کے لیے آپ اخبار میں کچھ نہ لکھیں اور اخبار نویسوں کو بکنے دیں۔ چند روز بعد اڈیٹر کی شکایت اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی کہ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ کیا کیونکہ سرسید سے الزام رفع کرنے کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا۔ آخر علیگڑھ اخبار کے اڈیٹر نے مجبور ہو کر ۲۶ مئی ۱۸۷۸ء کے پرچہ میں تمام حال اول سے آخر تک بحوالہ کاغذات مثل میونسپلٹی بنارس کے تحریر کیا اب اخباروں میں یہ چھپنا شروع ہوا کہ نہایت افسوس ہے نہ سرسید نے اصل سے مطلع کیا اور نہ سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر نے مدت تک اس وقت واقعہ پر کچھ روشنی ڈالی۔ تب سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک آرٹیکل لکھا جس میں تمام اخباروں کے اقوال جو سرسید کے برخلاف لکھے گئے تھے، نقل کر کے ہر

ایک پرچہ پر جدا جدا ریمارک کیے ہیں۔ اول جلد اودھ اخبار میں جس کے اڈیٹر اُس وقت مرحوم غلام محمد خاں تپش تھے، یہ فقرہ چھپا تھا، اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا یعنی اُس وقت جب کہ سید صاحب کی بدنامی تمام دنیا میں مشتہر ہو چکی۔ اِس پر سرسید مرحوم نے نہایت لطیف ریمارک کیا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں "اس کے عذر میں نہایت ادب سے اپنے شفیق کے سامنے حافظ کا یہ شعر پڑھتا ہوں:

در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

لیکن اگر ہمارے دوست اس فقرہ کو یوں ارقام فرماتے تو شاید لفظ بدنامی کے صحیح معنی ہو سکتے یہ "مضمون نہایت دیر میں چھپا یعنی اس وقت جبکہ تمام اخباروں کی بدنامی دنیا میں ہو چکی" پھر لکھتے ہیں "ہم کو امید ہے کہ خدا وہ دن بہت جلد لائے گا کہ ہماری قوم بدنام کے صحیح معنی سمجھے گی اور ہمارے ملک کے اخبار خود اپنی عزت کرنی سیکھیں گے۔"

اسی طرح بیسیوں اتہام سرسید پر، مدرسۃ العلوم پر، اس کے طالب علموں پر لگائے جاتے تھے، مدرسہ کی نسبت ایسی خبریں اڑائی جاتی تھیں جن سے لوگوں کے دل میں نفرت پیدا ہو یا اُس کے معاونوں کو رنج اور مخالفوں کو خوشی ہو۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک ننگ اسلام واہل اسلام نے مشہور کر دیا کہ جس کوٹھی میں ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اُس کی چھت گر پڑی اور بیس تیس طالب علم اُس کے نیچے دب گئے۔ اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں مگر جو مثل مشہور ہے کہ "اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے۔" ایسی باتیں بیان کرنے سے سوا اس کے کہ اپنی اور اپنی قوم کی نالائقی سارے زمانہ میں مشہور ہو

اور کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔

الغرض جب سرسید کے کفر وارتداد اور واجب القتل ہونے کے فتوے اطراف ہندوستان میں شایع ہوئے تو ان کی جان لینے کی دھمکیوں کے گمنام خطوط اُن کے پاس آنے لگے۔ اکثر خطوں کا یہ مضمون تھا کہ "ہم نے اس بات پر قرآن اٹھایا ہے کہ تم کو مار ڈالیں گے۔" ایک خط میں لکھا تھا کہ "شیر علی جس نے لارڈ میو کو مارا تھا اس نے نہایت حماقت کی اگر وہ تم کو مار ڈالتا تو یقیناً بہشت میں پہنچ گیا ہوتا۔" ۱۸۹۱ء میں جبکہ سرسید کالج کی طرف سے ایک ڈپوٹیشن لے کر حیدرآباد گئے تھے اور حضور نظام (خلد اللہ ملکہ) کے اِس بشیر باغ میں مہمان تھے ایک مولوی نے ہمارے سامنے سرسید سے یہ ذکر کیا کہ کلکتہ میں ایک مسلمان تاجر نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور وہ کسی شخص کو اس کام پر مامور کرنا چاہتا تھا اس بات کی مجھ کو بھی خبر ہوئی، چونکہ میں علیگڑھ کی طرف آنے والا تھا اس سے خود جاکر ملا اور اُس سے کہا کہ میں علیگڑھ جانے والا ہوں اور میرا ارادہ سید احمد خاں سے ملنے کا ہے، جب تک کہ میں ان کے عقائد اور مذہبی خیالات دریافت کر کے آپ کو اطلاع نہ دوں آپ اس ارادہ سے باز رہیں، چنانچہ میں علیگڑھ میں آیا اور آپ سے ملا اور بعد دریافت حالات کے اُس کو لکھ بھیجا کہ سید احمد خاں میں کوئی بات ایسی اسلام کے خلاف نہیں پائی تم کو چاہیے کہ اپنے منصوبے سے توبہ کرو اور اپنے خیال خام سے نادم ہو۔ معلوم نہیں کہ اس مولوی کا یہ بیان صحیح تھا یا غلط مگر سرسید نے جو یہ حال سن کر اس کو جواب دیا وہ لطف سے خالی نہ تھا۔ انھوں نے کہا، "افسوس ہے کہ آپ نے اُس دیندار مسلمان کو اس ارادہ سے روک دیا اور ہم کو ہمارے بزرگوں کی میراث سے جو ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے قتل ہوتے رہے ہیں، محروم رکھا۔"

ایک دفعہ خاص علیگڑھ میں کسی نے بذریعۂ گمنام تحریر کے سرسید کو یہ دھمکی دی کہ اگر آیندہ تم گاڑی پر سوار ہو کر اپنی کوٹھی سے باہر نکلے تو تمھاری خیر نہیں، میں بندوق مارے بغیر ہرگز نہ رہوں گا مگر سرسید نے اِن دھمکیوں کا کبھی کچھ خیال نہیں کیا، نہ اُن کی کسی عادت میں فرق آیا اور نہ اُنھوں نے اپنی حفاظت کا کبھی کوئی خاص انتظام کیا۔ سرسید کی وفات سے چند مہینے پہلے ایک مخالف گروہ کی نسبت یہ مشہور ہُوا کہ اُن کا ارادہ سید کے قتل کرنے کا ہے اور فی الحقیقۃ اُس گروہ کا جوش اُس حد کو پہنچا ہُوا تھا کہ اُن سے ایسی حرکت کر بیٹھنا کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن سرسید کے بعض احباب نے اُن سے کہا کہ آپ سوار ہونا چھوڑ دیں اور کچھ زاید چوکیدار رات کے پہرے کے لیے کوٹھی پر مقرر ہونے چاہییں اور ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ کوئی اجنبی شخص بلا اطلاع اور بغیر تفتیش حال کے کوٹھی کے اندر نہ آنے پائے۔ سرسید یہ باتیں سُن کر تعجب کرتے تھے اور ہنستے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے صلاح کار دوستوں کو نادان اور وسواسی سمجھتے ہیں اور ایسا انتظام کرنے کو ایک نہایت سبک حرکت خیال کرتے ہیں، چنانچہ کسی طرح کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کسی کے آنے جانے کی روک ٹوک کی گئی، نہ چوکیدار رکھے گئے نہ سوار ہونا موقوف ہُوا۔

سنہ ۱۸۸۸ء میں جب پہلی بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا منعقد ہونا لاہور میں قرار پایا تو خان بہادر برکت علیخاں، جن کی تحریک سے لاہور میں اس جلسہ کا ہونا قرار پایا تھا اُن کے ایک مخالف کی طرف سے کانفرنس کی تاریخوں سے ایک دن پہلے ایک نہایت گستاخ تحریر سرسید کے نام پہنچی جس میں علاوہ اور نالائق باتوں کے نہایت بُرے لفظوں میں یہ مطلب بھی ادا کیا گیا تھا کہ تم کانفرنس میں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرنا ورنہ جو حال کل رات کو خان بہادر کا کیا گیا ہے اس

سے بدتر تمھارا حال کیا جائے گا۔ سرسید نے جو وقت علیگڑھ سے لاہور کی روانگی کا مقرر تھا اس میں کچھ تبدیلی نہیں کی صرف خان بہادر کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لیے چلنے سے پہلے اُن کو تار دیا اور جب ان کی خیریت معلوم ہو گئی فوراً لاہور کو روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچ کر وہ تحریریں انھوں نے خاں بہادر اور سردار محمد حیات کو دکھائی۔ دونوں صاحب اُن گستاخیوں کو دیکھ کر جو سرسید کی نسبت کی گئی تھیں شدت غیظ و غضب سے از خود رفتہ ہو گئے۔ کاتب کی نسبت یقین ہو گیا تھا کہ اخبار رفیق ہند کا اڈیٹر ہے اور سرسید نے خود اس کا خط اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ باایں‌ہمہ اس مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ کاتب خط کی اس حرکت سے درگذر کیجائے اور اُس کو کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت دیجائے کیونکہ وہ خود اس تحریر کے لکھنے سے انکار کرتا تھا۔ مگر خان بہادر اور سردار صاحب اور دیگر اہل پنجاب نے سرسید کی سفارش اُس کے باب میں منظور نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے اپنا اخبار، جو غالباً بند ہو گیا تھا، چند مدت بعد پھر جاری کیا پہلے یہی اخبار سرسید کا حد سے زیادہ طرفدار اور مداح و ثناخواں تھا چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جب سرسید نے پنجاب کا سفر کیا اور لاہور میں پہنچے تو اسی اخبار میں سرسید کی نسبت ایک لمبی مدحیہ عبارت چھپی تھی جس کے سرے پر یہ شعر لکھا تھا:

~ "مرحبا سید ادلاد نبی مدنی جان جاں باد فدایت کہ وحید زمنی"

مگر جب دوسری بار یہ اخبار جاری ہوا تو سرسید کی مخالفت میں تمام اگلے پچھلے مخالفوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ وہی شخص جس کی نسبت پہلے "سید اولاد نبی مدنی" لکھا گیا تھا اس پرچہ میں کوئی بُرائی ایسی نہ تھی جو اس کی طرف منسوب نہ کی گئی ہو اور کوئی آلہ لوگوں کو اُس سے بدظن کرنے کا ایسا نہ تھا جو

اس پرچہ میں استعمال نہ کیا گیا ہو. سرسید کے دوست اُس کی زبان درازیاں دیکھ کر بگڑتے تھے اور اس کا جواب لکھنے پر آمادہ ہوتے تھے مگر سرسید سب کو منع کرتے تھے اور کسی کو اس سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "موسم کی آندھی ہے چند روز میں خود بخود فرو ہو جائے گی"۔

اب سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۹ء میں وہ ایک مدت تک بند رہ کر تیسری بار پھر جاری ہوا ہے اور چشم بد دور اب بھی باوجود اس کے کہ سرسید دنیا سے رحلت کر چکے ہیں اپنی وضعداری نباہے جاتا ہے لیکن اب سرسید کا نام صرف کم لیتا ہے بلکہ جو کچھ سرسید یا اُن کے کاموں کے برخلاف لکھنا ہوتا ہے اُس کو علیگڑھ مشن پر ڈھال دیتا ہے مگر ہم خوش ہیں کہ سرسید کی مخالفت کی بدولت اب کی بار اس میں خود بخود ایک ایسی خوبی پیدا ہو گئی ہے جو ملک کے حق میں نہایت مفید ہے وہ برخلاف اُن اخباروں کے جو ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں دونوں قوموں میں آشتی اور مصالحت کی بنیاد ڈالتا معلوم ہوتا ہے اُس کی یہ پالیسی جیسا کہ اُس کے مخالف خیال کرتے ہیں کسی غرض پر مبنی کیوں نہ ہو ملک کے حق میں بہر حال مفید ہے۔

ایک شخص نے چند اجزا سرسید کی لائف کے نام سے لکھ کر اُن کے پاس بھیجے جس میں بہت سی باتیں خلاف واقع درج تھیں اور جا بجا اُن کی تنقیص کی گئی تھی اگر مؤلف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا. سرسید نے اُس پر یہ ریمارک کر کے اخبار میں چھپوا دیا "ایک ہمارے شفیق غائبانہ نے، جن سے ہم سے ملاقات ظاہری نہیں ہے. ہماری لائف اپنے خیال کے مطابق لکھ کر ہمارے پاس بھیجی ہے جس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے ہم خود واقف نہیں ہیں. ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ رباعی حسب حال لکھتے ہیں۔

اے آنکہ مرا ندیدہ بشناختۂ ‎ نادیدہ تصورم جہاں ساختۂ

با ایزدِ بے مثال مانندیم ‎ حقا کہ ندیدۂ و نشناختۂ

سب سے زیادہ سرسید کا ذکر خیر پنچ اخباروں میں ہوتا تھا جن کے اڈیٹر اور پروپرائٹر عموماً مسلمان تھے اور گرم بازاری صرف اس بات پر منحصر تھی کہ اپنی قوم کے خیر خواہ اور جاں نثار پر پھبتیاں اڑائیں اس کے کارٹون بنائیں اس کی ہجو کے اشعار شایع کریں اس کی خوبیوں کو عیب بنا کر دکھائیں اور اس طرح نہ صرف آپ کو بلکہ تمام قوم کو جس کے مذاق پر اخباروں کی برائی بھلائی کا انحصار ہے دُنیا میں رسوا اور بدنام کریں۔ سرسید بھی ان اخباروں کے آوازے توازے سنتے سنتے اُن کے عادی ہو گئے تھے یہانتک کہ جس اخبار میں اُن پر کوئی چوٹ نہ ہوتی تھی اُس کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کہ کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے"۔

اسی طرح سرسید کی تمام تحریریں، جو اُس مخالفت کے زمانہ میں تہذیب الاخلاق میں چھپی تھیں نہایت لطیف اور دلچسپ ہوتی تھیں ازاں جملہ دو تین فقرے مختلف مقامات سے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں "ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ ضلع سہارنپور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی..... ایک صاحب نے کہا کہ "ہے تو کرسٹان مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اسی کرسٹان سے ہوگی" یہ نقل سنکر میں نہایت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر درحقیقت مجھ سے ایسا ہو تو اس کرسٹانی خطاب پر ہزار مسلمانی نثار ہے..... صاحب نے ایک ناواقف

شاعر سے پوچھا کہ صائب کیسا شعر کہتا ہے اُس نے نہایت دلی جوش سے کہا کہ "آں قرمساق ہمہ خوش میگوید" صائب کہتا ہے کہ "جیسی عزت مجکو قرمساق کے لفظ سے حاصل ہوئی اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب سے بھی ممکن نہیں" اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ کرسٹان کا میرے لیے عزت قومی کا باعث ہو"

ایک جگہ لکھتے ہیں "حضرات ہماری تو وہی مثل ہے دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا، از برادران دور و از بیگانگاں نفور، ایک گوشہ میں پڑا ہوں، نزدیک و دور بیگانہ و یگانہ سے لعن وطعن سنتا ہوں، جس طرح بیگانگاں مجھ سے نفرت کرتے ہیں برادران وطن بھی الا ماشاء اللہ اسی طرح متنفر ہیں۔ قصور یہ کہ اپنی دانست میں بھائیوں کا بھلا چاہتا ہوں، اُن کی عام رائے کی مخالفت سے نہیں ڈرتا بلکہ جو اُن کے بھلے کی ہے وہی کہتا ہوں، یہی کمبخت خصلت ہے جس نے مجھ کو اس حال پر پہنچایا ہے۔"

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں "دنیا میں کوئی نہیں رہا، پیر نہ پیغمبر نہ زاہد خدا پرست نہ فاسق نفس پرست، سب کو گذرنا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں، بشرطیکہ میری سمجھ کی غلطی نہ ہو، کہ حضرت مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمۃ، جن کو بہ لحاظ اُن نسبتوں کے جو مجھے اس خانوادہ سے ہیں تا زیست پر دادا کہنا زیبا ہے، اُن کا یہ شعر میری خاک مرقد کا کتابہ ہوگا ؎

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

سرسید نے جو لباس وطعام اور طرز ماند و بود اور طرز معاشرت وغیرہ میں تعلیم یافتہ ترکوں کا طریقہ اختیار کیا تھا اور جس سے انگریزوں اور مسلمانوں میں میل جول پیدا کرنا مقصود تھا مسلمان تو اس طریقہ کو نا پسند کرتے ہی تھے بلکہ اس کو عیسائی ہو جانے کے برابر سمجھتے تھے مگر تماشا یہ ہے کہ بعض متعصب اور مغرور انگریز بھی اس

سے نہایت ناراضی ظاہر کرتے تھے اور گویا اس بات کا ثبوت دیتے تھے کہ انسانی اخلاق میں منو کے زمانہ سے آج تک باوجود اس قدر علمی اور عقلی ترقیات کے ایک ذرہ برابر بھی ترقی نہیں ہوئی اور جو فرق منو نے شُدر اور برہمن میں رکھا تھا وہی فرق اس زمانہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے شائستہ لوگ حاکم و محکوم میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ فیاض طبع اور کشادہ دل انگریز جو ہندوستان میں رہ کر انگلستان کے اصلی جواہر یعنی آزادی کو کھو نہیں بیٹھتے وہ ان باتوں کا کچھ خیال نہیں کرتے اور ہندوستانیوں سے خواہ وہ کسی لباس میں ہوں ناک بھوں نہیں چڑھاتے مگر تنگدل انگریزوں کو ہرگز گوارا نہیں کہ ہندوستانی جو ہماری جوتیوں کے تلے ہیں وہ ٹرکش کوٹ پتلون اور ترکی ٹوپی اور انگریزی بوٹ پہن کر ہم سے ملنے کو آئیں، چنانچہ اسی بنا پر بعض اوقات اُن لوگوں کو جو وضع اور لباس میں سرسید کی پیروی کرتے تھے سخت مشکلیں پیش آئیں بلکہ خود سرسید اسی روک ٹوک کے سبب بعض یورپین افسروں سے، باوجودیکہ برسوں ایک جگہ رہے، کبھی نہ مل سکے۔ مگر جس بات کو انھوں نے اپنے نزدیک بہتر سمجھا کسی کی مخالفت کے خوف سے اس کو ترک نہیں کیا، جیسا سمجھا ویسا ہی کہا اور وہی کیا۔ جب کبھی اُن کو معلوم ہوا کہ کسی افسر یا حاکم اعلیٰ نے ہندوستانیوں کے یورپین ڈریس پر اعتراض کیا ہے فوراً اخبار میں اس کا جواب لکھا یہاں تک کہ جب لارڈ ڈفرن نے اسی تبدیل وضع کے خلاف ایک عام مجمع میں کچھ تقریر کی اور وہ اخباروں میں چھپی تو سرسید نے ایک نہایت زبردست آرٹیکل اس کے برخلاف لکھ کر اپنے اخبار میں شایع کیا اور اس طرح کے بے شمار آرٹیکل سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں اُن کے لکھے ہوئے موجود ہیں

جو مسلمان سرسید کے مخالف تھے وہ بھی انگریزوں کی اس مخالفت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، چنانچہ مولوی امداد العلی اپنی ایک تحریر میں لکھتے

ہیں۔ بعض اہالیان ہند نے واسطے دھوکا دینے حکام وقت کے اپنا طریقہ مذہبی اور لباس ملکی اور وضع قومی چھوڑ کر برخلاف اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں اور ہم پیشوں کے جاکٹ اور کوٹ پتلون پہننا اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا اس مراد سے اختیار کیا ہے کہ ہم کو حکام وقت جن کے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے اپنا مخلص اور مطیع اور پیرو جانیں اور اُن کے محکومین ہم کو حکام کا ہمسر مانند صاحب لوگوں کے سمجھیں، سو نتیجہ اُن کے خبث طینت کا کہ مکر و دغا ہے یوں ظاہر ہے کہ اکثر حکام سوائے فریبی دغا باز سمجھنے کے اُن کو اچھا نہیں جانتے اور اُن کی وضع اور چال چلن کو پسند نہیں کرتے ۔

باوجود ان مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھیں سرسید نے جو اُنکے مقابلہ میں ابتدا سے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا بغیر اشد ضرورت کے کبھی اس کو ترک نہیں کیا۔ نہ وہ خود جواب دینا چاہتے تھے اور نہ کسی دوست کا اپنی طرف سے جواب دینا پسند کرتے تھے چنانچہ اُن کی بہت سی تحریریں دیکھی گئی ہیں جن میں انھوں نے اپنے دوستوں کو مخالفوں کا جواب دینے سے روکا ہے۔ بلکہ ایک دفعہ خود راقم کو ایک ایسی قسم کی تحریر اخباروں میں چھپواتے پر نہایت شرمندہ کیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کو اپنی سچائی پر کس قدر بھروسا تھا اور کہاں تک وہ سلف کے اس سچے مقولہ پر یقین رکھتے تھے کہ "مَا ذَلَّ ذُوْ حَقٍّ وَّلَوِ اتَّفَقَ الْعَالَمُ عَلٰی خِلَافِهٖ"

اُنھوں نے ۱۸۶۹ء میں ولایت سے سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر کو لکھا تھا "ردّ و قدح پر متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ جو بات جھوٹی ہے وہ تھوڑے ہی زمانہ میں مثل جھوٹے موتی کے بے آب ہو جاوے گی، خواہ وہ بات خود اُس شخص کی (یعنی میری) ہو اور خواہ اُس کے مخالف کی۔ پس میں نہایت عاجزی سے آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ جو لوگ میری بُرائی لکھیں آپ بلا تکلف اپنے

اخبار میں نقل کیجیے. صرف اس کی صحت اور عدم صحت پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑ دیجیے امید ہے کہ آپ اپنی عنایت سے میری التماس کو قبول فرمائیں گے ؛

لیکن اگر کسی انگریز کا مضمون سر سید کے خیالات یا مدرسۃ العلوم کے خلاف کسی انگریزی اخبار میں چھپتا تھا تو اُس کا جواب دیئے بغیر کبھی نہ رہتے تھے اور اکثر ایسے مضامین کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ کے ساتھ چھپوا دیتے تھے. جس زمانہ میں اُنھوں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اکثر یورپین افسر اُن کے مخالف ہو گئے تھے اور جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے، کمیٹی نے مدرسہ کے لیے جس قطعۂ زمین کے ملنے کی گورنمنٹ سے درخواست کی تھی ضلع کے حکام اُس کا ملنا نہیں چاہتے تھے خصوصاً ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال مغرب اور صاحب کلکٹر ضلع علیگڑھ سخت مخالف تھے یہاں تک کہ جو مضمون کسی انگریزی اخبار میں مدرسہ یا بانی مدرسہ کے خلاف چھپتا تھا سر سید کو انھیں دونوں صاحبوں پر اُس کے لکھنے کا گمان ہوتا تھا. چنانچہ انڈین آبزرور مطبوعہ ۱۸۷۳ء میں جو ایک سخت آرٹیکل مدرسۃ العلوم اور سر سید بلکہ تمام مسلمانوں کے برخلاف چھپا تھا اس پر سر سید کو یہی خیال ہُوا کہ ان دونوں افسروں میں سے کسی کا لکھا ہُوا ہے. اس پر سر سید نے دو آرٹیکل تہذیب الاخلاق میں لکھے جن کا انگریزی ترجمہ ساتھ ہی ساتھ چھپایا تھا اُس میں سے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں.

"انڈین آبزرور مطبوعہ ۲۸ ستمبر ۱۸۷۳ء میں آرٹیکل لکھنے والے نے ہم کو دیسی مسلمانوں کو سخت متکبر اور متعصب کہا ہے اور یہی سبب ہم کو گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے کم فائدہ حاصل کرنیکا قرار دیا ہے. اس آرٹیکل کو پڑھ کر اول اول تو ہم کو بہت تردد اور خوف معلوم ہوا. تردد تو اس بات کا ہوا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے، مسٹر ڈی پی آئی۔

لہ یعنی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ۱۲۔

کا ! یا مسٹر سی ایس کا؟ اور خوف اس بات کا ہوا کہ اگر پچھلے کا ہو تو ایسا نہ ہو کہ وہ کبھی ہمارے ملک کا لفٹننٹ گورنر ہو جائے اور مسلمانوں کی زندگی اس کے ہاتھ میں پڑ جاوے۔ مگر چونکہ اس آرٹیکل کے مضمون اکثر وہ ہیں جو مدت ہوئی کہ ہم سن چکے تھے اس لیے وہ ہمارا تردد اور خوف دونوں جاتے رہے"۔

"مگر ہم کہتے ہیں کہ ہاں ہم (یعنی مسلمان) متکبر بھی ہیں اور متعصب بھی، پر کیوں نہ ہم ایسا طریقہ تعلیم اختیار کریں جس سے ہمارے تکبر اور تعصب میں بھی خلل نہ آوے اور ہم تعلیم بھی پاویں"۔

"انڈین آبزرور کا آرٹیکل لکھنے والا ہم کو طعنہ دیتا ہے کہ "خاص مسلمانوں کے کالج قائم کرنے کے لیے کافروں (یعنی انگریزوں) سے کیوں مدد لیجاتی ہے! اور یہ بھی لکھتا ہے کہ "اگر ایسا مدرسہ خود مسلمانوں ہی کی کوشش سے قائم ہوگا تو یہ ترقی و بہتری کی دلی خواہش کا ثبوت ہوگا، لیکن اگر لارڈ نارتھ بروک صاحب جیسے لوگوں کی سخاوت سے قائم ہوا تو کچھ دلی خواہش کا نشان نہ ہوگا" اگرچہ ایسا لکھنا ایک عیسائی کو خصوصاً اس قوم والے کو جس سے ہم نے مدد مانگی اور جو اپنے تئیں انسان کی خیر خواہ اور سچی دوست سمجھتی ہے، زیبا نہ تھا مگر ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے بالکل صحیح اور بالکل سچ ہے اور اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ درحقیقت وہ نہایت نالائق بے شرم بے حیا اور تمام دنیا کی قوموں میں ذلیل ہوگی جو اب بھی ایسے طعنے سن کر اس مدرسہ کے قائم ہو جانے میں دل و جان سے روپیہ سے اور کوشش سے مدد نہ کرے گی"۔

"انڈین آبزرور میں آرٹیکل لکھنے والا ہماری ناقص انگریزی کی ہنسی اڑاتا ہے

ل؎ یعنی سول سرونٹ ۱۲۔

مگر ہم کو اس سے کچھ رنج نہیں کیونکہ یہ جو کچھ ہے انڈین ایجوکیشنل سسٹم کی عمدگی کا ثبوت ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہماری یونیورسٹیاں اور ہمارے ملک کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کی ایسی ہی تعلیم ہے اور صرف ہماری ہی ایسی تعلیم نہیں بلکہ ہزاروں در ہزاروں کی ایسی تعلیم ہے اسی لیے اس سے بھاگتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں "

پھر دوسرے آرٹیکل میں اُسی انڈین آبزرور والے آرٹیکل کی نسبت ایک جگہ لکھتے ہیں "سبجیکٹ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان میں یہ سوال بحث میں آیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا اثر ایسا کیوں نہیں ہوتا جیسا کہ انگلستان میں ہوتا ہے؛ سو اس کا جواب انڈین آبزرور کا آرٹیکل لکھنے والا یہ دیتا ہے کہ "ان کو یعنی مسلمانوں کو، گورنمنٹ کی ذات سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سُور کے بالوں سے ریشم کی تھیلی بنا دے" پس اب ہم اپنی قوم سے پوچھتے ہیں کہ علم کے دیوتا نے ہم کو سور کا خطاب دیا ہے، آیا ہم کو اسی خطاب میں خوش رہنا چاہیے یا کوشش کر کے اور اپنی حالت کو درست کر کے دنیا کو بتلانا چاہیے کہ اس خطاب کا مستحق کون تھا؟"

"دوسرا جواب اسی سوال کا اُس آرٹیکل لکھنے والے نے یہ دیا ہے کہ "جس شے پر اس کا (یعنی تعلیم کا) اثر ہوتا ہے وہ دونوں ملکوں (یعنی ہندوستان اور انگلستان) میں مختلف ہے گو آلہ دونوں کا ایک ہی ہو سنگریزہ یا کنکر سے ایک روشن ہیرا یا لعل نہیں بن سکتا" پس اب ہم پوچھتے ہیں کہ آیا ہماری قوم کو سنگریزوں میں اور کنکروں میں پڑا رہنا اور ہر ایک کی ٹھوکریں کھانا اور دشنام سننا ہی پسند ہے یا اپنی حالت میں کچھ ترقی کرنے کا ارادہ ہے؛ یہ سچ ہے کہ جو شخص بدزبانی کسی کی نسبت استعمال میں لاتا ہے وہ خود اولاً اپنے آپ کو اُن سولائزڈ ثابت کرتا ہے۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ اُس آرٹیکل کا لکھنے والا ہم کو متکبر اور سخت متعصب بتاتا ہے حالانکہ وہ ہم سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، مگر ہم کو اس پر خیال کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ جو لفظ ہمارے دشمن نے بھی ہمارے حق میں کہے ہوں ان سے بھی ہم کو نصیحت پکڑنی چاہیے "

" ایک مقام پہ اُس آرٹیکل کا لکھنے والا لکھتا ہے "کمیٹی کو مناسب ہے کہ ... اس امر کی تفتیش کرے کہ آیا اُس قوم (یعنی مسلمانوں) میں کبھی کوئی بڑا فلسفی یا شاعر پیدا بھی ہوا ہے جو ایمان داری کے ساتھ اپنی نسبت خود یہ باتیں بیان کرے جو کمیٹی نے بیان کی ہیں " اگر اس عبارت کا یہ مطلب ہو کہ ہمارے ملک کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے وقت میں (یعنی ان کے طریقۂ تعلیم کے اثر سے) کوئی شخص ہماری قوم کا ایسا ہوا ہے یا نہیں! تو اس کا تو جواب صاف ہے کہ نہیں اور اگر کبھی کے لفظ سے غیر مقید زمانہ مراد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آرٹیکل کے لکھنے والے کو دوبارہ کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر ہسٹری اوف فلاسفی اور ہسٹری اوف اورینٹیل لٹریچر پڑھنی چاہیے "

انڈین آبزرور کے مذکورۂ بالا آرٹیکل میں جو سخت الفاظ مسلمانوں کی نسبت استعمال کیے گئے ہیں اور جن کا جواب سرسید کو بھی کسی قدر سختی کے ساتھ دینا پڑا ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۷۳ء تک اینگلو انڈینز کے خیالات مسلمانوں کی نسبت کیسے تھے اور وہ مسلمانوں کی قوم کو کس قدر ناقابل اور اُن کی تعلیم کے لیے کوشش کرنے کو کس قدر بے سود اور لاحاصل سمجھتے تھے اور مدرسۃ العلوم کی نسبت کیسے مخالفانہ خیالات رکھتے تھے۔ یا ایں ہمہ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ آج اُسی قوم کے تمام اعلیٰ افسر اور اعلیٰ سے اعلیٰ حکام اور ارکان سلطنت اس مدرسہ کے صرف مداح و ثنا خواں ہی نہیں بلکہ دل سے اس کے مددگار ہیں

اوراُس کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی نسبت اُن کے وہ خیالات نہیں رہے
جو اب سے ستائیس برس پہلے تھے تو ایک عجیب انقلاب معلوم ہوتا ہے اور تعجب
ہوتا ہے کہ سرسید کی کوشش، حسن تدبیر، صبر اور استقلال نے اس قلیل عرصہ
میں مدرستہ العلوم اور مسلمانوں کی حالت کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے.

سرسیّد کی کامیابی اور اُسکے اسباب

سرسید کو اپنے مقاصد میں جو غیر متوقع کامیابی گذشتہ تیس برس کے اندر اندر ہوئی وہ اس حد سے گذر گئی ہے کہ لوگوں کو باور کرانے کے لیے اس کا ثبوت دینے کی ضرورت ہو، پس بجائے اس کے کہ اُس کا ثبوت پیش کیا جائے اُس کے اسباب کا سُراغ لگانا بہتر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جو امر تیس برس پہلے محال معلوم ہوتا تھا اس قدر جلد وقوع میں آجانا بلاشبہ اُس کے اسباب کی عظمت پہ دلالت کرتا ہے اور چونکہ قوم کو ابھی سرسید جیسے مبت سے کامیاب شخصوں کی ضرورت ہے اس لیے امید ہے اُن کی کامیابی کے اسباب کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ سرسید کی کامیابی کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اُنھوں نے جتنے کام کیے وہ سب زمانہ کے مقتضا کے موافق کیے اور اس لیے زمانہ خود اُن کی تائید کرنے والا تھا۔ پس اُن کی کامیابی اُسی قدر تعریف کے لائق ہے جیسے اُس تیراک کی تیرائی جو دریا کے بہاؤ پر بے تکان تیرتا چلا جاتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس خیال میں کسی قدر غلطی ہے۔ زمانہ کا تقاضا اور چیز ہے اور زمانہ کا اقتضا اور چیز، بے شک زمانہ کا تقاضا یہی تھا کہ مسلمان اپنی حالت درست کریں، وقت کی ضرورتوں کو سمجھیں اور خوابِ غفلت سے بیدار ہوں مگر اُس کا اقتضا بالکل اس کے برخلاف تھا، اس کا اقتضا وہ تھا جو ملکہ ستیا سنے

سلیمانؑ کا پیغام سُن کر اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ "اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً" حکمران قوم جب مفتوح ہوتی ہے خواہ فاتح قوم دانشمند اور منصف ہو اور خواہ وحشی اور ظالم، دونوں صورتوں میں اُس کا میلان پستی اور تنزل کی طرف ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اُس کو درحقیقت گورنمنٹ نہیں گراتی بلکہ وہ آپ ہی اپنے بل میں گرتی چلی جاتی ہے۔ جس چال پر وہ قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف دوسری چال چلنا اُس کے لیے ایسا ہی دشوار ہوتا ہے جیسے کسی جسم کا اپنی حیّز طبیعی کے خلاف حرکت کرنا۔ مفتوح قوم کو گو کہ اُس کی اقبال مندی کا زمانہ بالکل ختم ہو گیا ہو، مدت دراز تک اقبال مندی کے خواب برابر نظر آتے رہتے ہیں اور اس کی امید دل کا طلسم بدستور بندھا رہتا ہے۔ اُن کو اپنی پستی اور تنزل کا شعور مطلق نہیں ہوتا اور اپنی حالت کی اصلاح کا کبھی بھول کر بھی اُن کے دل میں خیال نہیں گذرتا۔ اگر بالفرض اپنے تنزل پر متنبہ ہوتے ہیں تو اُس کو زمانہ کی ناانصافی اور اپنی حق تلفی پر محمول کرتے ہیں، اپنی نالائقی کی طرف ہرگز منسوب نہیں کرتے اسی بھلاوے میں وہ گرتے گرتے اُس گہرے گڑھے میں جا پڑتے ہیں جہاں سے اُبھرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ایسی ہی حالت تھی، وہ کچھ تو ڈیڑھ سو برس سے پست ہوتے چلے ہی آتے تھے اس پر طرہ یہ ہوا کہ واقعۂ ۵۷ء نے اُن کو اور بھی نیچے گرا دیا اب اُن کے اُبھرنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی تھی اور وہ وقت کچھ دور نہ تھا کہ امریکا اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی طرح ملک میں اُن کا عدم اور وجود برابر ہو جائے۔ پس اگر دنیا فی الواقع عالم اسباب ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اب تک جو کچھ اپنی پولٹیکل حالت میں ترقی کی ہے وہ صرف سرسید کی چہل سالہ کوششوں

کا نتیجہ ہے۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "غدر کے زمانہ میں اور اس کے بعد بہت مدت تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی رہی۔ اس خوفناک زمانہ کے تمام مکروہات اُن کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تعصب (یعنی انگریزوں کا) زیادہ تر بیجا تھا۔ مسلمانوں کو اس کا بہت رنج تھا اور یہ بات اُن کو بُری معلوم ہوتی تھی۔ بظاہر کسی شخص نے اُن کی حمایت کی ہامی نہیں بھری۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اس کی قدرت میں تھا اُس نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر بنا دیا۔"

تھیوڈور ماریسن اپنے اُس آرٹیکل میں جو سرسید کی وفات کے بعد مئی ۹۸ء کے کالج میگزین میں چھپا تھا، لکھتے ہیں کہ "غدر سے پہلے اور اُس کے بعد چند سال تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر اُن کو ترقی دیتے اور اُن کی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تھے۔ نہایت نمایاں انقلاب جو فی الحال اینگلو انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے یہ سرسید ہی کی تلقین کا نتیجہ ہے.... اُس نے مسلمانوں کے دل میں جہاں نفرت اور بدگمانی تھی وہاں اعتماد اور وفاداری کا درخت لگا دیا اور انگریزوں کو یقین دلا دیا کہ مسلمان وفادار ہیں۔"

اکیڈمی نام ایک ولایت کا اخبار مورخہ ۱۹، دسمبر ۱۸۸۵ء کرنل گریہم کی لائف اوف سید احمد خاں پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے "کم سے کم اس قدر تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی دنیا کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت کرنا نہیں چاہیے۔ کروسیڈ کا زمانہ گذر گیا۔ اب اسلام دوسری جانب جوش ظاہر کر رہا ہے۔ اگرچہ اولڈ فیشن مسلمان سولزیشن کی ترقی کے مخالف ہیں

مگر اُن میں ایک آزاد خیال گروہ بھی موجود ہے۔ یہ گروہ صرف ترکی ہی میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ اس ملک (یعنی انگلستان) کے لیے جو مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی کا مالک ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ اس امر کی نسبت عمدہ واقفیت حاصل کرے۔ اس سوال کے فیصلہ پر کہ آیا اسلام اور شائستگی باہم موافقت رکھتے ہیں یا نہیں، پانچ کروڑ آدمیوں کی آیندہ زندگی کا مدار ہے۔ کیا یہ آبادی (یعنی ہندوستان کے مسلمان) روز بروز مخالف ہوتی جائے گی؛ اس کے سرگروہ ممبر جہالت کے ساتھ کسی جگہ ہمدردی کریں گے تاکہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں میں جو اور ملکوں میں ہیں چلے جائیں؛ اگر ایسا ہے تو انگلستان جس قدر جلد مصائب کے مقابلے کے لیے تیار ہو اسی قدر بہتر ہے مگر اس معاملے میں کرنل گریہم کی کتاب "سید احمد خاں" نے ایک خفیہ روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جو مغربی خیالات کی ہمدردی کا ایک عجیب و غریب تماشا دکھاتی ہے جو ایک انگریزی زبان سے ناواقف شیخ العرب کے خون نے ظاہر کیا ہے۔

غرض کہ یہ خیال کرنا ٹھیک نہیں کہ سرسید کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اُن کی کوششیں زمانہ کے مقتضا کے موافق تھیں، بلکہ اُن کی کامیابی صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو کوششیں استقلال، دانائی اور راست بازی کے ساتھ کی جاتی ہیں وہ زمانہ کے اقتضا پر غالب آسکتی ہیں۔

سب سے بڑا ثبوت اس بات کا کہ زمانہ کا تقاضا جب تک کوئی زبردست ہاتھ اُس کی پشتی پر نہ ہو، کچھ نہیں کر سکتا، یہ ہے کہ مدت دراز سے گورنمنٹ ہندوستان میں تعلیم نسواں جاری کرنا چاہتی ہے اور بیس پچیس برس سے تمام تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں میں اس کا جوش پھیلا ہوا ہے۔ اخباروں اور میگزینوں میں

سب سے زیادہ اسی مضمون کا زور شور ہے، بیسیوں ناول اور رسالے اسی باب میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں، جا بجا اسی غرض سے کمیٹیاں قائم ہیں اس سے زیادہ زمانہ کا تقاضا اور کیا ہو سکتا ہے! مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج تک جیسی کہ چاہیے کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اس کا کوئی زبردست حامی مثل سید احمد خاں کے کھڑا نہیں ہوا

ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا اصل سبب یہ تھا کہ ان کی ذات میں وہ تمام خصلتیں اور اخلاق بالطبع موجود تھے جو ایک ریفارمر کی ذات میں جمع ہونے ضرور ہیں۔ ریفارمر کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز سچائی اور راستبازی ہے کہ جس بات کو وہ اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھے، اگرچہ ایک زمانہ اُس کا مخالف ہو، اس کے ظاہر کرنے میں کچھ پس و پیش نہ کرے۔ راستبازی کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے ریختہ کی چنائی جو عین برسات کے موسم میں کی جائے۔ راستباز آدمی کو بلاشبہ بہت سی مخالفتوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور اس لیے اُس کی کامیابی میں بہت دیر لگتی ہے، مگر جو ردّا ایک دفعہ رکھا گیا پھر اُس کو جنبش نہیں ہوتی، سرسید کو اپنی راستبازی کی بدولت بعض اوقات جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا بیان ہوا ہے، سخت خطرات پیش آئے ہیں مگر بہت جلد وہ تمام خطرے رفع ہو گئے اور راستی نے اپنا پائیدار نقش دلوں پر بٹھا دیا۔ استقلال جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "الصبر مفتاح الفرج" وہ بھی بغیر راستبازی کے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جس کو اپنے کام پر بھروسا نہیں ہوتا وہ کبھی اپنے ارادہ پر قائم نہیں رہ سکتا چنانچہ سرسید نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، سید مہدی علیخاں کو ولایت سے لکھا تھا کہ "جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے ووں ووں نیکی بڑھتی گئی ہے، پس اگر میرا کاربار سچا اور میری نیت نیک ہے تو انشاء اللہ تعالے اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا"

اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ میں سرسید کا رسوخ و اعتبار سب سے

پڑھ کر اُن کی کامیابی کا باعث ہُوا ہے۔ بلاشبہ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور اُس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں اس خیال کو ایک خاص حد تک صحیح مانا جاسکتا ہے مگر جس طرح سرسید کے رسوخ سے اُس کی تائید ہوئی ہے اسی طرح مزاحمت بھی کچھ کم نہیں ہوئی۔ اسی رسوخ و اعتبار کی بدولت ایک مدت تک سرسید کی نسبت لوگوں کو طرح طرح کی بدگمانیاں رہیں۔ ہزاروں آدمی یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائی یا لامذہب بنانا منظور ہے اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدہ کے لیے قائم نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔ اگرچہ اس خیال کا دوسرا جز صحیح تھا مگر پہلا جز اس لیے غلط تھا کہ حالت موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔

بہرحال سرسید کے رسوخ سے مدرسہ کو یقیناً بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے۔ خصوصاً سرجان اسٹریچی کی گورنمنٹ نے سرسید کا حوصلہ ہی نہیں بڑھایا بلکہ اُن کے ارادوں میں جان ڈال دی ہے اور جتنے لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب میں اور جتنے وائسرائے کالج کے قیام کے بعد آئے سب نے کالج پر مربیانہ توجہ مبذول رکھی ہے۔ مگر ریفارمیشن کے عظیم الشان کام میں، بجائے اس کے کہ یہ رسوخ ممد و معاون ہُوا ہو، اُس نے اور اُلٹی مزاحمت کی ہے۔ ہر ایک قوم اور خاص کر مسلمانوں کی قوم مذہبی خیالات کا مصلح اگر کسی کو تسلیم کرسکتی ہے تو اُس شخص کو کرسکتی ہے جس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہوں جو مذہبی تقدس کے لیے درکار ہیں نہ کہ ایسے شخص کو جس میں بظاہر اس قبیل کی کوئی حیثیت نہ پائی جائے بلکہ سرتاسر اس کی زندگی ایک دنیادار آدمی کیسی زندگی ہو خصوصاً سلطنت میں تقرب اور رسوخ پیدا کرنا عام اس سے کہ مسلمانوں کی ہو یا انگریزوں

کی. مذہبی تقدس کے بالکل خلاف سمجھا جاتا ہے باوجود اس کے سرسید نے لاکھوں مسلمانوں کے دل میں اپنی اکثر اصلاحیں متمکن کردیں پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ گورنمنٹ میں اُن کا رسوخ اور اعتبار مطلقاً اُن کی کامیابی کا باعث ہُوا ہے۔

لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا تو بھی اصل سبب اُن کی راستبازی اور سچائی ٹھہرے گی کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیٹو کا اس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا جب تک کہ اُس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر تایا نہ گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں۔

سب سے زیادہ اُن کے کاموں میں مدد اور اُن کے ارادوں کو تقویت اُن کے دوستوں نے دی ہے اور یہ بھی ایک نتیجہ اُن کی راستبازی اور خلوص کا تھا۔ فی الواقع سرسید کو محض اپنی صداقت اور بے ریا محبت کی بدولت ایسے سچے دوست اور اعوان و انصار ملے جو اُس زمانہ میں نادرالوجود اور عجائب روزگار سے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ سرسید کے اعوان و انصار اُن کو اپنا مذہبی پیشوا سمجھ کر اُن کے کاموں میں مدد دیتے تھے، سو اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا اُن کے دوستوں اور مددگاروں میں جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اُن کو اپنا مذہبی پیشوا جانتا ہو یا اُن کے تمام اقوال اور تمام رایوں کو تسلیم کرتا ہو۔ سرسید کے بہت سے دوست ایسے بھی تھے جن کو قومی معاملات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی بعض اُن کی کوششوں پر ہنستے تھے اور اُن کی جدوجہد کو رائیگاں سمجھتے تھے مگر ہر کام میں مدد دینے کو دل و جان سے حاضر تھے جب چندہ کی ضرورت ہوتی تھی پہلے دوستوں سے مانگا جاتا تھا پھر اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پسارا جاتا تھا۔ اگرچہ مقام اس بات کا مقتضی تھا کہ ان تمام بزرگوں نے جس ذوق و شوق سے سرسید کے کاموں میں مدد دی ہے اور جس

امنگ اور چاؤ سے مدرسۃ العلوم کے چندوں میں شریک ہوئے ہیں اور جو بیش بہا خدمتیں قوم کی اُن سے بن آئیں اُن کو مفصل بیان کیا جائے خصوصاً اس وجہ سے کہ سرسید کی آخری تمنا جو پوری نہ ہوئی، یہ تھی کہ ایک کتاب بطور تذکرۂ احباب کے اپنے قلم سے لکھ جائیں، مگر امید ہے کہ جو شخص مدرسۃ العلوم کی ہسٹری لکھے گا وہ اس فرض کو فراموش نہ کریگا کیونکہ یہ ذکر اسی موقع سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا صرف مددگار ہی نہ تھا بلکہ اس گاڑی کے ہانکنے میں گویا برابر کی جوڑ تھا، اگر اس موقع پر اُس کا ذکر قلم انداز کیا گیا تو ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائے گا۔ اُس شخص سے ہماری مراد محسن الملک سید مہدی علیخان ہیں جو تمام قوم کے اتفاق سے سرسید کے بعد اُن کے جانشین ہوئے ہیں۔ یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سرسید کو سمجھا، اُن کی سچائی کو پرکھا، اُن کے منصوبوں کی تماہ دریافت کی اور اُن کے مقاصد کی عظمت کا اندازہ کیا۔ اُن کا اس وقت ساتھ دیا جب کوئی ساتھی نہ تھا، اور اُس وقت مدد دی جب کسی سے مدد کی امید نہ تھی سرسید ولایت میں خطبات احمدیہ لکھ رہے تھے اور سید مہدی علی ہندوستان سے اُس کے لیے میٹریل بھیجتے تھے وہ ولایت میں اُس کو چھپوا رہے تھے اور یہ ہندوستان سے اس کی چھپائی کے لیے چندہ وصول کر کے روانہ کرتے تھے۔ جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کرنی چاہی اُس وقت اُن پر عجیب مایوسی کا عالم تھا، جو منصوبے دل میں باندھ رکھے تھے اُن میں سے کسی کے پورا ہونے کی امید نہ تھی۔ سید مہدی علی مرزا پور سے بنارس گئے اور سرسید کی ڈھارس بندھوائی چنانچہ کمیٹی بڑی دھوم دھام سے قائم ہوئی۔ جب کمیٹی نے اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مسلمان سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں کیوں نہیں پڑھتے، انعامی رسالے لکھوانے کا اشتہار دیا، تو سید

مہدی علی نے نہایت کوشش سے ایک مسرط ایسے لکھا جو سب رسالوں میں اول درجہ کا تسلیم کیا گیا اور پانسو کا انعام جس کے وہ مستحق تھے، اپنے سے نیچے درجہ کا رسالہ لکھنے والے کو دلوایا۔ جب تہذیب الاخلاق جاری ہوا اور سرسید نے ریفارمیشن کا کام علی الاعلان شروع کیا۔ سید مہدی علی پہلے شخص تھے جنھوں نے نہایت دلیری سے سرسید کی تائید میں مضامین لکھنے پر کمر باندھی جو معزز خطاب مولوی اور واعظ سرسید کو دے رہے تھے سید مہدی علی نے بھی اُن کا استحقاق پیدا کیا اور کفر کے فتووں کی بوچھاڑ جو اکیلے سید پر پڑ رہی تھی آدھی اپنے سر پر لی۔

سرسید کی تحریریں اکثر نشتر کا کام کرتی تھیں مگر سید مہدی علی کی تحریروں نے مرہم کا کام کیا۔ سرسید ہمیشہ مسلمانوں کو نفریں و ملامت کرتے تھے۔ اگلے علما کی غلطیاں ظاہر کرتے تھے، جو کچھ اپنی تحقیق ہوتی تھی، اکثر بغیر اس کے کہ سلف کے اقوال سے اس پر استشہاد کریں، حوالۂ قلم کر دیتے تھے۔ سید مہدی علی نے مسلمانوں کے اسلاف کے کارنامے بیان کر کے قوم کے دل بڑھاتے اور جو کچھ سرسید کی تائید میں لکھا مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے سے لکھا۔ اُن کے اکثر مضامین بجائے خود بڑے بڑے رسالے ہیں جو نہایت چھان بین اور تلاش کے بعد لکھے گئے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین لکھنے میں باوجود اس کے کہ اُن کی صحت ہمیشہ نازک حالت میں رہی ہے وہ اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ سرکاری کام میں حرج واقع ہونے لگا۔ سنا ہے کہ اُن کے بالا دست افسر کو جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے سرسید کو لکھا کہ سید مہدی علی کو سمجھاؤ وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوں ورنہ مجبوراً اُن کی نسبت رپورٹ کرنی پڑیگی۔

مدرسۃ العلوم کو جو مالی مدد انھوں نے اپنی جیب سے اور اپنی کوشش سے پہنچائی اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ سرسید سے کیا مدرسہ کے انتظام کے متعلق اور کیا مذہبی مسائل کے متعلق وہ اکثر اختلاف کرتے تھے مگر مخالفت کبھی نہیں کی، ہمیشہ سرسید

کا دل ہاتھ میں رکھا اور مدرسہ کی مصلحت اسی میں سمجھی کہ سرسید کی رائے کا ہر حال میں اتباع کیا جائے۔ اگر سرسید نے اُن کی رائے کے خلاف بھی کسی تجویز پہ زور دیا اُس کو بھی طوعاً و کرہاً منظور کر لیا اور یہ سمجھا کہ اگر ان کی رائے فی الواقع غلط ہے تو اس کا تدارک ممکن ہے لیکن اگر منازعتوں کے سبب مدرسہ کے کام سے اُن کا جی چھوٹ گیا تو اس کا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا۔

حیدر آباد سے آکر انھوں نے علیگڑھ ہی میں رہنا اختیار کیا اور بہت سے عملی کام مدرسے کے متعلق انجام دیے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ترقی دینے کی تدبیریں کیں اور اس کی طرف مسلمانوں کو خاص توجہ دلائی اور خود ہر ایک اجلاس میں نہایت مفید لکچر اور اسپیچیں دیں۔ پھر بمبئی میں جا کر وہاں کے مسلمانوں کو مدرسہ اور کانفرنس کی طرف متوجہ کیا یہاں تک کہ انھوں نے کانفرنس کو بمبئی میں بلایا مگر سرسید کے کبرسن کے سبب وہاں کانفرنس کا منعقد ہونا موقوف رہا۔ سرسید کی وفات سے پہلے وہ پھر علیگڑھ میں آئے اور ان کے اخیر دم تک وہیں رہے اور اس آخری رفاقت میں بھی دوستی اور محبت کا حق پورا پورا ادا کیا۔ سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی قومی خدمات میں ان سے ظہور میں آئی وہ اِس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اُس مرحوم کے بعد کوئی شخص محسن الملک سے زیادہ اُن کی جانشینی کے لیے مناسب نہ تھا۔ انھوں نے اپنی صحت اور طاقت سے بڑھ کر چندہ جمع کرنے میں کوشش کی اور توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔

باوجود ان تمام خدمات کے اپنے ہر ایک کام کو ہمیشہ سرسید ہی کی طرف منسوب کیا اور اپنے تئیں ایک مشین سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھا۔ اٹاوہ کے ایڈریس میں جب لوگوں نے اُن کی قومی خدمات کی تعریف کی انھوں نے اُس کے جواب میں صاف صاف کہہ دیا کہ اُن خدمات کو میری طرف منسوب کرنا تہمت ہے، اس تعریف

کا سید احمد خاں کے سوا کوئی مستحق نہیں. سر سید کے بعد اُن کا جانشین بننے کی جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے اُن کو مطلق خواہش نہ تھی مگر تقریباً تمام ٹرسٹی، تمام کالج اسٹاف، تمام کالج سٹوڈنٹس، صوبہ کے تمام اعلیٰ حکام اور افسر جو کالج کے بہی خواہ تھے، تمام ڈیلیگیٹ جو پچھلے سال بمقام لاہور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوئے، تمام مسلمان اخبار اور عموماً تمام مسلمان جن کو قومی معاملات سے دلچسپی تھی، سب اس بات پر متفق تھے کہ اُن کو کالج ٹرسٹیز کا سکرٹری بنایا جائے اس لیے اُن کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ اس جوئے کو اپنے کندھے پر رکھیں۔

الغرض سر سید کو ایسے دوستوں کا ملنا جن کا نواب محسن الملک کو ایک عمدہ نمونہ سمجھنا چاہیے، اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا اور یہ محض اُن کی راستبازی اور قوم کی سچی ہمدردی کا نتیجہ تھا کہ ایسے ایسے مرغ زیرک خود بخود آ کر جال میں پھنس جاتے تھے اور اُس زمانہ پر جو آزادی میں گذرا تھا افسوس کرتے تھے جیسا کہ نظیری نے کہا ہے۔ ؎

" نالہ از بہر رہائی نکند مرغ اسیر   خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود"

ایک اور خدا ساز تائید سر سید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان جنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی اور اس لیے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کو خیر مقدم کہنے کے لیے تیار بیٹھے تھے، سر سید کی منادی پر وہ اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی کیلئے دوڑتا ہے انھوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرسۃ العلوم کو مالی مدد پہنچائی بلکہ سچ یہ ہے کہ سر سید اور ان کے کاموں کی کسی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی۔ کالج میں انھوں نے ہر ایک صوبے سے زیادہ لڑکے تعلیم کے لیے بھیجے، ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انھوں نے سب سے زیادہ دلچسپی ظاہر کی، سر سید

کی ہر قسم کی اصلاحیں انھوں نے سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انھوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی، یہاں تک کہ ان کو زندہ دلانِ پنجاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ انھوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سرسید کو مسلمانوں کی طرف دنیوی ترقی کا خواستگار مگر دین کا مخرب نہیں ٹھیرایا بلکہ ان کو دنیا اور دین دونوں کا یکساں خیر خواہ اور خیر اندیش سمجھا، حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی داد جو قوم کی طرف سے سرسید کو ملنی چاہیے تھی اس کا حق پنجاب کے مسلمانوں کے برابر کسی صوبے سے ادا نہیں ہو سکا اور جو تقویت برٹش گورنمنٹ کی امداد اور حضور نظام کی فیاضی اور بعض دیگر ریاستوں کے عطیوں سے ہوئی پنجاب کے عام مسلمانوں نے اس سے کچھ کم تقویت سرسید کو نہیں پہنچائی

سرسید کی کامیابی کے اسباب میں اگر کالج اسٹاف کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ایک بہت بڑی ناانصافی ہوگی، خصوصاً یورپین اسٹاف کے بعض ممبروں نے باوجود غیر قوم اور غیر مذہب ہونے کے کالج کے انتظام اور اس کو ترقی اور فروغ دینے میں درحقیقت سرسید کے دست و بازو کا کام کیا ہے انھوں نے صرف اپنے منصبی فرائض پر جن کے لیے وہ بلائے گئے تھے بس نہیں کی بلکہ سرسید کے خاص مشن میں جس پر کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی، معتدبہ حصہ لیا ہے۔ انھوں نے کالج کو گورنمنٹ اور مسلمانوں کا معتمد علیہ بنایا اور اس کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا کیا جس کی وجہ سے سرسید کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی طرف سے بالکل مطمئن اور فارغ بال ہو گئے۔ انھوں نے اپنے اقوال اور افعال سے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی درماندہ قوم کے سچے خیر خواہ اور ان کی ترقی کے دل سے آرزومند ہیں۔ مگر درحقیقت یہ سید نتیجے اسی مرحوم کی راستبازی اور صاف دلی کے تھے اگر وہ یورپین اسٹاف پر پورا پورا اعتماد

نہ کرتے اور کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی باگ اُن کے حوالہ نہ کر دیتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ یوروپین پروفیسر اپنے معمولی فرائض سے ایک اینچ آگے بڑھنے کا ارادہ کرتے۔

اگر سرسید کی ذات میں صرف راستبازی ہی کی صفت ہوتی اور اس کے ساتھ فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نہ ہوتی تو شاید اُن کی کامیابی میں وہ زیادہ دیر لگتی بلکہ ممکن تھا کہ اُن کو اپنی کوشش کا پھل اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا مگر خوش قسمتی سے ان کے ظرف میں زہر و انگبین دونوں موجود تھے گو ان کی راست گوئی نے بہت سے لوگوں کو بدکا یا مگر فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نے ایک زمانہ کو اُن کی طرف جھکا دیا۔ انھوں نے ابتدا سے اخیر تک جس کام کے لیے چندہ کھولا اس میں سب سے پہلے خود سبقت کی اور اپنی بساط اور حیثیت سے مراتب بڑھ کر دیا۔ وہ ایک بانی مدرسہ کی نسبت اپنے ایک دوست کو ولایت سے لکھتے ہیں۔" افسوس کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ نہ فرمایا کہ خود بانی نے جو فضل الٰہی سے اپنے شہر کے تمام مسلمانوں میں زیادہ ذی مقدور ہیں، کس قدر روپیہ دیا۔ اُس وقت البتہ آپ کی لعنت ملامت محتاجانِ شہر پر، جو نان شبینہ کو محتاج ہیں، درست و بجا ہوتی ہیں سوسائٹی کے لیے سب سے بھیک مانگتا ہوں مگر دس ہزار کئی سو روپیہ مجھ فقیر نے اپنے پاس سے دیا ہے۔ پس ایسی حالت میں اگر میں آپ سے سو روپئے دینے کو کہوں تو کچھ مضائقہ نہیں۔"

اس کے سوا عزم جزم اور دلیری جو ہر کامیابی کی جڑ ہے اور دنیا کے تمام کامیاب شخصوں میں ہمیشہ دیکھی گئی ہے، سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت بڑھ کر تھی۔ وہ مشکل سے مشکل کام کو جب ضروری سمجھ لیتے تھے بغیر تردد اور تذبذب کے اس کو فوراً کر بیٹھتے تھے اور جب کسی کام

کے کرنے یا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے تھے پھر کبھی اُس میں پس و پیش نہ کرتے
اس کے سوا اُن میں اور اکثر خصوصیتیں ایسی تھیں جن کے بغیر کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے
سے بڑا کام دنیا میں انجام نہیں پا سکتا جیسے مستعدی، جفاکشی، فرائض کی پابندی، حزم و
احتیاط وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور خداداد قابلیت اُن کی فصاحتِ بیان تھی جس میں سچی ہمدردی کے
جوش نے کشش مقناطیسی پیدا کر دی تھی اور چھاپے کی آزادی نے اُس کے لیے
ہر ایک میدان صاف کر دیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا
اور گورنمنٹ کی طرف سے زبانوں پر مہر لگی ہوئی ہوتی تو سر سید کو اس طرح کھلے بندوں
اپنی رائیں ظاہر کرنے کا موقع نہ ملتا مگر یہ بات فراموش کرنی نہیں چاہیے کہ جس
وقت انھوں نے رسالہ اسباب بغاوت لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا وہ ایک ایسا
نازک وقت تھا کہ اس وقت کسی کو آزادانہ رائے ظاہر کرنے کی جرأت نہ تھی۔
چنانچہ کسی قدر اُن کو اپنی جرأت اور دلیری کا خمیازہ بھگتنا بھی پڑا۔ بعض جلیل القدر
انگریز اُن کے سخت مخالف ہو گئے جس سے کچھ دنوں وہ مارشل لا کی زد میں رہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا تو بھی شاید چشمہ اُبلے بغیر نہ رہتا۔

سرسید میں مختلف لیاقتوں کا جمع ہونا

ایک شریف اور لائق انگلشمین نے جب کہ سرسید زندہ تھے، ہمارے سامنے اُن کا ذکر کرتے وقت یہ کہا تھا کہ "یورپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن یا صنعت میں فرد کامل ہیں اور جن کا نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے لیکن ایسے جامع حیثیات اشخاص جیسے کہ سید احمد خاں ہیں، وہاں بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔" اسی طرح الہ آباد میں ایک عام جلسہ کے موقع پر ایک لائق اور فاضل پنڈت نے یہ الفاظ کہے تھے[1] کہ "ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خاں نہیں ہے، بلکہ اگر ہم بیس بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سید احمد خاں کے برابر نہیں ہو سکتے۔"

فی الحقیقۃ یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے کہ جس شخص کو تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اسکول کی ہوا تک نہ لگی ہو اور جس نے چالیس برس کی عمر تک تعلیم میں کسی قسم کا تجربہ حاصل نہ کیا ہو وہ تعلیمی معاملات میں ایسا امتیاز پیدا کرے کہ علمی دنیا میں اُس کو مسلمانوں کی تعلیم کا پروفنٹ خیال کیا جائے۔ یا جس شخص نے ایک ایسی سوسائٹی میں ہوش سنبھالا ہو جہاں دو سو برس سے کسی نے پالٹکس کا خواب تک

---

[1] خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ نے اپنی ایک تحریر میں یہ قول نقل کیا ہے۔

نہ دیکھا تھا، وہ بغیر اس کے کہ کسی پولٹیکل خدمت پر مامور رہا ہو انگلش گورنمنٹ میں ایک رکنِ سلطنت خیال کیا جائے یا جو شخص مذہبی تعلیم میں متوسط سے بھی کم درجہ رکھتا ہو اور جس نے علوم جدیدہ کا ایک حرف کسی استاد سے نہ پڑھا ہو وہ مذہب اور سائنس میں مصالحت کرانے کا بیڑا اٹھائے اور اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال جائے۔ اسی طرح اور مختلف لیاقتیں جو اس شخص کی ذات میں جمع تھیں ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں معلوم ہوتی جو تعلیم یا اکتساب سے حاصل ہوئی ہو۔

اگرچہ سرسید کی تمام لیاقتوں کا اصل مخرج ان کی غیر معمولی قابلیت اور استعداد تھی مگر اس قابلیت کو قوت سے فعل میں لانے والی زمانہ کی ضرورتیں اور ان ضرورتوں کا پورا پورا احساس اور قوم میں ضرورتوں کے رفع کرنے والوں کا قحط تھا جس نے سرسید کو اس معمار کی طرح جو تعمیر کے لیے آپ ہی اینٹیں پکائے آپ ہی مصالحہ تیار کرے، آپ ہی پاڑ باندھے آپ ہی ٹوکری ڈھوئے آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی عمارت چنے، ایک سرو ہزار سودا کا مصداق بنا دیا تھا۔ دنیا میں عموماً کام کرنے والے لوگ الگ ہوتے ہیں اور سوچنے والے الگ ایک مصنف مشکل سے معماری و سنگتراشی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ عمدہ لکھنے والے اکثر عمدہ بولنے والے نہیں ہوتے۔ مذہبی تحقیقات میں مصروف رہنے والوں کو ملکی معاملات سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے۔ مگر جہاں سب چیزوں کی ضرورت ہو اور ایک کے سوا کوئی اس ضرورت کا احساس کرنے والا نہ ہو وہاں سب کام اسی ایک کو کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کبھی ایک کام پر ہاتھ ڈالتے تھے کبھی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے، ایک زمانہ میں انھوں نے اردو ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، پھر اسی زمانہ میں اردو لٹریچر کی تاریخ لکھنے کے لیے میٹریل جمع کیا، اس سے پہلے وہ صوبۂ شمال مغرب میں ایک عظیم الشان

یتیم خانہ کی بنیاد ڈالنے والے تھے۔ انگریزی زبان سے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ کرنے کے لیے انھوں نے بڑے بڑے سامان کیے تھے، اگرچہ یہ سب کام ادھورے رہے مگر ان باتوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں قومی ضرورتیں ایک شخص کے سوا دوسروں کو محسوس نہیں ہوتیں وہاں ایک فرد واحد کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ سرسید کی فطرت میں مختلف بلکہ متضاد کاموں کے کرنے کی قابلیت تھی جس کی نسبت مسٹر آرنلڈ نے سرسید کی وفات کے بعد اپنی اسپیچ میں بمقام لاہور یہ الفاظ کہے تھے کہ "دنیا میں بڑے آدمی اکثر گذرے ہیں مگر اُن میں ایسے بہت کم نکلیں گے جس میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں جمع ہوں۔ وہ (یعنی سرسید) ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، تعلیم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا" اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ بقدر ضرورت اُن کی چند نمایاں لیاقتوں کا اس عنوان کی ذیل میں جدا جدا ذکر کریں۔

پالٹکس

اگرچہ بہ ظاہر سرسید کے پولٹکل ورکس میں چند تحریروں اور اسپیچوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا مگر درحقیقت جیسا کہ اُن کی بائیوگرافی سے ثابت ہوتا ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا یا کہا یا کیا اُس کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت کی اصلاح سے علاقہ رکھتا ہے اس شخص نے نہ انگریزی تعلیم پائی تھی جس کے بغیر انگریزی طرز حکومت کا ذہن نشین ہونا قریب ناممکن کے تھا اور نہ ملک میں کوئی نظیر کسی ایسے پولیٹیشن کی دیکھی تھی جس کی تقلید کچھ کام آتی اور نہ گورنمنٹ کی کسی ایسی خدمت پر مامور ہوا جہاں ملکی معاملات کا کچھ تجربہ حاصل

ہوتا۔ باوجود اس کے اُس نے اپنی مآل اندیش اور سلیم طبیعت سے خود ہی اس مشکل کو حل کر لیا اور ایک ایسا پولٹکل کورس اختیار کیا جو بالکل صحیح اور بے خطا تھا۔

وہ سلطنت مغلیہ کے ایک قدیم متوسل گھرانے کا ممبر تھا اور خود دارالخلافہ کی خاک سے پیدا ہوا اور قلعۂ معلّے کے سایہ میں نشو ونما پائی۔ اس لیے یہ ایک نیچرل بات تھی کہ فاتح کی حکومت وہ ایک ناگواری کی نظر سے دیکھتا۔ مگر اُس کی عقل اُس کی طبیعت پر غالب تھی، اس لیے قومی تعصبات اُس کو مغلوب نہیں کر سکے اُس نے دیکھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا اٹھ جانا کوئی اتفاقی یا غیر متوقع امر نہ تھا بلکہ فی الحقیقۃ اُن میں حکمرانی کی لیاقت باقی نہیں رہی تھی اور اُن کا دور پورا ہو چکا تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ ہندوستان پر کوئی دوسری قوم حکمراں ہو، اُس نے انگریزی طرز حکومت کو نہایت غور سے دیکھا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان کے حق میں جہاں مختلف مذہب اور مختلف نسل کی قومیں آباد ہیں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں جو بتیس دانتوں میں زبان کی مانند ہیں، کسی قوم کی حکومت انگریزی حکومت سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ پس بجائے اس کے کہ اُس نے برٹش حکومت کو ناگواری کی نظر سے دیکھا ہو، اُس کو مسلمانوں کی حکومت کا نعم البدل سمجھا اور اس کی خیر خواہی کو ملک اور قوم کی خیر خواہی کا ایک سب سے عمدہ ذریعہ خیال کیا۔

وہ جس قدر انگلش قوم کی دانشمندی اور شائستگی سے واقف تھا اُس سے زیادہ اُس کی ملکی اور جنگی طاقت سے باخبر تھا اس کو غدر کے نازک موقع پر جب کہ فی الواقع سلطنت کے ارکان متزلزل ہو گئے تھے اور بڑے بڑے سمجھدار آدمیوں کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی تسلط پھر قائم ہوگا، اگرچہ اپنی جان کے بچنے کی بہت کم امید تھی مگر انگریزی تسلط کے جلد از سر نو قائم ہو جانے

کا پورا یقین تھا۔ اُن کے ایک دوست جو اُس وقت بجنور میں تھے اُن کا بیان ہے کہ "عین اُس بدامنی کے وقت، جب کہ تمام روہیلکھنڈ میں کوئی یورپین یا یوریشین باقی نہ تھا، سید احمد خاں ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ کم و بیش ایک سال بعد تمام ملک میں انگریزی تسلط بدستور قائم ہو جائے گا، اور گورنمنٹ کے بے شمار خیر خواہوں میں کسی کے چہرے سے وہ اطمینان اور استقلال ظاہر نہیں ہوتا تھا جیسا سرسید کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا" ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے جب کہ تمام ضلع بجنور میں نواب محمود خاں کی دوہائی پھر رہی تھی، نواب کے منہ پر صاف کہہ دیا تھا کہ انگریزی عملداری جانے والی نہیں ہے، آپ ملک گیری کا خیال دل سے نکال ڈالیں اور جب کہ سرسید کا اثاث البیت اور کتابیں اور سب کچھ بجنور میں لُٹ چکا تھا اور جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، وہ تاریخ سرکشی بجنور کے لیے نہایت اطمینان کے ساتھ میٹریل جمع کرتے جاتے تھے اور روزانہ تمام حالات قلمبند کرتے تھے اور تمام تحریریں جو کہ وہ نواب یا چودھریوں کو لکھتے تھے یا جو اُن کے پاس سے وصول ہوتی تھیں، یا وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے سب بہم پہنچا کر اپنی کتاب میں درج کرتے تھے۔ ایسا اطمینان سوا اُس شخص کے جو ملکی معاملات میں پُرانا تجربہ کار ہو یا جس کی رائے ایسے امور میں فطرۃً سلیم واقع ہوئی ہو، دوسرے کو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

سرسید کی پولٹیکل قابلیت پر اس سے زیادہ اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ اُس نے غدر کے بعد اینگلو انڈین اخباروں اور اینگلو انڈین افسروں کی عام رائے کے برخلاف اپنی کتاب اسباب بغاوت میں نہایت زور شور کے ساتھ اس بات کی تردید کی کہ ۵۷ء کا غدر ایک ملکی بغاوت تھی یا اُس کی بنیاد برٹش حکومت کے خلاف کسی عام سازش پر تھی اور اس امر کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوا کہ

اس سرکشی کا اصل باعث محض سپاہیوں کی عدول حکمی تھی جس نے رفتہ رفتہ اُن عام غلط فہمیوں کے سبب جو گورنمنٹ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، ملکی بغاوت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اُس نے جو اسباب ان غلط فہمیوں کے بتلائے ان پر پارلیمنٹ میں مدت تک مباحثے رہے اور آخر کار اُن میں سے اکثر بالاتفاق تسلیم کیے گئے، یہانتک کہ گورنمنٹ نے اُن کا فوراً تدارک کیا۔

سرسید نے اس کتاب میں گورنمنٹ پر بہ نسبت نیشنل کانگرس کے کچھ کم نکتہ چینی نہیں کی مگر سرسید کی نکتہ چینی کئی باتوں میں کانگرس سے مختلف تھی۔ سرسید نے جو الزامات گورنمنٹ پر عاید کیے تھے اُن کی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ کے سوا کسی متنفس کو نہیں ہوئی اور کانگرس نے جو الزام گورنمنٹ پر لگائے اُن کی تمام ملک میں مناوی کی گئی۔ سرسید نے رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں دور کرنے میں کوشش کی اور کانگرس نے غلط فہمیاں پھیلانے میں۔ سرسید نے اُن باتوں کی خواہش کی جن سے تمام ملک کا فائدہ متصور تھا اور کانگرس نے زیادہ تر اُن باتوں پر زور دیا جن سے صرف تعلیم یافتہ جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سرسید کی تمام خواہشوں میں گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی مصالح ملحوظ رکھی گئی تھیں اور کانگرس کی اکثر خواہشیں گورنمنٹ کی مصالح ملکی کے برخلاف تھیں اسی لیے سرسید کی اکثر شکایتوں کا جو کہ اُس نے بغیر واحد اپنی طرف سے پیش کی تھیں، فوراً تدارک کیا گیا اور کانگرس کو، باوجودیکہ وہ تمام ملک کی قائم مقامی کا دعویٰ کرتی ہے، آجتک ایک بات[1] کے سوا جس کی بنیاد قانونی کونسل میں محض سرسید کی تحریک سے ۱۸۶۱ء میں پڑ چکی تھی کسی بات میں نمایاں کامیابی حاصل

---

[1] یعنی لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کا بذریعہ الکشن کے ممبر مقرر ہونا ۱۲

نہیں ہوئی چنانچہ اخبار سینٹ جیمس بجٹ میں سرسید کی کتاب پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کیساتھ ہوا ہے۔ بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوش اور اس کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت سے ساتھ کرتے ہیں۔"

ایک اور ثبوت سرسید نے اپنی پولیٹیکل قابلیت کا ۱۸۷۱ء میں اُس وقت دیا جب کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "اور انڈین مسلمانز" نے ہندوستان سے لے کر انگلستان تک تمام حکمراں قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ کے لیے بدگمانی کا بیج بو رہا تھا۔ وہ تیرہ برس سے برابر اس کوشش میں تھے کہ جو بے اصل شکوک وشبہات حکمراں قوم کے دل میں مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں اُن کو رفع کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو انگریزوں اور مسلمانوں میں صفائی اور خلوص اور دوستانہ میل جول کو ترقی دیجائے۔ مگر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اُن غلط فہمیوں کو اور تقویت دینے والی اور گویا کہ سرسید کی تیرہ برس کی کوشش کو برباد کرنے والی تھی۔ اگرچہ، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے سرسید کو اُس وقت کالج کی ابتدائی مشکلات کا سامنا تھا اور وہ رات دن اسی اُدھیڑ بُن میں مصروف رہتے تھے باوجود اس کے کتاب مذکور کو شایع ہوتا تھا کہ انھوں نے سب کام چھوڑ کر اس پر ریویو لکھنا اور پایونیر میں اُسکو چھپوانا شروع کیا۔ اس ریویو نے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں اور مسلمانوں کے مذہب سے اُن کی ناواقفیت انگریزوں کے دل میں تہہ نشین کر دی اور اس غلط خیال کو کہ اسلام بغاوت کی تعلیم دیتا ہے اور وہابی مسلمان گورنمنٹ کے لیے خطرہ کی چیز ہیں اُن کے دل سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ اُس نے اس غلط فہمی ہی کو رفع نہیں کیا بلکہ ضمناً یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایسی نازک حالت میں

جیسی کہ اُس وقت ہندوستان کی حالت تھی، ایسی تحریریں شائع کرنا جو حاکم و محکوم میں تفرقہ ڈالنے والی، حاکموں کے غصہ کو مشتعل کرنے والی اور محکوم قوم کو مایوس کرنے والی ہوں، سراسر مصالح ملکی کے برخلاف ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کا ریویو نکلنے کے بعد ڈاکٹر ہنٹر نے اس مضمون کے متعلق پھر سانس تک نہیں نکالی اور انگریزی اخباروں نے بجائے اس کے کہ سرسید کی تردید کرتے، نہایت شد و مد کے ساتھ اُن کی تائید کی اور اُس بےچینی کی حالت میں جو حکمراں گروہ میں عموماً پھیلی ہوئی تھی، سرسید کے ریویو کا نکلنا نہایت غنیمت سمجھا گیا۔

اگرچہ سرسید کی مذکورۂ بالا تحریروں سے ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوئے لیکن اُن کی اعلیٰ درجہ کی پولیٹیکل قابلیت کا بھید درحقیقت اینگلو اورینٹل کالج میں چھپا ہوا ہے۔ اگر کوئی اصلی چیز مسلمانوں کو پولیٹیکل بے وقعتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں اُن کا اعتبار زیادہ کرنے والی اور گورنمنٹ کو ہندوستان کی چھ کروڑ رعایا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہوسکتی ہے تو وہ یہی محمڈن کالج ہوسکتا ہے۔ اسی لیے پایونیر نے لکھا تھا کہ "سرسید احمد خاں جو ایک دوراندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اُس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید، بارآور اور نہایت زبردست پولیٹیکل طاقت کا خاتمہ ہوگیا جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کردیا تھا" اور اسی بنا پر لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں نے ان کی وفات کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی پولیٹیکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا تھا اور اسی وجہ سے مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ

نے کالج کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ "وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولیٹیکل جوش پھیلانے والا ہے" اور اسی واسطے سر آکلنڈ کالون نے اپنی اسپیچ میں اُن تدبیروں کی نسبت جو سرسید نے رسالۂ اسباب بغاوت میں رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے بتائی تھیں، یہ الفاظ کہے تھے کہ "انھیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انھیں خیالات کی دوسری صورت علیگرمھ کالج ہے۔"

سرسید کا سب سے اخیر کام ملکی معاملات کے متعلق مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے روکنا تھا جس کا مفصل حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور جس کے اعادہ کی اب ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم کو اُن کی ایک لطیف تحریر دستیاب ہوئی ہے جو انھوں نے لندن میں ایک بڑے عالی مرتبہ انگریز کو کسی وقت لکھ کر بھیجی تھی اور جس سے ملکی معاملات کے متعلق اُن کی اصلی رائے ظاہر ہوتی ہے اُس چٹھی کے چند فقرے اس مقام پر نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں جن سے سرسید کا ایک بہت بڑا اسٹیٹسمین ہونا ثابت ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ "میں مسلمان ہوں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں انھیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں، کوئی اور اُن پر حکومت کرے۔ اس وقت تک اہل عرب آزاد ہیں اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اونٹ چراتے ہیں،

چو پر زندگی بسر کرتے ہیں، اونٹنیوں کا دودھ پیتے ہیں اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔"

"ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے، وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے ایک پریزیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اُس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکھٹی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہو جانے کسی شخص کے اُس کی جائیداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جاوے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائیداد کیوں نہ ہو وہ بعد دو نسلوں کے یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جاوے گی۔ پس میں دونوں طرح کیا بہ لحاظ مذہب اور کیا بہ لحاظ خون کے ریڈیکل ہوں۔"

"لیکن ہمارا مذہب، جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کیے، اُس نے اور باتیں بھی سکھلائی ہیں، ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، ملک میں امن قائم رکھتی ہے اور ہماری جان اور مال کو محفوظ رکھتی ہے جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے، تو اُس حالت میں ہم کو اُس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں اُن پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیے جب کہ زمانہ کی حالت اُن کے عمل میں لانے کے موافق ہو نہ کہ اُس حالت میں جب کہ زمانہ کے حالات

اُن کے موافق نہ ہوں، مثلاً جب کہ اُن کے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قائم رہنے میں فرق آوے یا اُس کو کمزور اور ضعیف کر دے میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ خواہ وہ کنسرویٹو ہوں، خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل، سب اس اصول کو قبول کریں گے۔"

یہی خیالات جو اس تحریر میں درج ہیں سرسید نے کانگرس کی مخالفت کرنے سے پانچ برس پہلے ممبری کونسل کے زمانہ میں لارڈ رپن کے سامنے اپنی اسپیچ میں، جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے، اُس وقت ظاہر کیے تھے جبکہ کونسل میں سلف گورنمنٹ کے قانون کا مسودہ پیش تھا۔ اُس اسپیچ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ریپرزنٹیٹو اصول کی اُسی حالت میں پسند کرتے تھے جب کہ اُس کے جاری کرنے سے ملک میں سوشل اور پولیٹیکل خطرات کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ پس جو لوگ اُن کی پچھلی تحریروں کو حال کی تحریروں کے خلاف سمجھتے ہیں یہ اُن کی سمجھ کی غلطی ہے۔ وہاں اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں قومی اختلافات کا خیال زیادہ تر اُن کو اُس وقت پیدا ہوا جب کہ ۱۸۶۷ء میں مسلمانوں کے خلاف شمال مغرب کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کی طرف سے نہایت سرگرمی کے ساتھ اس باب میں کوشش شروع ہوئی کہ تمام سرکاری دفتروں اور کچہریوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کی جگہ ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ پھر جس قدر ہندوؤں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مخالفتیں ظہور میں آتی گئیں اُسی قدر وہ خیال زیادہ پختہ ہوتا گیا اور آخرکار اُن کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت اس قابل نہیں ہے کہ اُس میں ریپرزنٹیشن کے اصول پر عملدرآمد ہو سکے۔

اول اول وہ گورنمنٹ کی خود مختاری کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ

۱۸۶۶ء میں جب کہ انھوں نے علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ اُس موقع پر ان کی اسپیچ کے ابتدائی الفاظ یہ تھے "میں تم سے اُس طوائف الملوکی کے زمانہ کا ذکر نہیں کرتا جو اٹھارھویں صدی میں تھا، بلکہ میں آپ کو اُس تاریخانہ زمانہ کی یاد دلاتا ہوں جب کہ ہندوستان ایک سلطنت شخصیہ کی حکومت میں تھا، ایک بادشاہ یا راجہ کروڑہا مخلوق خدا پر حکمراں تھا۔ اُس کی حکومت، بہ نسبت اس کے کہ کسی قانون عقلی یا نقلی کے تابع ہو، زیادہ تر اُس کی مرضی، خوشی، طبیعت اور غیظ و غضب کی تابع ہوتی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے اپنے مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں یہ کلمے بہت سنے ہوں گے کہ "مالک رقاب الامم" حالانکہ بادشاہ یا گورنمنٹ کو ایسا کہنا درحقیقت اُس کی نسبت تمام دنیا کی بُرائیوں کا منسوب کرنا ہے......... کچھ عجب نہیں کہ تم میں سے اکثر ایسے ہوں کہ اب تک اُس پُرانے زمانے کو یاد کرتے ہوں مگر جب کبھی تمہارا دل انصاف اور اخلاق کی طرف توجہ کرے گا تو تم خود اُس زمانہ کے نقصانوں اور اس وقت کی حکومتوں کی بُرائیوں کا اقرار کروگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس زمانہ کی حکومتیں نہ مسلمانوں کی شرع کے مطابق تھیں اور نہ ہندوؤں کے دھرم شاستر کے مطابق...... بڑا اصول اُن وقتوں کی حکومتوں کا یہی تھا کہ جو زبردست ہو وہ کمزور پر غالب رہے اور جس طرح چاہے زیادتی اور جبر اور غصب سے صرف اپنے عیش و آرام کے لیے زیردستوں کے حقوق پر تصرف کرے۔ پس ایسی حکومتوں کو بجز اُن غاصب شخصوں کے، جن کا کام اُس وقت میں بنا ہُوا تھا، اور کون پسند کرسکتا ہے۔"

سرسید کی یہ باتیں صرف زبانی ہی نہ تھیں بلکہ غدر کے بعد انھوں نے اس بات کا عملی ثبوت بھی دیا تھا کہ جہاں انتظام ملک کا مدار قانون پر نہیں

بلکہ زیادہ تر حکام کی زبان سے موجود ہاں رہنا وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ غدر کے بعد) جبکہ قسمت دہلی صوبۂ شمال مغرب سے نکال کر صوبۂ پنجاب کے ساتھ ملحق کی گئی، انھوں نے دہلی کی سکونت فوراً ترک کر دی اور اپنے تمام بڑے بڑے کاموں کا مرکز علیگڑھ کو قرار دیا، یہاں تک کہ ۱۸۶۶ء میں جب کہ سر ڈونلڈ مکلوڈ صاحب لفٹینٹ گورنر صوبۂ پنجاب نے دہلی میں دربار کیا جس میں سرسید کو بھی علیگڑھ سے بلایا گیا تھا، تو سرسید سے پرائیوٹ ملاقات کے وقت صاحب ممدوح نے اس بات کی سخت شکایت کی کہ تم نے سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ میں جا کر قائم کی اور اپنے قدیم وطن دہلی کو اس کے فوائد سے محروم رکھا۔ سرسید نے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو جیسی کہ وہ اب ہے ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ سمجھتا ہوں اور اسی لیے جب کہ قسمت دہلی پنجاب میں شامل کی گئی میں دہلی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسی کے قریب قریب اُنھوں نے ۱۸۶۹ء میں ڈی فنز پیئرک صاحب سے جو دلی میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے اور آخر کو پنجاب کے لفٹینٹ گورنر ہوئے، انگلستان جاتے ہوئے جہاز میں تقریر کی تھی جس کا ذکر انھوں نے اپنے سفر نامہ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ ایک دن پنجاب کے انتظام کی بھلائی برائی کا ذکر آ گیا، میں نے کہا ہاں ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزار درجہ بہتر ہے، لیکن شاید پنجاب کے لوگ اس سے خوش ہوں کیونکہ اُن کو آگ (یعنی سکھوں کی عملداری) میں سے نکال کر دھوپ میں بٹھایا ہے، مگر ہم لوگ اس کو پسند نہیں کرتے ......

جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں جہاں اور سزائیں اہل دہلی اور اُس کے متعلق اضلاع کو دی گئیں منجملہ انھیں سزاؤں کے ایک

یہ بھی سزا ہے کہ دہلی اور اُس کے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا اور بےسے قانونی ملک بنا دیا گیا۔"

اس کے بعد وہ سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ "حقیقت میں اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیاں ہیں جو ہزاروں بُرائیوں کے ساتھ اگلے زمانہ کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں اور جن سے اُن بُرائیوں کا علاج ہوتا تھا۔

ع چو رگ زن کو جراح و مرہم نہ ہست

اب اُن کا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک گورنمنٹ جیسی کہ قدیم سے تھی، زیادہ تر مفید ہوگی وہ نہایت غلطی پر ہیں۔"

لیکن آخر کار اُن کو یقین ہو گیا کہ جب تک نسل انگلستان کے ہندوستان کی تمام قومیں مل کر ایک قوم نہ بن جائیں جو قریب ناممکن کے ہے، اُس وقت تک ایک خالص کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ ہندوستان کی حالت کے مناسب ہرگز نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ جو اسپیچ انھوں نے قانون سیلف گورنمنٹ پر لارڈ رپن کے عہد میں کی تھی اُس میں انھوں نے نہایت مدلل طور پر اس مطلب کو بیان کیا تھا اور اصل مقصد اُس اسپیچ کا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ تھا کہ تمام ہندوستان کے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث نومنیشن سے مقرر کیے جائیں۔ کیونکہ لارڈ رپن اضلاع متوسط کے سوا باقی صوبوں میں کل ممبر الکشن سے مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آخر کار جیسی کہ سرسید کی رائے تھی وہی قاعدہ تمام صوبجات کے لیے مقرر کیا گیا جو اضلاع متوسط کے لیے قرار پایا تھا اور اسی قاعدے کی بدولت تمام بورڈوں میں

کم و بیش مسلمان ممبروں کی صورت آج تک دکھائی دیتی ہے ورنہ خاص خاص مقامات کے سوا کسی بورڈ کی ممبری پر ان کی شکل نظر نہ آتی۔

اگرچہ اکسٹرا اسسٹنٹی اور منصفی کے لیے پنجاب میں مقابلہ کا امتحان نیشنل کانگرس کے قائم ہونے سے پہلے جاری ہو چکا تھا اور جس وقت سر سید نے کانگرس کے خلاف لکھنؤ میں اسپیچ دی اس وقت جو نتائج اس قاعدے سے مسلمانوں کے حق میں مترتب ہونے والے تھے وہ ظہور میں نہیں آئے تھے مگر سر سید نے اُسی وقت اس نقصان کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا جو اس قاعدے سے مسلمانوں کو پہنچنے والا تھا۔ چنانچہ پنجاب میں باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد ہندو قوموں سے بہت زیادہ ہے ۱۸۸۳ء سے ۹۳ء تک اکسٹرا اسسٹنٹی میں منجملہ ۲۵ کے صرف سات مسلمان کامیاب ہوئے اور منصفی میں منجملہ ۲۷ کے ایک مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور اگر دونوں عہدوں کا مدار محض مقابلہ کے امتحان پر ہوتا اور کچھ عہدے نومنیشن کے ذریعہ سے مقرر نہ کیے جاتے تو منصفوں میں اب تک شاید ہی کوئی مسلمان نظر آتا اور اکسٹرا اسسٹنٹی پر بھی خال خال مسلمان باقی رہ جاتے۔ علیٰ ہذا القیاس وائسرائے کی قانونی کونسل میں اگر نومنیشن کا اختیار گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں نہ رکھتی تو ایک مسلمان کو بھی کونسل کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ اسی قسم کے خیالات تھے جن کی وجہ سے سر سید نے مسلمانوں کو نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے روکا اور اسی لیے انھوں نے قانون سیلف گورنمنٹ کے مسودہ پر اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ جب تک ہندوستان کی حالت مثل انگلستان کے نہ ہو جائے، جہاں عیسائیوں کو یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ تامل نہیں ہوتا اس وقت تک انگلستان سے ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں بڑے بڑے مشکلات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

پولیٹیکل ایجیٹیشن کی نسبت سرسید کی یہ رائے تھی کہ اُس کے بداثر سے کوئی گورنمنٹ خواہ وہ رپبلک ہو یا پارلیمنٹری اور یا مانرکی، محفوظ نہیں رہ سکتی رپبلک گورنمنٹ میں اس کا لازمی نتیجہ بشرطیکہ ایجیٹیشن کو پوری قوت حاصل ہو جائے، پریزیڈنٹ کی تبدیلی ہے اور پارلیمنٹری گورنمنٹ میں وزرا کی تبدیلی اور اگر وہ گورنمنٹ مانرکی ہے تو اس کا اثر سیدھا گورنمنٹ تک پہنچتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایجیٹیشن کرنے والے اس کو تبدیل نہیں کر سکتے تو کم سے کم اُس کی تبدیلی کی خواہش اُن کے دل میں ضرور ہوتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ گورنمنٹ ظاہر ہے کہ نہ رپبلک ہے اور نہ پارلیمنٹری اور اس لیے اس کو بجز ایک شائستہ اور مہذب مانرکی ہونے کے جو ملک میں امن رکھنا اور رعایا کے حقوق کو انصاف اور نیک دلی سے فیصل کرنا چاہتی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، پس ایک ایسی گورنمنٹ کی پالیسی کے برخلاف، جیسی کہ ہندوستان کی گورنمنٹ ہے، اگر کوئی ایجیٹیشن پھیلایا جائے اور اُس میں کامیابی نہ ہو تو غور کرنا چاہیے کہ رعایا کا خیال کس طرف مائل ہو گا؟ کیا ان کا خیال اس طرف مائل ہو گا کہ کونسل تبدیل ہو جائے یا موجودہ گورنر جنرل کی جگہ کوئی دوسرا گورنر جنرل بھیجا جائے؟ ہرگز نہیں بلکہ خود گورنمنٹ سے ناراضگی کا پھیلنا اس کا نتیجہ ہو گا۔ اگرچہ ناراضگی پھیلانے والے گورنمنٹ کے تبدیل کرنے پر کچھ قابو نہ رکھتے ہوں مگر گورنمنٹ سے ناراضگی کا پھیلنا خود گورنمنٹ کے لیے ملک کے لیے اور رعایا کیلیے شدید نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

سرسید ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "سلطنت شخصی ہو یا جمہوری، ایک امر میں دونوں کا اصول ایڈمنسٹریشن متحد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی گورنمنٹ کو جس طرح ہو سکے قائم اور مضبوط رکھنا سب سے مقدم اور سب سے بڑا انصاف ہے اور اس کے بعد رعایا کے

واجبی حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ پہلے امر کے متعلق ایک مہذب سلطنت یا سلطنت جمہوری بھی وہی کرتی ہے جو ایک نامہذب سلطنت یا شخصی سلطنت کرتی ہے، کوئی نظیر دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ ایسے وقت میں ایک مہذب یا جمہوری سلطنت نے وہ نہ کیا ہو جو ایک نامہذب یا شخصی سلطنت نے کیا ہو۔"

اُن کا قول تھا کہ اُن بادشاہوں میں سے جو ظالم کہلاتے ہیں دو ایک کے سوا جو درحقیقت مجنون تھے، کسی بادشاہ نے ظلم کرنے کے ارادہ سے ظلم نہیں کیا، بلکہ صرف اس خیال سے کیا کہ ویسا کیے بغیر اُن کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُن کے اس خیال اور اندازے میں غلطی ہو۔

اُن کی رائے تھی کہ گورنمنٹ کا اچھا یا بُرا ہونا درحقیقت کوئی اصل چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز رعایا کا بُرا یا اچھا ہونا ہے۔ اگر رعایا اچھی اور شائستہ ہے تو گورنمنٹ کو خواہ مخواہ شائستہ بننا پڑتا ہے اور اگر رعایا شائستہ نہیں ہے تو گورنمنٹ کو بھی ویسا ہی بننا پڑتا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو اُن کی بڑی نصیحت یہی تھی کہ اگر انگریزی حکومت میں عزت سے رہنا چاہتے ہیں تو تعلیم اور سویلزیشن میں ترقی کریں اور عزت حاصل کرنے سے پہلے اس کا استحقاق پیدا کریں۔

اُن کی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن وامان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انھوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی، اور نہ مکر و فریب سے۔ بلکہ درحقیقت

ہندوستان کو کسی حاکم کی اُس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی سو اُسی ضرورت نے ہندوستان کو ان کا محکوم بنا دیا۔"

انھوں نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا ہے کہ "میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہواخواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔"

اگرچہ سرسید کو مسلمانوں نے عموماً اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا لیکن شاید ہندوستان میں ایسا ایک مسلمان بھی نہ ہوگا جو ملکی معاملات میں ان کو قوم کا لیڈر نہ سمجھتا ہو اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ سرسید کی ایک آواز پر، باستثنا معدودے چند، ہندوستان کے تمام مسلمان کیا سنّی، کیا شیعہ، کیا وہابی، کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا ان پڑھ، کیا وہ لوگ جو ان کی پارٹی میں گنے جاتے تھے اور کیا وہ جماعت کثیر جو ہر بات میں ان کی مخالفت کرتے تھے سب نے بالاتفاق نیشنل کانگرس سے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک ان کا اس میں شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لکھو کھہا مسلمانوں نے ان کا غذوں پر آنکھیں بند کرکے دستخط کر دیئے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کے اظہار کے لیے ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔

تعلیم

سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے جو غیر معمولی کوششیں

کی ہیں اُن کی تفصیل پہلے اور دوسرے حصہ میں کافی طور پر بیان ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف اُن بڑی بڑی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جن سے تعلیمی معاملات میں اُن کی عالی دماغی، حسن تدبیر اور اُصول اشاعت تعلیم سے ایک قدرتی مناسبت پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے مسئلہ پر کبھی نظام تعلیم (ایجوکیشنل سسٹم) کے لحاظ سے اور کبھی طریقۂ تعلیم کے لحاظ سے اور کبھی دیگر حیثیتوں سے بحث کیجاتی ہے مگر سب سے مقدم اور مہتم بالشان حیثیت جس سے تمام حیثیتیں متفرع ہوتی ہیں یہ ہے کہ کسی قوم میں ایک اجنبی اور غیر مانوس تعلیم جاری کرنے کی کیا سبیل ہے!

جو قوم ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ایک ایسی تعلیم کی پابند چلی آتی ہو جس میں عقلی اور نقلی دونوں تعلیموں نے مل جُل کر ایک مقدس مذہبی تعلیم کی بلکہ خود مذہب کی شکل اختیار کر لی ہو، اُس قوم میں ایک نئی قسم کی تعلیم کا جاری کرنا، جو مضامین تعلیم اور ذریعۂ تعلیم دونوں کے لحاظ سے بالکل اوپری اور غیر مانوس ہو، بعینہٖ ایسا ہے جیسے کسی قوم میں، جو اپنے مذہب کی سخت پابند ہو، ایک نئے مذہب کو جاری کرنا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۳۵ء میں جب گورنمنٹ نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تو مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بذریعۂ عرضداشت کے یہ شکایت پیش کی کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ برخلاف اس کے ہندؤوں نے اس واقعہ سے گیارہ برس پہلے جب کہ گورنمنٹ نے اُن کے لیے سنسکرت کالج قائم کرنا چاہا تو اس سے ناراضی ظاہر کی اور انگریزی کالج قائم کرنے کے لیے گورنمنٹ سے اصرار کیا، کیونکہ اول تو اُن کے ہاں

مذہبی تعلیم صرف برہمنوں کے خاص خاص افراد ہیں محدود تھی اور باقی تمام ہندو قومیں مسلمانوں کے عہد میں دنیوی ضروریات کے لیے ایک غیر قوم کی زبان سیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ دوسرے جیسا کہ سر جان اسٹریچی نے اپنی کتاب انڈیا میں لکھا ہے، نہ ہندو مذہبی تعلیم کے خواہشمند تھے اور نہ اُن کا مذہب ایسا تھا جس کی تعلیم ہو سکے۔

بہرحال مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا جاری کرنا ایک نہایت مشکل کام قریب ناممکن کے تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۷ء سے، جبکہ کورٹ اوف ڈائرکٹرز کے ایک نامور ممبر چارلس گرانٹ نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے کی صلاح دی تھی، اس وقت تک جبکہ ۱۸۷۰ء میں سرسید نے کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی، گورنمنٹ کی تمام تدبیریں اور تمام کوششیں، جو ہندوستان میں بغرض اشاعت تعلیم کی گئیں، مسلمانوں کے حق میں بے سود ثابت ہوئیں، علاوہ طرح طرح کی ترغیبوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم کی اشاعت کے لیے وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں، خاص مسلمانوں کے چند معقول اوقات گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھے جن کو وقف کرنے والوں نے تعلیم کے لیے مخصوص کیا تھا، جیسے بنگال میں محسن فنڈ اور اضلاع شمال مغرب میں نواب فنڈ، مگر اُن سے بھی زیادہ تر غیر قومیں مستفید ہوتی رہیں۔ باوجودیکہ ۱۸۵۸ء میں ہائی ایجوکیشن کے لیے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں مگر ۱۸۷۵ء تک تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے مشکل سے اتنی ہوگی جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔

سرسید کو ۱۸۵۸ء میں جبکہ وہ بجنور سے مراد آباد بدل کر گئے، تعلیم کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اس زمانہ سے لے کر اس وقت تک جبکہ کالج نے نمایاں

ترقی کرلی۔ اُن کے تمام کاموں میں جو تعلیم کے متعلق انھوں نے انجام دیے ایک
خاص ترتیب پائی جاتی ہے جس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے
کہ اس شخص نے ابتدا ہی میں وہ تمام مشکلات جو وقتاً فوقتاً پیش آنے والی
تھیں اور ہر ایک مشکل کے ساتھ اس کا حل بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ سب
سے پہلے اُن کو تعلیمی معاملات پر خود غور کرنا اور تعلیم کے متعلق کسی قدر تجربہ
حاصل کرنا ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے اول اسی غرض سے دو اسکول
پبلک چندوں سے قائم کیے جن سے لوگوں کو اُس دلچسپی کا جو اُن کو بہ نسبت
سرکاری مدرسوں کے اپنے پرائیوٹ اسکولوں کے ساتھ بالطبع زیادہ ہوتی
ہے، بخوبی اندازہ ہو گیا اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر مسلمانوں[1] کو کچھ دلچسپی
ہو سکتی ہے تو خاص کر اُسی کالج سے ہو سکتی ہے جو قومی چندے سے قائم
کیا جائے۔ اس کے بعد سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور یہ خیال کیا کہ شمالی
ہندوستان کے باشندے، کیا ہندو اور کیا مسلمان۔ انگلش لٹریچر اور مغربی
علوم کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں، پس تاوقتیکہ دیسی زبان کے ذریعہ
سے اُن میں یورپین سائنس اور لٹریچر کا مذاق پیدا نہ کیا جائے اس وقت
تک انگریزی تعلیم کا ذوق و شوق ان میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی مقصد کے
لیے انھوں نے علاوہ کتابوں کے ترجمہ کرانے کے سوسائٹی سے ایک اخبار

---

[1] ۱۸۸۴ء میں جبکہ سرسید پہلی ہی بار چندہ کے لیے لاہور گئے ہیں اس وقت انھوں نے راقم کے سامنے بابو نوین چندر کے ایک سوال کے جواب میں یہ کہا تھا کہ صرف اس خیال سے کہ یہ کالج خاص مسلمانوں کے لیے انھیں کے روپئے سے قائم کیا جاتا ہے ایک طرف تو مسلمانوں میں اور دوسری طرف اُنکی ریس سے ہندوؤں میں توقع سے زیادہ جوش پیدا ہو گیا ہے۔ اور پھر خان بہادر برکت علی خاں سے پوچھا کہ کیوں حضرت اگر یہ قومی کالج نہ ہوتا تو آپ ہماری مدارات اسی جوش محبت کے ساتھ کرتے۔ انھوں نے صاف کہا کہ ہرگز نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اپنے کام کے شروع ہی میں اس قومی فیلنگ سے بخوبی واقف تھے ۱۲۔

نکالا جس میں بے شمار علمی اور لٹریری مضامین انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے اور جس نے فی الواقع اُردو لٹریچر کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور انگلش لٹریچر کی عظمت ہزاروں کے دل میں جو سلیم الطبع تھے، تہ نشین کر دی، پھر زیادہ تجربہ اور زیادہ بصیرت حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ولایت کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر کیمبرج یونیورسٹی وراُس کے تمام انتظامات کو خود جا کر دیکھا اور اُس کے مقابلہ میں جو نقص ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں معلوم ہوئے اُن پر ایک پمفلٹ لکھ کر انگلستان ہی میں شایع کیا، کیونکہ سرسید کا اصل مقصد جو پورا نہ ہوسکا، ہندوستان میں واپس آکر ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور اس لیے ضروری تھا کہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں جو نقص تھے ان کو ظاہر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں ایک جُدا یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت ثابت ہو۔ پھر ہندوستان میں پہنچتے ہی اُنھوں نے ایک طرف تو کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جس کی تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں سے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں رفع نہیں ہوسکتیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو جگانے کے لیے ایک ماہواری رسالہ جاری کیا جس نے چند روز میں ایک مردہ قوم میں حرکت پیدا کر دی۔

جب کالج قائم کرنے کا ارادہ ہوا اُس وقت ان کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا تھا۔ اولاً مسلمانوں سے جو قومی چندوں کے مفہوم سے ناواقف اور تعلیم سے متنفر بلکہ اس کے مخالف تھے، چندہ وصول کرنا تھا۔ پھر جو موقع کالج کے لیے تجویز کیا گیا تھا وہ چند اضلاع کے بارعب مسلمان رئیسوں اور تعلقہ داروں سے گھرا ہوا تھا جن میں سے بعض کالج کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور ایک ایسے کام کی طرف سے جس کو مبتدے سے ذی وجاہت مسلمان مل کر

کرنا چاہتے تھے اور جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل تھی، گورنمنٹ کو مطمئن کرنا سب سے مقدم تھا۔ جس قطعۂ زمین پر کالج کی نیو رکھی منظور تھی وہ نزولی زمین تھی جہاں ایک زمانہ میں سرکاری چھاؤنی رہ چکی تھی اور اکثر احکام اور افسر نہیں چاہتے تھے کہ وہ زمین مسلمانوں کو دیجائے۔ مسلمان جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے کالج قائم کیا جاتا تھا وہ تعلیم کے خرچ سے زیادہ کسی خرچ کو فضول اور بیکار نہیں سمجھتے تھے اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال تھا کہ کالج کی وقعت پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں جہانتک ہو سکے جلد پیدا کیجائے، کیونکہ جو بڑا منصوبہ سرسید نے اس کے لیے اپنے دل میں باندھ رکھا تھا وہ بظاہر اُن کی زندگی میں پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا اور مسلمانوں میں کسی سے یہ امید نہ تھی کہ سرسید کے بعد کالج کی وقعت اور اُس کا اعتبار ایک انچ آگے بڑھا سکے۔

سرسید نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور سب پر غالب آئے۔ چندہ توقع بلکہ وہم وگمان سے بھی زیادہ وصول کر لیا۔ گورنمنٹ کو کالج کی طرف سے مطمئن ہی نہیں کیا بلکہ اُس کا مربی اور سرپرست بنادیا۔ کالج کے لیے وہی زمین، جس کا ملنا قریب ناممکن کے ہوگیا تھا، گورنمنٹ سے حاصل کی۔ مسلمانوں کو تعلیم میں اپنے بل بوتے اور طاقت سے بڑھ کر خرچ کرنا سکھادیا۔ یہانتک کہ وہ ولایت کی تعلیم کے مصارف بہ کشادہ پیشانی برداشت کرنے لگے۔ کالج کی عالیشان عمارتوں اور عمدہ اسٹاف اور بورڈنگ ہاؤس کے انتظام سے اس کی وقعت بہت جلد پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں پیدا کردی۔ الغرض جو کچھ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق پچیس برس کے قلیل عرصہ میں کر دکھایا وہ ایک ایسا عظیم الشان کام تھا جو پچیس برس پہلے بالکل محال معلوم ہوتا تھا۔

ابتدائی کارروائیاں جو سرسید نے بطور بنیاد اور اساس اشاعت تعلیم انگریزی کے کیں خواہ اُن کو اتفاقی سمجھو اور خواہ یہ خیال کرو کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر کی گئیں تھیں، سب ایسی ضروری معلوم ہوتی ہیں کہ بغیر اُن کے شاید اصل مقصد تک پہنچنا سخت دشوار ہوتا۔ سرسید نے جو چند موقعوں پر سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کو اپنی رائے کی غلطی کی طرف منسوب کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یوروپین علوم کی اشاعت بذریعہ دیسی زبانوں کے ملک کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اس سے بعض لوگ سچ مچ یہ سمجھ گئے ہیں کہ سوسائٹی کا قائم کرنا محض بے سود تھا اور یہ کہ سرسید نے اپنی اس غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد انگریزی تعلیم کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے مگر یہ اُن کی سمجھ کی غلطی ہے، سرسید کا جو خیال انگریزی تعلیم کی نسبت اخیر زمانہ میں تھا وہی خیال اُن کا اس وقت تھا جب کہ مرادآباد میں انھوں نے ورنیکلر سکولوں کے خلاف اپنی رائے انگریزی اور اُردو میں لکھ کر شائع کی تھی اور وہی خیال اُس وقت تھا جبکہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے کچھ بہت دن نہ گذرے تھے اور انھوں نے گورنمنٹ کی اس تجویز کی سخت مخالفت کی تھی کہ بجائے کلکتہ یونیورسٹی کے ورنیکلر یونیورسٹی قائم کیجائے۔ اسی طرح ترجموں کی ضرورت کو جیسا کہ وہ سوسائٹی کے قیام کے وقت ضروری اور لابدی سمجھتے تھے اسی طرح اخیر دم تک اُس کو ضروری اور ملک کی عام تعلیم کو اُس کے بغیر ناممکن سمجھتے رہے مگر اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم کی جگہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم اور لٹریچر کی تعلیم دینے کو وہ ملک کے حق میں کچھ بھلائی نہیں سمجھتے تھے اور اسی لیے جب سے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ بجائے انگلش ہائی ایجوکیشن کے مشرقی علوم کی تعلیم دینا اور مغربی علوم کو بذریعۂ دیسی زبانوں کے شایع کرنا چاہتی ہے اُس وقت سے وہ اپنی ہر ایک

تحریر میں ورنیکلر زبانوں کے ذریعہ سے علوم کی تعلیم دینے پر سخت اعتراض کرتے تھے اور انگلش ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کو ملک کے حق میں نہایت مضر بتاتے تھے۔

جس زمانہ میں سرسید نے سوسائٹی قائم کی اس وقت ادھر تو مسلمان انگریزی کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور ادھر انگریزی تعلیم کی ضرورت کا لوگوں کو یقین دلانا مشکل تھا کیونکہ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی، اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ کے لیے جو اس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتا تھا خاص کر شمالی ہندوستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔ کمپنی کی عملداری کو گئے ہوئے چند روز گذرے تھے اور ہندوستانیوں کو عملی طور پر اس بات کا یقین نہیں دلایا گیا تھا کہ وہ اعلیٰ اعلیٰ ملکی عہدوں میں حکمران قوم کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں پھر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یوروپین سائنس اور لٹریچر کی عظمت جب تک کہ انگریزی سے عمدہ عمدہ علمی اور لٹریری مضامین دیسی زبان میں ترجمہ کر کے شایع نہ کیے جائیں، کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتی تھی جب کہ یہ حالت تھی تو کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں میں انگلش ہائی ایجوکیشن کی اشاعت سے پہلے سوسائٹی کا قائم کرنا اور ترجموں کا شائع کرانا بے سود یا غیر ضروری تھا۔

بیشک ہائی ایجوکیشن کی حمایت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلیؒ نے ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' میں اسی غلطی کا جس کو سرسید چھ سات برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے، ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم وفنون کا دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے،

سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے دعوے پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں[1] جو خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔ اگر مولانا کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ انھوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے اس لیے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشا ظاہر کرنا ضرور ہے۔

---

[1] مولانا اس بات پر کہ جس طرح عباسیوں نے یونانی سے عربی میں ترجمے کرائے تھے اُس طرح ہم مغربی علوم انگریزی سے اُردو میں ترجمہ نہیں کرا سکتے، پہلی دلیل یہ لکھی ہے کہ لاکھوں روپیہ جو خلفائے عباسیہ نے ترجمہ پر خرچ کیا وہ اب غیر ممکن ہے، مگر یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ گذشتہ تیس چالیس برس میں بغیر اس کے کہ سلطنت نے ترجمہ کا اہتمام اپنے ذمہ لیا ہو جس قدر علمی اور لٹریری مضامین اور کتابیں انگریزی سے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں، اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ کسی طرح خلفائے امویہ و عباسیہ کے عہد کے ترجموں سے کم نہ ہونگے دوسری دلیل اُن کی یہ ہے کہ اُس زمانہ میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی جس قدر کتابیں ترجمہ کرلی گئیں گویا یونانیوں کے علوم پر احاطہ کرلیا گیا مگر اس زمانہ میں نہ علمی ترقی کی انتہا ہے اور نہ کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے جن کی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے۔" یہی دلیل غالباً سرسید نے بھی کسی موقع پر بیان کی ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جس طرح اب علوم اور کتابیں غیر محدود ہیں اسی طرح ہندوستان میں ترجمہ کے وسائل بھی غیر محدود ہیں۔ عباسیوں نے صرف چند یہودی، عیسائی اور مجوسی نوکر رکھ کر ترجمے کرائے تھے کیونکہ یونانی زبان کی تعلیم کا کبھی مسلمانوں میں عام رواج نہیں ہوا بخلاف ہندوستان کے جہاں انگریزی کی تعلیم عام طور پر جاری ہے اور کاپی رائٹ کے قانون نے ہر تعلیم یافتہ کے دل میں ترجمہ کرنے کی امنگ پیدا کردی ہے۔ پھر ہر ایک علم کی تمام کتابیں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر علم کے چند نامور مصنفوں

شاید اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک ریفارمر کی شان اور اُس کی حالت عام آدمیوں کی شان اور اُن کی حالت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ جس بات کو قوم کے لیے ضروری سمجھتا ہے اُس کی تائید کرتے وقت اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں پہلے کیسا کہہ چکا ہوں یا کیا کر چکا ہوں۔ وہ اس بات کو کہ اُس کی پہلی کارروائی غلط ثابت ہو یا اُس کے افعال و اقوال

(بقیہ) کی کتابوں کا ابتدا میں ترجمہ کر لینا کافی ہے۔ پھر جتنی صدیاں یورپ کی علمی ترقیات میں صرف ہوئی ہیں اور جتنی مدت میں انگریزی زبان نے ترقی کی ہے اور جس قدر عرصہ میں مغربی علوم مدوّن ہوئے ہیں کم سے کم اس نصف مدت کی مہلت ہندوستان میں ان کے ترجموں کے لیے ملنی چاہیے۔ نہ یہ کہ جتنے دنوں ایک سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ ترجمہ کا کام کرتی رہی ہے اتنی مدت میں تمام مغربی علوم و فنون کے دیسی زبانوں میں منتقل ہونے کی توقع کیجائے۔ تیسری دلیل انھوں نے یہ لکھی ہے کہ جب یونانی سے عربی میں ترجمے ہوئے اُس زمانے میں عربی تمام ممالک میں حکومت کرنے والی زبان تھی اور کسی قوم نے اس زبان میں علوم کو ترقی نہیں دی جو اُن پر حکومت کرنیوالی نہ تھی۔" یہ دلیل بھی تقریباً اسی تقریر کا اعادہ ہے جو سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں کی تھی۔ بلاشبہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی محکوم قوم نے علوم کو اپنی زبان میں ترقی دی ہو۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیندہ بھی ایسا وقوع میں نہیں آسکتا۔ حکومت کے اصول بدلنے سے دنیا کے تمام حالات بدل گئے ہیں۔ شائستہ سلطنتوں کی رعایا اب وہ کام کر سکتی ہے جو خود سلطنتیں نہیں کر سکتیں۔ پہلے تمام رفاہ عام کے کام خود سلطنتوں کو کرنے پڑتے تھے اور رعایا کو خواہ وہ رعایا بادشاہ کی ہم قوم ہو اور خواہ غیر قوم اُن کاموں سے کچھ سروکار نہ ہوتا تھا۔ مگر اب وہ کام خود رعایا کرتی ہے۔ وہ درسگاہیں اور یونیورسٹیاں اور ہوسپٹل قائم کرتی ہے۔ ملکوں میں مذہب کی اشاعت کرتی ہے۔ علمی تحقیقات کے لیے علما کے قافلے اطراف عالم میں بھیجتی ہے۔ ترجموں کے ذریعہ سے غیر قوموں کے علوم اپنے ملک میں پھیلاتی ہے۔ (باقی جاری)

کو لوگ متناقض سمجھیں نہایت بہتر جانتا ہے بہ نسبت اس کے کہ جو امر اُس کے نزدیک سررِشتۂ قوم کے حق میں ضروری ہے اُس میں کسی طرح کی فروگذاشت ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید نے اپنے اصلی اور قدیم خیالات کو جو کہ وہ ہندوستان کے پالٹکس کی نسبت رکھتے تھے، اخیر زمانہ میں صرف اِس بنا پر بالکل بدل دیا کہ وہ خیالات مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کے موافق نہ تھے، یہاں تک کہ نیشنل کانگرس کے بانی مسٹر ہیوم جو سرسید کے قدیم دوست تھے اُن سے ناراض ہو گئے اور انگلستان میں اُنھوں نے ہندوستان کے ایک شریف مسلمان سے نہایت تعجب کے ساتھ کہا کہ "مجھکو نیشنل کانگرس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب "اسباب بغاوت" کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا مگر میں نہیں جانتا کہ اب اُس کو کیا ہو گیا۔"

سرسید کو جس وقت قوم کی بھلائی کا خیال پیدا ہوا اُس وقت مسلمانوں کی حالت پہ یہ مثل صادق آتی تھی کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی" اُن میں صدہا باتیں اصلاح طلب اور اُن کے متعلق صدہا مشکلات حل طلب تھیں۔ اگر سرسید جزئیات کی اصلاح یا حل کرنیکا ارادہ کرتے تو عمر بھر میں ایک کام

(بقیہ)

کرتی ہے، دنیا کی خبریں باہم پہنچا کر ملکوں میں شائع کرتی ہے غرضیکہ ملک کے اندرونی انتظام اور بیرونی حملوں کی مدافعت کے سوا سب ملک کی بھلائی کے کام رعایا کرسکتی ہے۔ بیشک ہندوستان کی رعایا حالت موجودہ میں بہت سے بڑے بڑے رفاہ کے کام مثل انگلستان کی رعایا کے نہیں کرسکتی مگر طرز حکومت اُن کو آہستہ آہستہ سب باتیں سکھاتی جاتی ہے۔ چنانچہ جس قدر قومی رفاہ کے کام ہندوستان کی رعایا نے اس صدی کے اخیر نصف میں کیے ہیں ہندوستان کی تاریخ میں ہرگز اُنکی مثال نہیں مل سکتی پس اس زمانہ کے حالات کو زمانۂ گذشتہ کے حالات پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے ۱۲—

کے پورا کرنے سے بھی عہدہ برآنہ ہو سکتے۔ انھوں نے تمام خرابیوں کی اصلاح اور تمام مشکلات کا حل اس بات میں دیکھا کہ قوم میں تعلیم کی اشاعت کیجائے مگر قومی تعلیم و تربیت خود ایک عظیم الشان کام تھا جس کے لیے صدیاں درکار تھیں اس لیے انھوں نے خیال کیا کہ سب سے مقدم مسلمانوں کو پولٹیکل بے وقعتی سے نکالنا اور ملک کی حکومت میں جس قدر حصہ لینے کا گورنمنٹ نے اُن کو بحیثیت ہندوستان کی رعایا ہونے کے حق دیا ہے اُس کا ان میں استحقاق پیدا کرنا ہے جو بغیر اس کے، کہ قوم میں ایک مناسب تعداد ہندوستان اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹس کی پیدا ہو جائے، کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے سوا تمام ترقیات کی جڑ خیالات کی ترقی اور دماغی تربیت ہے جس کے لیے انگلش لٹریچر کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ پس جس بات کو انھوں نے ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم میں مخل سمجھا اُس کی ہمیشہ مدافعت کرتے رہے۔ اسی بنا پر وہ جس طرح اورنٹیل تعلیم اور ورنیکلر تعلیم کے مخالف تھے اسی طرح جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ وہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کے بھی اُس صورت میں سخت مخالف تھے کہ اُس سے لٹریری تعلیم کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ درحقیقت ہندوستانیوں کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ بھی وہی ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کی حمایت تھی جس کی نسبت اُن کو خیال ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ اُس کو بتدریج موقوف کرنا چاہتی ہے۔

اِسی اصول پر کہ جو سب سے اہم اور ضروری چیز ہے صرف اُسی پر سردست اکتفا کرنا چاہیے سرسید نے جس قدر کوشش کی وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے کی اور لڑکیوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا یہاں تک کہ لوگوں نے اُن کو تعلیم نسواں کا مخالف تصور کیا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اصل سبب تعلیم

نسواں کی طرف توجہ نہ کرنے کا یہ تھا کہ اول تو جب سے اُن کو مسلمانوں کی سوشل رفارم کا خیال پیدا ہوا اُس وقت سے اخیر دم تک وہ فیمیل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہے۔ غدر سے چند روز بعد اُن کی والدہ اور بی بی کا انتقال ہوگیا اور دہلی کی آمد و رفت بالکل موقوف ہوگئی۔ اگرچہ زنانہ سوسائٹی کی حالت سے وہ بے خبر نہ تھے مگر جو فیلنگ خود اُس سوسائٹی میں رہ کر اور ہر وقت آنکھ سے اُن کی حالت دیکھ کر ایک ذکی الحس آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے وہ صرف سنی سنائی یا کبھی کبھی کی دیکھی ہوئی باتوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی دوسرے اُن کے خاندان کی فیمیل سوسائٹی کی حالت بہ نسبت اکثر مسلمان خاندانوں کے بہت عمدہ تھی۔ اُن کے خاندان کی عورتوں سے میری اکثر رشتہ دار عورتوں کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اُن کے اخلاق و عادات اور لیاقت اور سنجیدگی کی حد سے زیادہ تعریف کرتی ہیں۔ خود سرسید نے ایجوکیشن کمیشن میں اور اپنی متعدد اسپیچوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے ہونے کا حال بیان کر کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مراۃ العروس پہلی ہی بار چھپ کر شایع ہوئی تو جو نقشہ اُس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا اس کو دیکھ کر سرسید کو نہایت رنج ہوا تھا اور وہ اس کو مسلمان شرفا کی زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے۔

لیکن سب سے بڑا مانع تعلیم نسواں پر متوجہ ہونے کا یہ تھا کہ اُنھوں نے اُس کی دشواریوں کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اور اُن کے نزدیک ابھی وہ وقت بہت دور تھا کہ مسلمان شرفا کی لڑکیوں کی تعلیم کا ایک باقاعدہ اور قابل اطمینان انتظام کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ انگلستان جاتے ہوئے جب مس[1] کارپنٹر سے اُن کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے ایک کتاب جس میں ہندوستانیوں کی رائیں اور

(حاشیہ آگے)

چٹھیاں مس صاحبہ کی کوششوں کی نسبت درج تھیں، سرسید کے سامنے اس غرض سے کہ وہ بھی اپنی رائے تعلیم نسواں کے متعلق اس میں لکھدیں، پیش کی تو سرسید نے اس میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی تھی جو اُن کے سفرنامہ میں درج ہے:

"مجھ کو سٹیم دخانی جہاز میں جبکہ میں لندن کو جاتا تھا مس کارنپٹر صاحبہ سے ملاقات حاصل ہونے کی عزت اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔ جب سے میں نے اُن کا نام اور اُن کی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عورات کے سنا تھا میں بہت مشتاق اُن کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ اُن کی ملاقات ہو گئی۔"

"اُن کی عالی ہمتی اور بلند نظری اور تہذیب اخلاق اور نیک نیتی کا مثبت خود وہی مضمون ہے، جو انھوں نے اختیار کیا ہے یعنی اس گروہ کی تعلیم میں جس کو خدا تعالیٰ نے مرد کے لیے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا ہے اور جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لیے مرد کا مددگار کیا ہے، کوشش کرنا، درحقیقت یہ مضمون اور اُس پر اُن کی کوشش نہایت قدر کے لائق ہے میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہونی گو وہ کسی طرح پر ہو، نہایت اچھی ہے کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوئی ہے تو وہ خود کامیاب ہو گی اور اگر اُس میں غلطی ہے تو اُس سے امید ہے کہ اوروں کو اُس نیک کام پر کوشش کرنے کی تحریک ہوگی جس سے توقع ہے کہ کوئی نہ کوئی کوشش بغیر کسی غلطی کے شروع ہو گی اور ٹھیک ٹھیک نتیجہ تک پہنچے گی۔"

۱؎ یہ ایک شریف لیڈی برسٹل کی رہنے والی ڈاکٹر کارنپٹر کی بیٹی تھیں جنھوں نے ہندوستان کی عورتوں کی جہالت کا حال سنکر ہندوستان کا ارادہ اس غرض سے کیا تھا کہ ہندوستانی عورتوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور اب واپس انگلستان کو جاتی تھیں ۱۲-

"نیک کام پر کوشش کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اس لیے کہ وہ اُن لوگوں کی عادات و رسم و رواج کے مخالف طریقے پر جن کی بھلائی کے لیے کوشش کیجاتی ہے، قائم کی گئی ہیں، برباد ہوگئی ہیں۔ حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے اور خود اس نیکی کی رکاوٹ کا آلہ بنتا ہے۔ خدا نے یوشع کے لیے سورج کا تھم جانا کہا۔ حالانکہ شاید وہ غلط تھا کیونکہ اگر وہ واقع بھی ہوا تو شاید زمین کا تھم جانا صحیح ہوتا، مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی جو اُس زمانہ میں تھی، رعایت کی۔ پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اس حکمت کو توڑیں گے اور خود اپنے لیے نقصان کا سبب ہوں گے۔"

"بہرحال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارپنٹر صاحبہ کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مرد اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے، جو دونوں اصل میں ایک ہیں روشن ضمیری حاصل کریں۔"

سرسید کی اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے تھے مگر ہندوستانیوں کے اور خاصکر ہندوستان کے شریف مسلمانوں کے رسم و رواج، الفت و عادت اور مذہبی اوہام و خیالات سے اس کو اُس قدر بعید جانتے تھے کہ سردست اس میں کوشش کرنے کو بے سود اور رائیگاں سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے بارہا اپنی اسپیچوں میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے لوگوں کو اس بات کا شبہ ہوگیا تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے بالکل مخالف ہیں۔ یہاں ہم اُن کی خاصکر اُس اسپیچ کا جو انھوں نے ۱۸۸۴ء میں بمقام گرداسپور خاتونان پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں لکھ کر دی تھی اور جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی اسپیچ تھی جس میں شریف ہندو مسلمان

اور عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا، خلاصہ نقل کرتے ہیں۔ ایڈریس میں سرسید کی ان کوششوں کی شکرگزاری کے بعد، جو کہ وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے کر رہے تھے، اشارۃً اس بات کا بھی ذکر تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر بھی اسی طرح توجہ کریں۔ سرسید نے اُس کے جواب میں کہا:

"اے میری بہنو! آج کی رات میرے لیے شب قدر سے کم قدر کی نہیں ہے، جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی ہے وہ میرے لیے ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوتی میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکر گزار ہوں۔"

"اے میری بہنو! میں اپنی قوم[1] کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔"

"تمہاری نیکی، تمہاری بردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر کا انتظام ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔"

---

[1] یہ ایڈریس دراصل مسلمان عورتوں کی طرف سے جس کی بانی مبانی سردار محمد حیات خاں بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں، دی گئی تھی مگر اُس کے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے ۱۲

"اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں میں دل سے اُن کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقۂ تعلیم سے ہے۔ جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش کرو۔ وہی طریقۂ تمہارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔"

اس کے بعد سر سید نے پرانا طریقۂ تعلیم نسواں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور پھر یہ کہا" اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہو گئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہو گئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔ ان سچے واقعات نے میرے دل میں بہت کچھ اثر کیا ہے۔ میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے پس جو خدمت تمہارے لڑکوں کے لیے کر رہا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔"

"میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم اُن مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمہارے لیے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانہ کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔"

"تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو، اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو، اخلاق میں نیکی اور نیک دلی، رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو برتاؤ میں لاؤ، گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھو، اپنے گھر کی مالک رہو، اس پر مثل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک لائق وزیر زادی کے منتظم رہو، اپنی اولاد کی پرورش کرو، اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر اپنا سا بناؤ، خدا پرستی، خدا ترسی، ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو، یہ تمام سچی تعلیم نہایت عمدگی سے اُن کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں جیسی وہ اس زمانہ میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانہ مفید ہیں۔ پس اس زمانہ کی نامفید اور نامبارک کتابوں کی تم کو کیا ضرورت ہے؟ ہاں یہ بات سچ ہے کہ تمہارے خاندانوں کے سردوں کی نالائقی اور جہالت سے تمہارے متعدد حقوق جو خدا کے حکم سے تم کو ملے ہیں اور جن کا انسانیت کی رو سے تمہارا حق ہے، برباد ہو گئے ہیں۔ وہ حق تم کو پھر واپس دلانے کی یہی تدبیر ہے کہ تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں کوشش کی جاوے۔ جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہو جاویں گے وہ مغصوبہ حقوق از خود بے مانگے تم کو واپس ملیں گے"

آخر میں سرسید نے ہندو اور عیسائی خاتونوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے شرکت کی وہ ایک نمونہ تمہاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا کی برکت ہو اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین"

اس اسپیچ سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اُس وقت تک جب تک کہ لڑکوں میں تعلیم عام نہ ہو جائے، لڑکیوں کے لیے ضروری مسائل مذہبی کی تعلیم کافی سمجھتے تھے۔ مگر اُن کی اسپیچ میں یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے جو صرف لڑکوں کے تعلیم یافتہ ہو جانے سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس سے عورتوں کے مغصوبہ حقوق بن مانگے از خود واپس ملجائیں گے۔ اُن کی یہ امید پوری ہوتی نظر آتی ہے یا نہیں؛ اگرچہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ تعلیم یافتہ نوجوان عورتوں کے حقوق پہچانیں، اُن میں تعلیم کی کمی سے جس قدر عقل یا سمجھ یا اخلاق کی کمی ہے اُس کو اسی طرح برداشت کریں جس طرح اُس کے اسلاف برداشت کرتے آئے ہیں، اُن سے جب تک کہ قوم میں تعلیم نہایت محدود ہے، ان باتوں کی توقع نہ رکھیں جو یورپ کی ایک تعلیم یافتہ لیڈی سے رکھنی چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تربیت سے، بجائے تحمل و برداشت اور سلوک و درگذر اور قومی حمیت اور رقت جنسیت کے یہ سبق سیکھتے ہیں کہ تمدن اور معاشرت کے جس درجہ پر اہل یوروپ کو صدیوں اور قرنوں کے بعد پہنچنا نصیب ہوا ہے اُن کو یونیورسٹی کی سند پاتے ہی اُس کے خواب نظر آنے لگتے ہیں اور مستثنیٰ صورتوں کے سوا ہر تعلیم یافتہ نوجوان کی یہ تمنا معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو لندن یا پیرس کی کسی لیڈی سے شادی کریں اور اگر یہ امر اُن کی قدرت سے باہر ہو تو غالباً وہ ایک مشن اسکول کی تعلیم پائی ہوئی ٹھیٹھ کرسچن عورت کو قوم کی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے جو باقاعدہ کسی اسکول کی تعلیم یافتہ نہ ہو، بہتر اور افضل سمجھینگے۔ پس جب کہ یہ حالت ہے تو اُن سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی عورتوں کے مغصوبہ حقوق واپس دیں گے، اُن کا بڑا سلوک اپنی قوم کی ہم کفو لڑکیوں کے ساتھ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ سرے سے اُن کے

حقوق کا بوجھ ہی اپنے ذمہ نہ لیں بلکہ اُن کو بدستور جاہل اور ناتربیت یافتہ لڑکوں کے لیے چھوڑ دیں۔ اگرچہ ابھی تک سوسائٹی کے دباؤ نے بہت کچھ اُن کے جذبات کو دبا رکھا ہے لیکن آخر کار ایک طرف کی تعلیم اور دوسری طرف کی جہالت قوم کے حق میں یقیناً بُرے نتائج پیدا کرے گی۔

مذہبی تحقیقات

مذہب کے متعلق جو کچھ سرسید کی مذہبی خدمات اور رفارمیشن کے بیان میں لکھا گیا اُس سے یا اُن کوششوں کا دکھانا مقصود تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی خیرخواہی اور حمایت میں اُن سے ظہور میں آئیں یا اُس دلیری اور جرأت کا بیان کرنا تھا جو انھوں نے اپنی مذہبی تحقیقات کے اعلان کرنے میں ظاہر کی یہاں ہم اُن کی مذہبی تحقیقات کے متعلق ایک دوسری حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ کرنا ممکن ہو کہ اس شخص میں مذہبی عقدوں کے حل کرنے اور ان کی پیچیدگیوں کو سلجھانے اور مذہب کو حقائق محققہ پر منطبق کرنے کی کس قدر قابلیت تھی! نہ وہ واعظ تھا نہ مفتی، نہ فقیہ تھا نہ محدث، نہ معانی و بیان

کا ماہر تھا نہ منطق و فلسفہ کا مدعی، باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو لوگوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے تھے، اُن کا حل کرنے والا تمام ہندوستان میں صرف یہی ایک شخص تھا جس کی تحریریں مجروح دلوں پر مرہم کا کام کرتی تھیں۔ اُس کے پاس اطراف ہندوستان سے اسلام کی نسبت بیسیوں حل طلب سوالات صرف اس وجہ سے آتے تھے کہ موجودہ علمائے اسلام اُن کا شافی جواب نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سے خطوط جو سرسید نے اس قسم کے سوالات کے جواب میں لکھے ہیں، بعض احباب کے بھیجے ہوئے اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ بعض خطوط کے جواب تہذیب الاخلاق یا انسٹیٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے ذریعے سے شایع ہوئے ہیں اور بعض[1] اس مرحوم نے ہمارے سامنے لکھ کر لوگوں کو بھیجے ہیں۔ اکثر لوگ دور دور سے قصد کر کے اسی غرض سے سرسید کے پاس آتے تھے اور اپنے شبہات بیان کرتے تھے اور مطمئن ہو کر واپس جاتے تھے۔ اسی طرح اس مرحوم کے پاس بہت سے لوگ شکریہ کے خط بھیجتے تھے کہ آپ کی تصنیفات سے ہم کو یہ اور یہ فائدے پہنچے ہیں۔

---

[1] ایک صاحب نے جن کا نام احمد بابا مخدومی تھا۔ غالباً لاہور سے ۱۸۹۵ء میں سرسید کے پاس یہ سوال بھیجا تھا کہ قرآن مجید میں یحییٰ کی نسبت "براً بوالدیہ" اور عیسیٰ کی نسبت "براً بوالدتی" آیا ہے۔ اگر فی الواقع عیسیٰ کا کوئی باپ ہوتا تو ان کا قول بوالدتی کی جگہ بوالدی نقل کیا جاتا۔ اگرچہ سرسید نے تفسیر میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے مگر خاص کر اس شبہ سے کچھ تعرض نہیں کیا۔ انھوں نے جواب میں یہ چند سطریں لکھ بھیجیں، "جناب مخدومی، حضرت عیسیٰ تمام لوگوں میں ابن مریم کر کے مشہور تھے۔ اس شہرت کے سبب قرآن مجید میں بھی ان کو ابن مریم سے تعبیر کیا ہے۔ بہت لوگ اسی طرح اپنی ماں کے نام سے مشہور ہوئے ہیں قرآن مجید میں جس طرح ابن مریم کہا

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے جس قدر اختلافات مذہبی مسائل میں علمائے سلف سے کیے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں اور لوگ بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے محض اگلے محققین کی تقلید سے ان اختلافات پر مبادرت کی ہے۔ اول تو جس مقصد سے اگلے محققین نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ مقصد سرسید کے مقصد کے ساتھ متحد نہ تھا۔ سرسید کے تمام

(بقیہ)

گیا ہے نیز لوالدتی بھی کہا ہے ۔ اس لفظ سے یہ سمجھنا کہ اُن کا کوئی باپ نہ تھا صحیح نہیں ہے۔ کیا سادات کو جو فاطمی کر کے مشہور ہیں آپ بن باپ کا پیدا ہوا خیال کرتے ہیں ! و السلام ۱۲۔

۲ مولوی سید ممتاز علی بی۔ اے کہ دل ہیں جب کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے، اسلام کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہو گئے تھے انھوں نے سرسید کو جو اس وقت تبقریب ممبری کونسل کلکتہ میں تھے، اپنے شبہات لکھ بھیجے۔ اس وقت سرسید اُن کو نہیں جانتے تھے مگر انھوں نے فوراً اُن کو خط کتابت سے کچھ فائدہ نہ ہوگا تم چند روز کے لیے کلکتہ چلے آؤ اور ریل کے کرایہ کی ضرورت ہو تو میں بھجوا دوں۔ وہ فوراً کلکتہ چلے گئے اور چند صحبتوں میں اُن کے تمام شبہات زائل ہو گئے ۱۲۔

۳ انھیں خطوں میں سے ایک خط ہمارے سامنے سرسید کے نام سیوگہ علاقہ مدارس کے اہل اسلام کی جماعت کی طرف سے ہے جس پر سید احمد قاضی سیوگہ اور شیخ بابن محمد بن مشنری سیوگہ اور چار اور معزز مسلمانوں کے دستخط تھے پہنچا تھا جس کو ہم نے سید صاحب سے مانگ لیا تھا۔ اُس میں سے چند فقرے ہم انھیں کی عبارت میں یہاں نقل کرتے ہیں "جناب کی تفسیر ہر ایک مسلمان کے دل پر ایسی روشنی ڈالتی ہے جیسی اندھیری رات پر آفتاب کی۔ اس تفسیر سے ہم کو بہت بڑا فائدہ یہ ملتا ہے کہ ایک تحصیل شدہ مولوی اور ایک اردو خواں ہر دو کو برابر سمجھاتی ہے جس کو عقل سے کچھ بھی تعلق ہے وہ بلاشبہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس تفسیر کے پڑھنے و سننے سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے اور دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام فطرت کے مطابق ہے۔ ہم جب تک مذہبی باتوں میں عقل کو دخل نہیں دیتے ...... اور کبھی یہ نہیں خیال میں آیا کہ

اختلافات کا اصل مقصد اسلام کی طرف سے معترضین کے اعتراضات یا متشککین کے
شبہات کا رفع کرنا تھا بخلاف اگلے محققین کے جن کے اختلافات کا ہرگز یہ منشا
نہیں ہو سکتا، کیونکہ جو اعتراضات آج کل مذاہب پر وارد کیے جاتے ہیں ان سے
اُن بزرگوں کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ دوسرے جن لوگوں نے سرسید کی
طرزِ تصنیف کو بہ نظرِ غور دیکھا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ جب
تک کسی مسئلہ کی نسبت خود اپنی کوئی رائے قائم نہ کر لیتے تھے اُس وقت تک
کتابوں کی طرف بہت ہی کم رجوع کرتے تھے۔ پھر اگر کسی مصنف کا قول اُن کے
موافق نکل آتا تھا تو اس کو بھی اپنی رائے کی تائید کے لیے لکھ دیتے تھے ورنہ
صرف اپنی رائے لکھ دینے پر اکتفا کرتے تھے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب اُن کی
تحریر چھپ کر شائع ہو چکی اُس وقت حسنِ اتفاق سے کسی محقق کا قول سرسید کی رائے
کا مؤید اُن کے کسی دوست کو معلوم ہوا اور اس نے یا تو سرسید کو اس سے مطلع
کر دیا اور یا بذریعہ تحریر کے کسی میگزین یا اخبار میں چھپوا دیا۔ اصل یہ ہے کہ

بقیہ
ان ہونی بات کیونکر ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ تو ضرور سمجھے تھے نصاروں کے (یعنی نصاریٰ کے) تین خدایان مل
کر ایک ہونا غیر ممکن ہے۔ یہ ہنود کے ایک شخص کو تین منہ اور دو سے زیادہ کئی ہاتھ اور آدمی کو ہاتھی کا
سر لگانے جانا یہ سب غلط (یعنی عیسائیوں اور ہندوؤں کے ہاں جو نا ممکن باتیں مانی جاتی ہیں) ان کو تو ہم غلط جانتے
تھے، مگر وہی غیر ممکن بلکہ اس سے زیادہ تعجب انگیز باتیں ہمارے علماء واعظین کی گھڑت ہم کو
دکھائی نہ دی۔ الحمد اللہ اس حق گو تفسیر کی بدولت اس روحانی مہلک بیماریوں کو آج عمل صحت ملا۔۔۔
مسلمانوں کے پاک دلوں میں وہ گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کعبہ میں بتان۔ اب ان کا ایک
ایک دور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہے۔ آپ ہم اس احسان کے بدلے اپنی کھال
کی جوتیاں بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرہ کا معاوضہ نہ ہوگا۔"

سرسید کو مذہبی تحریرات میں جس قدر اپنے دماغ سے کام لینا پڑتا تھا اُس قدر دوسرے مصنفوں کی کتابوں سے مدد ملنے کی اُن کو توقع نہ تھی اور اس لیے وہ خود کتابوں کی طرف بہت کم رجوع کرتے تھے یہی سبب ہے کہ اُن کی تصنیفات میں کتابوں کے حوالے جتنے کہ ہونے چاہییں تھے اُن سے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں اُن میں زیادہ تر ایسے ہیں جو اُن کے لیے اور لوگوں نے تلاش کر کے بہم پہنچائے ہیں، اس کے سوا بہت سے مقامات اُن کی تصنیفات میں ایسے موجود ہیں جن میں اگرچہ انھوں نے سلف کے اقوال سے اپنی رائے پر استشہاد کیا ہے مگر جب اُن کے اقوال کے مجمل اور غیر شافی بیان کو سرسید کے مدلل اور شافی بیان کے مقابلے میں دیکھا جاتا ہے تو دونوں میں اس قدر فرق معلوم ہوتا ہے کہ مشکل سے اُن اقوال کو سرسید کی رائے کا ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے باوجود ان سب باتوں کے ہم بیشمار تحقیقاتیں سرسید کی مذہبی تصنیفات میں ایسی اچھوتی پاتے ہیں جن کو بظاہر اس چودھویں صدی کے محقق سے پہلے کسی کے قلم نے مس نہیں کیا اور بہت سے ایسے اچھل خیالات اور اچھل رائیں دیکھتے ہیں جن کو اس کی اولیات کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے مذہب کی سچائی کا معیار [illegible] تعلیم میں کوئی بات فطرت انسانی یا فطرۃ اللہ کے خلاف نہ ہو اور اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا دعوے کیا کہ اس معیار پر جیسا کہ اسلام پورا اُترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب ایسا پورا نہیں اُترتا۔

اسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ نبی کی عظمت اور بزرگی اس میں نہیں ہے کہ اس سے معجزات اور پیشین گوئیاں صادر ہوں بلکہ اُسکی تمام عظمت اور تمام بزرگی اس میں ہے کہ جب منکرین اُس سے معجزہ طلب کریں تو اُن کو یہ جواب

دے کر "انما الآیات عند اللہ" اور "سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا" اسی کا ذہن سب سے پہلے اس نکتہ تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا جس کو مخالفین آپ کی نبوت کے عدم ثبوت کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں یہی سب سے بڑی دلیل آپ کی سچائی اور نبی برحق ہونے کی ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے بتایا کہ قرآن میں سب سے بڑی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس کی تعلیم فطرتِ انسانی کے مطابق اور جاہل و عالم اور وحشی و شائستہ سب کی سمجھ کے موافق اور ہر زمانہ کی حالت کے مناسب ہے اور صرف بتایا ہی نہیں بلکہ اپنے دعوے کا ثبوت اس حد تک پہنچا دیا جس سے زیادہ مذہبی مسائل کا ثبوت ہرگز نہیں دیا جاسکتا۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو دریافت کیا کہ اسلام جو مدت دراز سے غیر قوموں میں مطعون و متہم چلا آتا ہے اس کے مختلف اسباب ہیں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے مسلمان فاتحوں اور کشور کشاؤں کی بے اعتدالیوں کو ایک نتیجہ اسلام کی تعلیم کا قرار دیا ہے اور اس کو مسلمانوں کے کردار کا جوابدہ تصور کیا ہے حالانکہ اسلام ہر ایک طعنہ اور ہر ایک اعتراض سے اُس وقت تک بالکل بری ہے جب تک کہ خود اُس کی تعلیم میں کوئی بات قابل گرفت کے نہ پائی جائے۔

اُسی نے سب سے پہلے اسلام پر سے عیسائی قوموں کا یہ الزام رفع کیا کہ وہ شائستگی اور سویلیزیشن کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور مسلمان جب تک مسلمان ہیں دنیوی ترقیات میں حصہ نہیں لے سکتے۔

اُسی نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ آنحضرت صلعم کا کوئی غزوہ اور

کوئی سریہ اس ارادہ پر مبنی نہ تھا کہ کفار کو تلوار کے زور سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ جس قدر چھوٹی یا بڑی لڑائیاں آپ کے عہد میں کفار کے ساتھ ہوئیں اُن کا اصل مقصد امن کا قائم کرنا اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے موانع کو دور کرنا تھا اور اسی نے نہایت روشن دلیلوں سے اس امر کا ثبوت دیا کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں لوگوں کو جبراً مسلمان کرنے کا حکم ہو بلکہ بے شمار آیتیں اس کے برخلاف صاف صاف دلالت کرتی ہیں کہ دین میں کسی قسم کا جبر واکراہ نہیں ہے۔

اسی نے سب سے پہلے اس نکتہ کو ظاہر کیا کہ اپنی مذہبی آزادی کے برقرار رکھنے کے لیے دین کے دشمنوں سے لڑنا اور ان کے ظلم و تعدی کا انتقام لینا یہی فطرت انسانی کا مقتضا ہے جس پر انسان عمل درآمد کر سکتا ہے نہ یہ کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی سامنے کر دینا، کیونکہ نہ اس پر کبھی پہلے عمل ہوا ہے اور نہ آیندہ ہو سکتا ہے۔

اسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے ثابت کیا کہ اُن کفار و مشرکین کے سوا جو مسلمانوں سے محض دین کی بابت لڑیں، اُن کو جلا وطن کریں اور اُن کے برخلاف لوگوں کی مدد کریں، کسی مشرک یا کسی کافر کتابی یا غیر کتابی کے ساتھ دوستی کرنا، اُن سے میل جول رکھنا اور صفائی و خلوص سے ملنا دین اسلام کی رو سے منع نہیں ہے۔

اسی نے سب سے پہلے فقہا کی اس غلطی کو پکڑا کہ ہر ملک مسلمانوں کے لیے یا دارالاسلام ہے یا دارالحرب اور ہر کافر حربی ہے یا ذمی، کیونکہ ہجرت اولیٰ میں جب مسلمان نجاشی کی پناہ میں جا کر رہے تو اُس وقت ابی سینیا پر نہ دارالاسلام کا اطلاق ہو سکتا تھا نہ دارالحرب کا اور ابی سینیا کے عیسائیوں

پر نہ اہل حرب کا اطلاق صحیح تھا نہ اہل ذمہ کا۔ اور اسی طرح جن ملکوں میں آج مسلمان عیسائی سلطنتوں کے محکوم ہیں اور مذہبی امور میں اسلامی سلطنتوں سے بھی زیادہ آزاد ہیں اُن ملکوں کو بھی نہ دارالحرب کہہ سکتے ہیں نہ دارالاسلام اور عیسائی حکمرانوں کو نہ اہل حرب کہہ سکتے ہیں نہ اہل ذمّہ۔

اُسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے استدلال کیا کہ اسلام نے برخلاف شرائع سابقہ کے اسیران جنگ کے قتل کرنے یا غلام بنانے کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قرآن سے یہ مسئلہ استنباط کیا کہ اگر مسلمانوں کو اس بات کا احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت نہ کر سکے گا تو اُس کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ جورو کرنی جائز نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا ثبوت دیا کہ طلاق کے مسئلہ میں یہودیوں کے ہاں افراط ہے اور عیسائیوں کے ہاں تفریط اور اعتدال صرف اسلام میں ہے اور بس۔

اُسی نے سب سے پہلے رسول خدا صلعم کا نسب نامہ عدنان سے لیکر اسمٰعیل علیہ السلام تک زمانہ حال کے اصول مسلمہ کے موافق صحیح کر کے دکھایا اور مخالفین کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بنی اسمٰعیل میں سے ہونا ثابت نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفوں کی اس غلط فہمی کو رفع کیا کہ مکہ کے قریب اسمٰعیل کا آباد ہونا محض بناوٹ اور افسانہ ہے اور بوسۂ حجر اسود، طواف کعبہ، اشہر حُرُم کی تعظیم اور مکہ و منا و عرفات میں جو مناسک ادا کیے جاتے ہیں ان میں سے کسی بات کو حضرت ابراہیمؑ کے اصول سے تعلق نہیں ہے

بلکہ بت پرستی کے اصول جو جنوبی عرب میں جاری تھے اُن سے تعلق ہے، اُس نے نہایت روشن دلیلوں اور تاریخی شہادتوں اور بائیبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ اُن میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی نظیر بنی اسحٰق یا بنی اسرائیل میں موجود نہ ہو۔

اسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفوں کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ قوم عاد کا قوم نوح کے بعد اُن کا جانشین ہونا جیسا کہ قرآن سے پایا جاتا ہے، صحیح نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قدیم جغرافیوں کی شہادت اور بائیبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ فاران کا لفظ جو حضرت موسیٰؑ اور حبقوق نبی کی بشارت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر استدلال کرتے ہیں اُس سے وادی حجاز مراد ہے نہ وہ مقامات جن کو بعض عیسائی مصنفوں نے مسلمانوں کے برخلاف فاران کا مصداق قرار دیا ہے۔

اسی نے سب سے پہلے اُن عظیم الشان فائدوں کو بیان کیا جو دیگر مذاہب کو اور خاصکر دینِ عیسوی کو اسلام کی اشاعت سے پہنچے۔

اُسی نے سب سے پہلے دینِ اسلام اور مغربی علوم میں مصالحت کی بنیاد ڈالی اور اسی غرض سے کم و بیش دو تہائی قرآن کی تفسیر لکھی اور ایسے اصول مقرر کیے جن کے بموجب آیندہ نسلیں اُس کے اس دشوار کام کو پورا کر سکیں اور اگر اس سے تفسیر قرآن میں کوئی لغزش ہوئی ہو تو انھیں اصول کے موافق اس کی اصلاح کر سکیں۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ اسلام کے جلیے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ قرآن کی جن آیتوں کے معنی علمائے سلف نے بہ پاس ادب، یا

بخوفِ خرقِ اجماع، یا بہ سبب عدم ضرورت، یا اس وجہ سے کہ ممالک اسلامیہ میں علمائے اسلام کو پوری پوری مذہبی آزادی نہ تھی، صاف صاف بیان نہیں کیے اور خاص خاص صورتوں کے سوا تمام الفاظِ قرآنی کو ان کے حقیقی معنوں پر مقصور رکھا ہے، اب بھی اُن کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ ضرور ہے کہ جو الفاظ درحقیقت بطور مجاز و استعارہ و تمثیل کے استعمال کیے گئے ہیں ان کے اصلی معنی بیان کیے جائیں اور جو شبہات اُن کے حقیقی مراد لینے سے پیدا ہوتے ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔

اگرچہ مذہبی تحقیقات کا خدا داد ملکہ جو سرسید کی طبیعت میں ودیعت تھا اُس کا ثبوت اُن کی ہر ایک تحریر میں، جو غدر کے بعد اُن کے قلم سے نکلی نمایاں طور پر پایا جاتا ہے، مگر تفسیر القرآن جس میں گویا نئے علم کلام کی بنیاد قائم کی گئی ہے سب سے عمدہ نمونہ اُن کی تصنیفات کا ہے اور اس کا اندازہ اُس سیدھے سادے اور عام فہم طریقے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اس تفسیر میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام کی حمایت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو طریقہ دین کی حمایت کا بمقابلہ یونانی فلسفہ کے ہمارے قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا وہ اس زمانہ میں کچھ بکار آمد نہیں رہا یہاں تک کہ جو مصنفین اس زمانہ میں اُس طریقہ پر کاربند ہوتے ہیں اُن کی تصنیفات سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور جو شبہات مذہب کی نسبت اُن کے دل میں خطور کرتے ہیں وہ بدستور کھٹکتے رہتے ہیں۔

آج کل ممالک عثمانیہ میں رسالہ حمیدیہ کی بہت شہرت ہے جو طرابلس کے مشہور عالم شیخ حسین آفندی نے ۱۳۰۶ھ میں وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح کی غرض سے لکھا ہے اور جب یہ شام کے بارہ جلیل القدر

عالموں نے اور روم وشام ومصر کے بہت سے نامور اخباروں نے لمبی لمبی نقرِیظیں اور ریویو لکھے ہیں. چونکہ ممالک مذکورہ میں کسی مسلمان عالم کی یہ مجال نہیں کہ سلف کی تقلید کے دائرے سے قدم باہر رکھ سکے اس لیے مصنف موصوف کا طریقہ استدلال زیادہ تر انھیں اصول پر مبنی ہے جو قدیم متکلمین نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔

مثلاً اس زمانہ کے نئے اکتشافات میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ سورج اور تمام ثوابت وسیارات جو قدیم خیالات کے موافق آسمانوں میں جڑے ہوئے تسلیم کیے جاتے تھے درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ سب ایک فضائے ممتد میں، جس کی وسعت غیر متناہی ہے، جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اور بذریعہ کشش کے جو منجملہ قوانین قدرت کے ایک زبردست قانون ہے، اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں اور کبھی اُس حد سے تجاوز نہیں کرتے اور کوئی ایسا کرہ جو تمام عالم پر محیط ہو مثل آسمان یا عرش وکرسی وغیرہ کے اس فضا میں موجود نہیں ہے. یہ مسئلہ اب تھیوری کی حد سے نکل کر سائنس کے درجہ کو پہنچ گیا ہے جس پر تمام یورپ اور امریکا کے ہیأت دانوں کا اتفاق ہے، اگرچہ حکمائے اسلام میں سے ابوبکر بن العربی کی بھی یہی رائے تھی مگر چونکہ اس وقت تک کشش کا قانون معلوم نہیں ہوا تھا اس لیے وہ رائے سائنس کے درجہ کو نہیں پہنچی تھی. چونکہ قرآن مجید میں سبع سموات اور عرش وکرسی اور لوح وقلم اور جنت وجہنم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بظاہر اس نئی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اور جن سے بڑے بڑے کُروں کا اور ایسے اجسام عظیمہ کا جو زمین اور آسمان سب پر محیط ہیں اس فضا میں موجود ہونا سمجھا جاتا ہے اس لیے مصنف رسالۂ حمیدیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ خدا تعالےٰ کا ہمارے اوپر سات آسمانوں کا پیدا کرنا اور اُن کے اوپر کرسی

اور کرسی کے اوپر عرش کا پیدا کرنا اور جو کچھ ہوا یا آیندہ ہوگا اس کے ثبت کرنے اور لکھنے کے لیے لوح وقلم کا پیدا کرنا اور انسان کے عمال کی جزا وسزا کے لیے بہشت و دوزخ کا پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ نصوص شرعیہ میں وارد ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تحت قدرت کاملہ باری تعالیٰ داخل نہ ہو۔ پس جب تک کسی دلیل قاطع عقلی سے یہ ثابت نہ ہو کہ ان میں سے کوئی چیز بالفعل موجود نہیں ہے یا ان کا موجود ہونا محالات سے ہے اُس وقت تک کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے وجود کا انکار کیا جائے۔

ہم یہاں اس امر سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ ان چیزوں کے عدم وجود یا عدم امکان پر کوئی قاطع عقلی موجود ہے یا نہیں لیکن ہمارے نزدیک اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کی غرض سے مصنف موصوف نے یہ کتاب لکھی ہے اُن کے دل کا کانٹا ایسے بیانات سے نہیں نکل سکتا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ممالک اسلامیہ میں علانیہ ایسی تصنیفات پر چون وچرا نہ کیجائے لیکن جن لوگوں نے علوم جدیدہ کی تعلیم پائی ہے اور تعلیم نے اُن پر اپنا پورا پورا اثر بھی کیا ہے ایسے جوابوں سے اُن کے دل کی خلش کا مٹنا دشوار ہے کیونکہ جن باتوں کو وہ مثل بدیہیات اولیہ کے یقینی سمجھے ہوئے ہیں اُن کا یقین محض احتمالات سے زائل نہیں ہو سکتا۔

مگر جو طریقہ سرسید نے ایسے شبہات کے رفع کرنے کا اختیار کیا ہے وہ بالکل شارع کے اس اصول کے موافق ہے کہ " کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم " کیونکہ اس سے جہانتک کہ دیکھا گیا ہے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خاطر خواہ تشفی ہو جاتی ہے اور قرآن کے بیان میں شک وشبہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ سرسید کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کا بہ لفظہ کلام الٰہی ہونا مسلم ہے اسی طرح یہ بھی مسلم

ہے کہ وہ انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس جس طرح انسان کے کلام کے معنی لگائے جاتے ہیں اس طرح خدا کے کلام معنی لگائے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ انسان کبھی الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہے اور کبھی مجازی معنوں میں، پس قرآن کے الفاظ سے بھی کہیں حقیقی معنی مراد لیے جائیں گے اور کہیں مجازی معنی۔ بڑے بڑے جلیل القدر عالموں اور محققوں نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ قرآن میں انسان کی عقل اور سمجھ کے موافق جو علمی ترقی سے پہلے اُس کی اصل خلقت میں ودیعت تھی خطاب کیا گیا ہے۔ پس جو کچھ مبدا و معاد کے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے ممکن نہیں کہ ان الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے کیونکہ جس طرح انسان کی سمجھ خدا کی ذات وصفات واسماء وافعال کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے اسی طرح واقعات بعد الموت اُس کے فہم کی رسائی سے وراء الورا ہیں اور کوئی لفظ یا الفاظ انسان کی زبان میں ایسے موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے اُن حقائق و معارف کو کماہی ہی تعبیر کیا جا سکے۔ پس عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنت و جہنم اور اسی طرح تمام الفاظ جو مبدا و معاد کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہوئے وہ بطور مجاز و استعارہ کے اطلاق کیے گئے ہیں نہ بطور حقیقت کے۔ اسی طرح جو خیال عام انسانوں کا آسمان اور زمین اور ستاروں کی نسبت تھا اُسی کے موافق قرآن میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ آسمان کو مثل ایک چھت یا سائبان کے زمین پر چھایا ہوا تصور کرتے تھے سو انھیں کی سمجھ کے موافق فرمایا "وجعلنا السماء سقفاً محفوظاً" وہ زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا جانتے تھے سو انھیں کے خیال کے مطابق کہا " والارض فرشنا ھا" وہ ستاروں کو آسمان میں جڑا ہوا تصور کرتے تھے سو انھیں کے تصور کے موافق فرمایا " انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب" کیونکہ اصل مقصود آسمان اور زمین اور

ستاروں کی حقیقت بیان کرنا نہ تھا بلکہ مصنوعات کی عظمت سے جس طرح پر کہ وہ اُن کو تسلیم کیے ہوئے تھے. صانع کی عظمت وجلال کا تصور دلانا اور اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا۔

یہ ایک نہایت مختصر اور ناکافی خلاصہ ہے اُن تحریروں کا جو سرسید نے اس قسم کے شبہات رفع کرنے کی غرض سے تفسیر کے مختلف مقامات میں بہت شرح وبسط کے ساتھ لکھی ہیں اگر کسی کو زیادہ تفصیل دیکھنی منظور ہو تو وہ تفسیر کی جلدوں کو اور اُن کے رسالہ اصول التفسیر کو مطالعہ کرے۔

یا مثلاً مصنف رسالۂ حمیدیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر خوارق عادات یعنی معجزات سے استدلال کیا ہے اور جو کچھ معجزہ کے متعلق علم کلام کی کتابوں میں لکھا ہے اُسی کو زیادہ صفائی کے ساتھ اپنی عبارت میں ادا کیا ہے۔ اگرچہ خرق عادت کو دلیل نبوت گردانتے پر قدیم سے ردّ و قدح ہوتی چلی آئی ہے یہاں تک کہ خود اہل اسلام میں سے بعض محققین نے نہایت زبردست دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ معجزہ کسی طرح دلیل نبوت نہیں ہوسکتا، مگر اس میں شک نہیں کہ جمہور متکلمین قدیم سے خرق عادت کو دلیل نبوت کہتے چلے آئے ہیں لیکن اس زمانہ میں وہ تمام دلیلیں جو خرق عادت کے ممکن ہونے یا اُن سے نبوت کے ثابت ہونے پر قائم کی جاتی تھیں سب بےکار ہوگئی ہیں. ہر شخص جس نے زمانۂ حال کے علوم طبعیہ کی تعلیم پائی ہے اور اُن کو اچھی طرح سمجھا ہے، وہ دل سے اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ قوانین قدرت کبھی نہیں بدلتے اور اسباب ومسببات میں کبھی تخلف واقع نہیں ہوتا. سب سے بڑا شبہ متکلمین کے استدلال پر یہ وارد ہوتا ہے کہ مثلاً جو معجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اُن میں سے کسی معجزہ کی

کی نسبت یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے دعوت اسلام کرتے وقت یا اس وقت جبکہ آپ سے معجزے طلب کیے گئے منکرین کو کوئی معجزہ دکھایا ہو، بلکہ برخلاف اس کے قرآن سے بخوبی ثابت ہے کہ جب کبھی کفار کی طرف سے معجزے طلب کرنے میں اصرار ہوا تو آپ نے اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ "انما الآیات عند اللہ" یا "سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا" یا "لو ان عندی ما تستعجلون به لقضی الامر بینی وبینکم" یا "ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا الا نذیر وبشیر لقوم یؤمنون" حالانکہ نبوت کا ثبوت اگر معجزہ پر منحصر ہوتا تو کفار کو عند الطلب معجزہ دکھانا ضرور تھا۔ بعینہ ایسا ہی انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر معجزات حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اُن میں سے کوئی معجزہ عند الطلب نہیں دکھایا گیا بلکہ برخلاف اس کے متی باب ۴ و ۱۲ و ۲۶ و ۲۷ اور مرقس باب ۸ و ۱۴ و ۱۵ اور لوقا باب ۲۲ و ۲۳ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سے بارہا معجزے طلب کیے گئے مگر آپ نے ان کے دکھانے سے انکار کیا۔

نیز مصنف موصوف نے قدیم متکلمین کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی نسبت یہ بھی لکھا ہے کہ آپ سے خوارقِ عادات کا وقوع جب تک تواتر معنوی کی حد کو پہنچ گیا ہے اور جو بات تواتر سے ثابت ہو اس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس زمانہ میں تواتر کو اسی حالت میں مفید یقین مانا جاتا ہے جب کہ روایت میں کوئی مضمون دلیل قاطع عقلی یا قانون قدرت کے خلاف مندرج نہ ہو۔

بہرحال کسی نبی کی نبوت کے ثبوت میں اس کے خوارق عادات کو پیش کرنا، جیسا کہ قدیم متکلمین کا دستور تھا، اس زمانہ میں کچھ کارآمد نہیں رہا بلکہ کسی نبی

کی نسبت یہ ثابت ہوتا کہ اُس نے خوارق عادات دکھانے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، یہی بڑی دلیل اس کی سچائی کی سمجھی جاتی ہے۔

سرسید نے برخلاف جمہور متکلمین کے خرق عادت کے واقع ہونے سے انکار کیا ہے اور اس دعوے کی تائید میں کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔ قاضی ابن ارشد اندلسی کی ایک لمبی تقریر اُن کی کتاب "الکشف عن مناہج الادلہ فی عقائد الملۃ" سے نقل کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ بعد تسلیم کرنے اس بات کے کہ خدا موجود، مرید، متکلم، قادر اور مالک عباد ہے اور وہ رسول بھیجا کرتا ہے۔ اور اُن سے معجزات بھی صادر ہوا کرتے ہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جن سے معجزے صادر ہوتے ہیں وہ خدا کے رسول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر بحث کی ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب تفہیمات سے اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "شق قمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے بلکہ علامات قیامت میں سے ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے" اقتربت الساعۃ وانشق القمر " اور خدا تعالےٰ نے ان معجزات میں سے (یعنی آنحضرت صلعم کے معجزات میں سے) اپنی کتاب میں کچھ ذکر نہیں کیا اور نہ کہیں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے۔"

اس کے بعد خود سرسید نے ایک نہایت مفصل اور شافی بحث فطرت انسانی پر اور اس بات پر کی ہے کہ انسان اپنی فطرت کی رو سے ہدایت کرنے والوں کا محتاج ہے اور اسی فطرت کا مقتضا یہ ہے کہ جو گروہ کسی شخص کو دین یا شریعت کا ہادی سمجھتا ہے اُس کو جب تک انسانیت کے درجہ سے ورا الورا نہیں ٹھیرا لیتا اس کے دل کو صبر نہیں آتا یہاں تک کہ اُس کو خدا اور خدا کا بیٹا تک کہنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور کم سے کم یہ کہ اُس میں

ایسے اوصاف اور معجزات اور کرامتیں ثابت کرتا ہے جن سے وہ باوجود انسان ہونے کے نوع انسان سے بالاتر سمجھا جائے۔ معمولی واقعات جو عادت الٰہی کے مطابق ہوتے رہتے ہیں جب اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو وہی اس کی کرامتیں اور معجزے قرار پا جاتے ہیں۔ اگر ایک عام آدمی کسی کو بددعا دے کہ تجھ پر بجلی گرے اور اتفاق سے وہ بجلی ہی سے مارا جائے تو کسی کو کچھ خیال نہیں ہوتا لیکن اگر وہ بد دعا کسی ایسے شخص نے دی ہو جس کے تقدس کا خیال لوگوں کے دلوں میں ہو تو اُس کی کرامت یا معجزہ سمجھا جاتا ہے .... انسان میں بعض ایسی قوتیں ہیں جو خاص طریقۂ مجاہدہ سے قوی ہو جاتی ہیں اور کسی میں بمقتضائے خلقت قوی ہوتی ہیں اور ان سے ایسے ایسے امور ظہور میں آتے ہیں جو ان لوگوں سے ظہور میں نہیں آسکتے جن کی قوتیں مجاہدہ سے یا بمقتضائے خلقت ویسی قوی نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ سب امور اسی طرح واقع ہوتے ہیں جیسے تمام کام بمقتضائے فطرت انسانی وقوع میں آتے ہیں مگر وہ امور بھی اُن مقدس شخصوں کے معجزے یا کرامات سمجھے جاتے ہیں۔ پھر بہت سی عجیب باتیں ان بزرگوں کی ..... نسبت ایسی مشہور ہو جاتی ہیں جن کی درحقیقت کچھ اصل نہیں ہوتی مگر جن کی طرف وہ منسوب کی جاتی ہیں اُن کی عقیدت کے سبب سے بلا تحقیق اُن پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے انبیا علیہم السلام کے اکثر کاموں کو بطور خوارق عادات کے بیان کیا گیا ہے اور بہت سی باتیں اُن کی طرف ایسی منسوب کی گئی ہیں جن کا کچھ ثبوت نہیں۔ انتہے ملخصاً۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "انھیں غلط خیالات کے سبب لوگوں نے انبیائؑ سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود نے انبیا کے انکار کرنے کی یہی وجہ بیان کی کہ "ان انتم الا بشر مثلنا" اور انھیں غلط خیالات کی وجہ تھی کہ مشرکین عرب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزوں کے

طلبگار ہوتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو کیوں نہیں ان کے پاس فرشتے آتے، کیوں نہیں ان کے پاس خزانہ اُتارا گیا؟ کبھی کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں، یعنی انسانوں سے زیادہ کوئی بات ان میں نہیں ہے۔ کبھی آسمان سے پتھر برسوانے چاہتے تھے، کبھی آسمان کا ٹکڑا ٹوٹ کر گرنے کی خواہش کرتے تھے۔

اس کے بعد سرسید نے سورۂ کہف، سورۂ اعراف، سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ عنکبوت کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ معجزہ یا علم غیب کے تجھ سے متوقع ہیں اُن سے کہہ دے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں ایک بشر ہوں مثل تمہارے جس کو وحی سے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے اور بس اور کہہ دے کہ میں بغیر خدا کی مشیت کے نہ اپنے تئیں نفع پہنچا سکتا ہوں نہ نقصان اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو کثرت سے بھلائیاں حاصل کر لیتا اور بُرائی مجھ کو چھوتی بھی نہیں۔ میں کچھ نہیں ہوں سوا اس کے کہ مومنوں کو ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور بس اور کہہ دے کہ پاک ہے میرا رب میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک انسان خدا کا بھیجا ہوا اور کہہ دے کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک علانیہ ڈرانے والا۔

ان آیتوں کے نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت صلعم کے پاس جو کہ افضل الانبیاء والرسل ہیں معجزہ نہ ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین (علیہم السلام) کے پاس بھی کوئی معجزہ نہ تھا اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنوں میں) سمجھتے تھے وہ درحقیقت معجزات نہ تھے بلکہ ایسے واقعات تھے جو مطابق قانون قدرت کے واقع ہوتے تھے۔ خاتم النبیین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے جو اس بات کو کھول دیا اور چھپا نہیں

رکھا اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ بڑا جزو اسلام کا...... جس کی وجہ سے آپ خاتم النبیین ہوئے وہ صرف تکمیل تلقین توحید ذات باری تھی جو توحیدات ثلاثہ میں منحصر ہے۔ یعنی توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی العبادۃ۔ انبیاء میں معجزات کا (علی المعنی المتعارف) یا اولیاء اللہ میں کرامات کا یقین کرنا اگوکہ اعتقاد کیا جاوے کہ خدا ہی نے وہ قدرت یا صفت ان میں دی ہے، توحید فی الصفات کو نامکمل کر دیتا ہے۔ کوئی عزت، کوئی بزرگی، کوئی تقدس اور کوئی صداقت اسلام اور بانی اسلام کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ اُس نے بغیر کسی لاؤ لپیٹ کے اور بغیر کسی دھوکا دینے کے اور بغیر کسی کرشمہ و کرامت کا دعوے کرنے کے صاف صاف لوگوں کو بتا دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں، میں تو مثل تمہارے ایک انسان ہوں، میرے دل میں جو وحی ڈالی ہے اُس کی تم کو تلقین کرتا ہوں۔ صلی اللہ علی محمد خاتم النبیین و حبیب رب العالمین"

اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ خوارق عادات جو عموماً انبیاء کی طرف منسوب کیے گئے ہیں سرسید اس کی وجہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی نبوت کا یقین لوگوں کو فی الواقع ان کے خوارق عادات دیکھنے سے ہوا تھا بلکہ ان کے نزدیک انسان کی فطرت کا مقتضا یہی ہے کہ انبیا اور اولیا اور تمام مقدس لوگ جن سے ان کو عقیدت ہوتی ہے، اُن کی معمولی باتیں بھی اُس کو معجزہ اور کرامت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسی مطلب کو وہ آگے چل کر دوسری طرح بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "لوگوں کا خیال ہے کہ انبیا پر ایمان لانا بسبب ظہور معجزات باہرہ کے ہوتا ہے مگر یہ خیال محض غلط ہے۔ انبیاء پر اکسی ہادی یا باطل پر ایمان لانا بھی انسانی فطرت میں داخل اور قانون قدرت کے تابع ہے۔ بعض انسان از روئے فطرت کے ایسے سلیم الطبع پیدا ہوتے ہیں کہ سیدھی اور سچی بات ان کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔

وہ اس پر یقین کرنے کے لیے دلیل کے محتاج نہیں ہوتے باوجودیکہ وہ اس سے مانوس نہیں ہوتے مگر اُن کا وجدانِ صحیح اُس کے سچے ہونے پر گواہی دیتا ہے۔ اُن کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اُس بات کے سچ ہونے پر اُن کو یقین دلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو انبیائے صادقین پر صرف اُن کا وعظ و نصیحت سن کر ایمان لاتے ہیں، نہ معجزوں اور کرامتوں پر۔ اسی فطرتِ انسانی کا نام شارع نے ہدایت رکھا ہے۔ مگر جو لوگ معجزوں کے طلبگار ہوتے ہیں وہ کبھی ایمان نہیں لاتے اور نہ معجزوں کو دکھانے سے کوئی ایمان لا سکتا ہے۔ خود خدا نے اپنے رسول سے فرمایا کہ "اگر تو زمین میں ایک سُرنگ ڈھونڈھ نکالے یا آسمان میں ایک سیڑھی لگائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے" اور ایک جگہ فرمایا کہ "اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب بھی بھیج دیں اور اُس کو وہ اپنے ہاتھوں سے بھی چھو لیں تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو علانیہ جادو ہے۔" پس ایمان لانا صرف ہدایت (فطرت) پر منحصر ہے، جیسے کہ خدا نے فرمایا "اللّٰہ یھدی من یشاء الیٰ صراطٍ مستقیم"۔ ہادی باطل پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں (یا ہادی برحق کی بات قبول نہیں کرتے) اُن کے دل میں بھی غالباً اسی قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُس کا سبب کبھی اُن کی فطرت ہوتی ہے جو کجی کی طرف مائل ہے اور سیدھی طرف مائل ہی نہیں ہوتی اور اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے "من یشاء اللّٰہ یُضلِلہ ومن یشاء یجعلہ علیٰ صراطٍ مستقیم"۔ اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ دینِ آبائی کا اور سوسائٹی کا ایسا بوجھ اُن کی طبیعتوں پر ہوتا ہے کہ سیدھی بات کے دل میں آنے کی جگہ ہی نہیں رہتی اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ متلّون بالطبع ہو کر اُس بات پر غور نہیں کرتے اور اسی کی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ وہ فمن

یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً کانما یصعد فی السماء کذلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لایؤمنون "

پھر اسی معجزہ کی بحث میں سرسید نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر معجزہ سے جیسا کہ شاہ ولی اللہ اور بعض دیگر محققین نے لکھا ہے، یہ مراد ہے کہ وہ بغیر موجود ہونے اسباب کے ظہور میں نہیں آتا تو ہم ایسے امر کے واقع ہونے سے انکار نہیں کرتے مگر نبی کے ساتھ اس کے مخصوص ہونے اور غیر نبی سے اس کے ظہور میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی اور اگر اس سے جیسا کہ جمہور متکلمین قائل ہیں کوئی امر خارق عادت جو قوانین قدرت کے برخلاف ظہور میں آئے، مراد ہے تو ہم اس کے انکار پر مجبور ہیں، نہ اس لیے کہ حکماء و فلاسفہ اس کو کسی وجہ سے ناممکن سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ قرآن ہم کو صاف صاف ہدایت کرتا ہے کہ قوانین قدرت کبھی نہیں بدلتے، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے سورۂ قمر میں فرمایا کہ " انا کل شئ خلقنٰہ بقدر " اور رعد میں فرمایا " وکل شئ عندہ بمقدار " اور فرقان میں فرمایا خلق کل شئ فقدرہ تقدیرا، اور روم میں فرمایا "لاتبدیل لخلق اللہ " اور ملائکہ میں فرمایا " فلن تجد لسنت اللہ تبدیلا ولن تجد لسنت اللہ تحویلا" اور سورۂ فتح میں فرمایا سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً اور بنی اسرائیل میں فرمایا " قل کل یعمل علی شاکلتہ " (ای طریقہ التی جبل علیہا) یہ تمام آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کوئی شے اپنے اندازہ سے جو خدا تعالےٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے نہ بڑھ سکتی ہے نہ مٹ سکتی ہے اور خدا کی بنائی ہوئی خلقت میں تبدیلی ممکن نہیں اور خدا کی سنت (یعنی عادت) نہ بدل سکتی ہے اور نہ دگرگوں ہو سکتی ہے اور ہر کوئی اسی طریقہ پر چلتا ہے جو اس کی

جبلت میں رکھا گیا ہے۔ انتہٰی ملخصاً۔

بہرحال معجزہ جن معنوں میں کہ وہ عموماً بولا جاتا ہے۔ سرسید کے نزدیک نہ اُس کا وقوع میں آنا ممکن ہے اور نہ نبی کی تصدیق اُس پر موقوف ہے۔ اُن کے نزدیک نبی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس کی تعلیم تمام طبقات اناس کی سمجھ کے موافق اور جاہل اور حکیم اور خداپرست اور نفس پرست سب کو ایک نتیجہ پر پہنچانے والی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ "حکمائے آلہی اور انبیائے ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حکما صرف اُن چند لوگوں کو تربیت کرسکتے ہیں جن کا دل و دماغ تربیت پا چکا ہے، برخلاف اس کے انبیا تمام کافۂ انام کو تربیت کرتے ہیں جن کا بہت بڑا حصہ محض نا تربیت یافتہ، جاہل، وحشی، جنگلی، بدوی، بےعقل اور بد دماغ ہوتا ہے اور اسی لیے انبیا کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ان حقائق و معارف کو جن کو تربیت یافتہ عقل بھی مناسب غور و فکر و تامل سے سمجھ سکتی ہے، ایسے الفاظ میں بیان کریں کہ تربیت یافتہ دماغ اور کوڑ مغز دونوں برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآن مجید میں جو بےمثل چیز ہے وہ یہی ہے کہ اس کا طرز بیان ہر ایک کے مذاق اور دماغ سے موافق ہے اور باوجود اس قدر اختلاف کے دونوں نتیجہ پانے میں برابر ہیں۔ انھیں آیات کی نسبت (یعنی جن آیتوں میں جنت اور حور قصور وغیرہ کا بیان ہے) دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو، ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ بہشت وغیرہ کا جن الفاظ سے بیان ہوا ہے اُن سے بعینہٖ وہی اشیا مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ درجہ کی خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لاتا ہے۔ اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بےانتہا عمدگی نعیم جنت کی اور ایک ترغیب اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک کوڑ مغز

مُلّا یا شہوت پرست زاہد سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پییں گے، میوے کھاویں گے، دودھ اور شہد کی ندیوں میں نہاویں گے اور جو دل چاہے گا مزے اڑائیں گے، وہ بھی اس لغو وبیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے اور جس نتیجہ پر پہلا پہنچا تھا اُسی پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے اور کافۂ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے۔ پس جس شخص نے قرآن مجید کی ان حقائق پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کی اُس نے درحقیقت قرآن کو مطلق نہیں سمجھا اور اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم رہا۔

اس طریقۂ استدلال میں، جو کہ سرسید نے اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اختیار کیا ہے، اور شیخ حسین آفندی کے طریقہ میں، جو رسالہ حمیدیہ میں اختیار کیا گیا ہے) یہ فرق ہے کہ شیخ کے استدلال سے زیادہ تر وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن پر نئی تعلیم نے کچھ اثر نہیں کیا اور جن کے دل ہر قسم کے شکوک وشبہات سے خالی ہیں، مگر جس جماعت کی تشفی کے لیے وہ کتاب لکھی گئی ہے ان پر اُس کا منتر کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے جو طریقہ سرسید نے اپنی تفسیر میں اسلام کی حقیت ثابت کرنے کا اختیار کیا ہے اگرچہ پرانے خیالات کے مسلمان جن کے لیے درحقیقت یہ تفسیر نہیں لکھی گئی، اُس کی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن نئے خیالات کے لوگ، جو اس تفسیر کے مخاطب صحیح ہیں، وہ اُس سے خاطر خواہ تشفی پاتے ہیں۔

آج کل ہندوستان میں مذہبی آزادی کا یہ حال ہے کہ ہر شخص جس مذہب پر اور جس مذہبی تصنیف پر چاہے اعتراض کر سکتا ہے۔ باوجود اس کے سرسید کی مذہبی تصنیفات پر جس قدر اعتراضات آج تک سُنے گئے ہیں

وہ سب قدیم خیالات کے مسلمانوں کی طرف سے سُنے گئے ہیں، کسی نئے تعلیم یافتہ مسلمان نے اُن پر نکتہ چینی نہیں کی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اکثر مذہب کی طرف سے ایسے بے پروا ہیں کہ وہ کسی مذہبی تصنیف کے مخالف یا موافق لکھنے کو ایک فضول بات سمجھتے ہیں اور بہت بڑا حصہ اس گروہ کا وہ لوگ ہیں جو اس بات کے سمجھنے کی لیاقت ہی نہیں رکھتے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسلام کے خالص اصول کے موافق صحیح ہے یا نہیں مگر باایں ہمہ نئے خیالات کے مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دین اسلام کے دلدادہ ہیں، قرآن اور حدیث کو بخوبی سمجھتے ہیں اور جو کچھ مذہب کے متعلق آج کل لکھا جاتا ہے۔ اس پر نکتہ چینی کرنے اور رائے دینے کی کافی لیاقت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے بھی کسی نے، سوا اس کے کہ بعض جزئیات میں سرسید سے اختلاف کیا ہو، ان اصول کے تسلیم کرنے سے جن پر تفسیر مذکور کی بنیاد رکھی گئی ہے، انکار نہیں کیا۔

سرسید نے جن اصول پر قرآن کے معنی بیان کیے ہیں ان میں ظاہراً کوئی بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جس پر کچھ گرفت ہو سکے، مگر اس میں شک نہیں کہ بہت سی آیتوں کے معنی بیان کرنے میں جن اصول کی ان کو پابندی کرنی چاہیے تھی ان کی پابندی نہیں کی گئی اور اسی وجہ سے بعض آیات کی تفسیر میں سرسید کے بعضے ہم خیال آدمی اُن کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔

مثلاً سرسید جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات قرآن میں مذکور ہونا تسلیم نہیں کرتے اسی طرح ان کے نزدیک انبیائے سابقین کے معجزات کا بھی قرآن میں کچھ ذکر نہیں ہے اور اس لیے انھوں نے انبیائے سابقین کے ہر ایک ایسے واقعہ کو جو ظاہراً کسی امر خارق عادت پر دلالت

کرتا ہے، قانون قدرت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اُن کے بعض ہم خیال، باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی امر قانون قدرت کے خلاف وقوع میں نہیں آسکتا، مگر اُن کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ انبیائے سابقین کے اکثر واقعات، اگرچہ نفس الامر میں موافق قانون قدرت کے واقع ہوئے ہوں، مگر قرآن مجید میں بطور خوارق عادات کے، جیسا کہ عرب کے اہل کتاب اعتقاد رکھتے تھے، بیان کیے گئے ہیں اور اُن کے نزدیک قرآن کی یہ طرز بیان ہرگز اُس کی سچائی کے برخلاف نہیں ہے کیونکہ قطع نظر اور دلائل کے خود سرسید نے متعدد آیتوں کی تفسیر اس اصول کے مطابق کی ہے کہ قرآن میں بہت سی باتیں بلالحاظ اس امر کے کہ وہ فی الواقع صحیح ہیں یا نہیں، محض لوگوں کی معمولی سمجھ اور اُن کے اعتقاد کے موافق بیان کی گئی ہیں۔

اور یہ اصول درحقیقت انھوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ بالغہ سے اخذ کیا ہے۔ جہاں وہ لکھتے ہیں کہ "شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقائق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی، اُن سے خطاب کیا ہے" اور دوسری جگہ اسی کتاب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "انبیا کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اُن کی معمولی سمجھ اور عقل سے بڑھ کر، جس پر کہ وہ مجبول ہوئے ہیں، کلام نہ کریں۔"

اسی اصول کے موافق سرسید نے اُس آیت کی تفسیر کی ہے جس میں زمین و آسمان کا چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے اور جس پر سائنس کا یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دنیا چھ دن سے زیادہ عرصہ میں پیدا ہوئی ہے۔ اُن کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ اس سے کسی حقیقت یا کسی خبر کا بیان کرنا

مقصود نہیں ہے بلکہ توریت میں بھی چونکہ اس موقع پر چھ دن کا لفظ واقع ہوا تھا اور عرب کے تمام اہل کتاب اور دیگر قومیں جو اہل کتاب سے میل جول رکھتی تھیں سب کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا چھ دن میں بنی ہے اس لیے شارع نے اسلام کا اصل مقصد یعنی خدا کی الوہیت اور توحید کا یقین دلانا، مخاطبین کی سمجھ کے موافق ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ "ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام"

چونکہ سرسید کے قول کے موافق بزرگوں اور مقدس لوگوں کی طرف خوارق عادات کا منسوب کرنا انسان کی فطرت کا مقتضا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثر معمولی باتیں بھی معجزات یا کرامات تصور کی جاتی ہیں اور خاصکر انبیائے بنی اسرائیل کے قصے جو عرب کے اہل کتاب میں مشہور تھے ان میں بہت سی باتیں بطور خوارق عادات کے مشہور چلی آتی تھیں اور قرآن میں ان قصوں کا بیان کرنا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ ان میں جو باتیں مخاطبین کی ہدایت اور تہذیب نفس میں دخل رکھتی تھیں صرف ان کا مجملاً ذکر کرنا منظور تھا اس لیے یہ ایک لازمی بات تھی کہ انبیائے بنی اسرائیل کے قصوں میں جس قدر کہ قرآن مجید میں بغرض روحانی تعلیم کے اخذ کیا جائے وہ انھیں پیرایوں میں بیان کیا جائے جو اہل کتاب کے دلوں پر مثل علوم متعارفہ کے نقش ہو رہے تھے۔ کیونکہ قرآن کا اصل مقصد ان نصیحتوں کا بیان کرنا تھا جو ان قصوں سے استنباط ہوتی تھیں نہ کہ ان قصوں کی نسبت انیسویں صدی عیسوی کی سائنٹفک تحقیقات کا بیان کرنا۔ ہاں بلاشبہ قرآن کا جو خاصکر توحید کی تکمیل کے لیے نازل ہوا تھا۔ یہ کام تھا کہ خرق عادت کا غلط خیال جو توحید فی الصفات کا منافی تھا، اس کی غلطی ظاہر کر دے۔ سو اس نے نہایت تصریح کے

ساتھ مستقل طور پر نہ کہ انبیائے بنی اسرائیل کے واقعات کے ضمن میں، اُس کی غلطی کو ظاہر کر دیا اور خود خاتم النبیینؐ کی زبان حق ترجمان سے بکرات و مرات علی رؤس الاشہاد کہلوادیا کہ "انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین"

الغرض باوجود ان جزئی اختلافات کے جو سرسید کے اسکول کے بعض اشخاص یعنی آیتوں کی تفسیر میں اُن کے ساتھ رکھتے ہیں، ظاہرا اُن اصول کو سب تسلیم کرتے ہیں جن پر اس تفسیر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور غالباً مستثنیٰ مقامات کے سوا جن کو ہم کسی دوسری تحریر میں بیان کریں گے جو کچھ کہ سرسید نے زمانۂ حال کے مسائل کلامیہ کی نسبت لکھا ہے، اس کو صرف تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اس زمانہ کی اسلامی فتوحات میں شمار کرتے ہیں۔ خصوصاً وحی اور اُس کے نزول کی تحقیق، نبوت کی حقیقت، قرآن کے معجز ہونے کا بیان جنت و دوزخ اور اُس کے نعیم و آلام کی حقیقت، آدم کے بہشت سے نکالے جانے کی تحقیق، معجزہ کی بحث، ملائکہ اور شیطان کی بحث، جبرئیل و میکائیل کی حقیقت، ناسخ و منسوخ کی بحث، سمت قبلہ کی تحقیق، حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کی تحقیق، شہدا کو زندہ سمجھنے کی تحقیق، قطع ید سارق کے مسئلہ کی تحقیق، نفخ صور اور وزن اعمال کی تحقیق، روح اور اُس کے باقی رہنے کی بحث، آخرت اور قیامت کا بیان، خدا کے ساتھ موسیٰؑ کے کلام کرنے اور کوہ طور پر تجلی ہونے کی بحث، دیدار الٰہی کی بحث، بدر وحنین کی لڑائی میں فرشتوں کے آنے کی تحقیق، طوفان نوح کی بحث، حضرت یعقوبؑ کے نابینا ہونے کے بعد بینا ہونے کی تحقیق، معراج اور شق صدر کے مسئلہ کی تحقیق اور اسی قسم کی اور بہت سی تحقیقاتیں اور بحثیں خاصکر توجہ کے لائق ہیں۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے وہ

سربمہر اسرار ظاہر کیے ہیں جن کے اعلان کرنے کی ممانعت قدیم سے ہوتی چلی آئی ہے مگر اس باب میں انھوں نے جو عذر کیے ہیں وہ بھی لحاظ کے قابل ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر کی تیسری جلد میں علامۂ ابن رشد کی ایک لمبی تقریر کا خلاصہ نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مسائل غامضہ جو جمہور کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں ان کو ایسے لوگوں کے سامنے جو اُن کے اہل نہیں ہیں، بیان کرنے والا کافر ہے اور اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی نص کی تاویل کرتا ہے سو ظاہر ہے کہ اس کا مقصد ظاہری معنوں کو باطل کرنے اور تاویلی معنوں کے ثابت کرنے کا ہوتا ہے۔ پس جب کہ عام آدمیوں کے نزدیک ظاہری معنے باطل ہو گئے اور تاویلی معنے اُن کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ نص اصول دین سے علاقہ رکھتی تو ظاہر ہے کہ کفر تک نوبت پہنچ جائے گی۔ انتہیٰ ملخصا۔

اس تقریر پر سرسید لکھتے ہیں کہ "نتیجہ اس تقریر کا یہ ہے کہ کوئی بات بھی شریعت کی جو بیان حقیقت یا تاویلات کی قسم سے ہو، سوائے راسخین فی العلم کے کسی کے سامنے بیان نہ کی جائے۔ جس قسم کے لوگوں کو ابن رشد نے راسخین فی العلم میں قرار دیا ہے اس زمانہ میں تو ایسا شخص کوئی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانہ میں بھی دو ایک کے سوا کوئی نہ تھا۔ پس ضرورتاً لازم آتا ہے کہ تمام مقدم باتیں شریعت کی بطور ایک معما و چیستاں یا مثل راز فرمین کے غیر معلوم رہنی چاہییں۔"

"اگر ہمارا مذہب اسلام ایسا ہو کہ اُس کے اصول لوگوں کو نہ سمجھا سکیں جو اُن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ یا اُن لوگوں کی تشفی نہ کر سکیں جن کے دل میں شبہات پیدا ہوئے ہیں بلکہ ان سب کو اس پر مجبور کریں کہ ان باتوں کو ایسی

طرح مان لو تو ہم اپنے مذہب کی صداقت فی نفسہٖ اور بمقابلہ دیگر مذاہب غیر حق کے کیونکر ثابت کر سکتے ہیں۔ ایک عیسائی کہتا ہے کہ "تثلیث کا مسئلہ کہ تین تین بھی ہیں اور ایک بھی ہیں، ایک الٰہی مسئلہ ہے۔ اس پر بے سمجھے یقین کرنا چاہیے۔" پس اگر ہم مذہب اسلام کے بہت مسئلوں کی نسبت ایسا ہی کہنا قرار دیں تو کیا وجہ ہے کہ اُس کی تکذیب اور اس کی تصدیق کریں۔"

اس کے بعد ان کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں عالم اور جاہل سب دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو اپنے مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں، دوسرے وہ جو ہر ایک بات کی دلیل طلب کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ جاہل ہوں یا عالم کسی بات کا بغیر دلیل یقین نہیں کرتے۔ اس دوسری قسم کے لوگوں سے (جو اس زمانہ میں بہت کثرت سے ہیں) یہ کہنا کہ تم راسخین فی العلم میں سے نہیں ہو لہٰذا مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کر لو اور اسی پر یقین رکھو، کس طرح ان کے دل کو تشفی دے سکتا ہے؟ کیونکہ یقین کوئی اختیاری چیز نہیں ہے بلکہ اضطراری شے ہے کہ جب تک وہ شبہ رفع نہ ہو جس سے یقین میں خلل ڈالا ہے، ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس ضرور ہے کہ ہر ایک امر قابل بیان کی حقیقت اور قابل تاویل کی تاویل ان کے سامنے بیان کی جائے اور اس صورت میں جو لوگ ان باتوں کے بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بیان نہیں کرتے، وہ اسی دلیل سے کافر قرار پاتے ہیں جس دلیل سے کہ ابن رشد نے ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کو کافر بتایا ہے۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ "فرض کرو ان متشککین کو اس قدر لیاقت نہیں ہے

کہ وہ اُن حقیقتوں اور تاویلوں کو سمجھیں مگر اتنی بات تو اُن پر ثابت ہو گی کہ اُس کے لیے دلیلیں اور اُس کی صداقت کے ثبوت کے لیے وجوہات اور اُس کی حقیقت کے لیے بیانات ہیں مگر ہم اُن کو سمجھ نہیں سکتے۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُن کے سمجھانے کا جو فرض ہم پر تھا اُس کو تو بلاشبہ ہم ادا کر دیں گے بہت لوگوں نے پیغمبروں کی نصیحتوں کو نہیں سمجھا مگر پیغمبر اس خیال سے کہ وہ اُن کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں نصیحتوں کے سمجھانے سے باز نہیں رہے بلکہ طرح طرح سے سمجھایا اور کوشش کی کہ اُن کو اُن کے سمجھنے کے لائق کریں۔"

"اس خوف سے کہ اُن لوگوں کے نزدیک جب ظاہر معنی باطل ہو جائیں گے اور اصل حقیقت یا تاویل کے سمجھنے کے لائق نہ ہونے کے سبب وہ اُس کو نہ سمجھیں گے تو اصول شرع سے منکر ہو جاویں گے اور کفر تک نوبت پہنچاویں گے ہم کو حقیقت اور صداقت کے بیان سے باز نہیں رہنا چاہیے۔ اگر یہ الزام صحیح ہو تو قرآن مجید بھی باایں ہمہ خوبی اس الزام سے بری نہیں رہ سکتا۔ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ " یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا۔"

ابن رشد نے اپنی تقریر میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان باتوں کا بیان کرنا خاصکر اس حالت میں اور بھی زیادہ خطرناک ہے جب کہ اصول شریعت میں تاویلات فاسدہ ہونے لگیں جیسا کہ ہمارے (یعنی ابن رشد کے) زمانہ میں لوگوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے۔ اس تقریر پر سر سید یہ ریمارک کرتے ہیں کہ " تاویلات فاسدہ بھی اگر ہوں تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں، اس لیے کہ جو چیز غلط ہے اُس کی غلطی بہت دیر پا نہیں ہو سکتی، دوسروں کو اس کی غلطی بیان کرنے کا اور غلط کو صحیح کرنے کا موقع ملتا ہے اور اگر وہ بیان ہی نہ کی جاویں تو سچ بات کے ظاہر ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں آ سکتا۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جب کہ علما نے اس قسم کی رائیں لکھیں، علم ایک نہایت محدود فرقہ میں تھا جس کو وہ اپنے خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا ہی پسند نہیں کرتے تھے اور تمام لوگ اعلیٰ وادنیٰ علوم کے ادنیٰ ادنیٰ مسائل سے بھی بے بہرہ تھے اور ان کے دل شبہات و تشکیکات سے پاک تھے اور یہی باعث ہُوا کہ اُن علما نے ایسی رائے قائم کی تھی۔ مگر وہ زمانہ گیا، علوم وحکمت اب اس قدر عام ہوگئی کہ ایک بہت بڑا حصہ دنیا کا اس سے واقف ہوگیا۔ طفل دبستان اپنے مکتب میں ارسطو اور افلاطون کی غلطیوں کا جہاں جہاں انھوں نے کی ہیں، ذکر کرتا ہے۔ ہزاروں آدمی ہر شہر و قصبہ میں ایسے موجود ہیں جو خود کچھ نہیں جانتے مگر بہت سے مسائل علوم وحکمت کے سُن سُن کر کان آشنا ہو گئے ہیں اور اکثر الناس وہ ہیں جن کے دل شبہات و تشکیکات سے مملو ہیں۔ اس زمانہ میں جو اہل علم ہیں اُن کا ایمان بھی حلق کے نیچے تک نہیں ہے، منہ سے کہتے ہیں کہ جو کچھ قرآن وحدیث میں آیا ہے اُس پر یقین کرنا چاہیے مگر دل میں شبہات بھرے پڑے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یقین کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ ہونے سے ہوتا ہے۔ پس اب زمانہ ہے کہ جو کوئی بقدر اپنی طاقت کے ان تمام حقائق اور تاویلات کو نہ کھولے اور لومۃ لائم سے نڈر ہوکر اگلے علما کی اُن غلطیوں[۱] کو جو اس زمانے کے ناممکل علوم اور ناممکل

---

[۱] سرسید کے اس بیان میں کسی قدر تسامح ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مطلب اُن کو اس طرح ادا کرنا چاہیے تھا کہ "نڈر ہوکر اُن باتوں کو جن کے بیان کا اب پہلے کبھی وقت نہیں آیا تھا اور اس لیے ہمارے قدیم مفسرین اُن کے بیان کرنے سے ساکت رہے تھے عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔" (۲۰)

تحقیقات کے سبب خلائق کے بیان اور قرآن مجید کی تفسیر میں راہ پا گئی ہیں عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے، وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ومن یفعل ذالک فھو ذی حق اللہ وحق دینہ وحق اہل دینہ و قومہ واللہ المستعان۔

سوشل ریفارم

اگرچہ ہندوؤں میں اس صدی کے آغاز سے وقتاً فوقتاً ایسے اولوالعزم آدمی اٹھتے رہے ہیں جنھوں نے اپنی قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح پر کمر باندھی ہے. جیسے راجہ رام موہن رائے. بابو کیشپ چندر سین، ایشر چندر رود یا ساگر، سر لشی چندر، بھٹا چارج رام تنو لاہیری، سوامی دیا نند سرتی وغیرہ وغیرہ. مگر مسلمانوں میں ظاہرا دو شخصوں کے سوا کہ دونوں دلی کی خاک سے اٹھے. کسی نے اس کام پر ہاتھ نہیں ڈالا. ایک مولانا اسمٰعیل اور دوسرے سید احمد خاں، گوکہ زمانے کے اقتضا سے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں جن کو قوم کی سوشل خرابیاں محسوس ہونے لگی ہیں. مگر اتنی جرأت کسی کو نہیں ہوتی کہ تمام قوم کے برخلاف کسی بڑی رسم یا ربت کو ترک یا کسی اچھی بات کو اختیار کیا جا سکے. سر سید نے اپنی تحریر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اکثر لوگ ہیں جو بہت سی رسموں کو بُرا جانتے ہیں مگر ان کو چھوڑ نہیں سکتے اور بہت سی باتوں کو اچھا جانتے ہیں مگر ان کو اختیار نہیں کرتے. بعضے تو یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ مداخلت کرے تو قرار واقعی اصلاح ہو. مطلب یہ ہے کہ ہم بدنامی سے بچیں اور گورنمنٹ بدنام ہو اور بعضے کہتے ہیں کہ برادری کا اتفاق ہو تو کام چلے۔ اس کے بعد وہ لکھتے

ہیں کہ، لوگ اصلاح اور ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں۔۔۔۔۔مگر میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو اس کو چاہیے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اس رسم کو توڑے یا اس میں اصلاح اور ترقی کرے۔ بیشک تمام قوم اس کو برا کہے گی اور نکو بنائے گی۔ مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے اور جس طرح کہ اولاً وہ ہدف تیر ملامت ہوا تھا انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جائے گا۔"

بلاشبہ جس شخص میں قوم کے برخلاف کسی کام کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ کسی قوم کا مصلح بننے کی لیاقت نہیں رکھتا۔ سرسید میں یہی چیز تھی جس نے ان کو اس منصب جلیل کے لائق بنایا تھا۔ ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ کسی شخص نے حلت طعام اہل کتاب کے باب میں سرسید کی ایک تحریر دیکھ کر یہ لکھا تھا کہ "کاش ہم سید صاحب کو اپنے قول کے موافق عمل کرتے ہوئے بھی دیکھیں"۔ سرسید نے فوراً اس کے جواب میں لکھا کہ:

"نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن وطعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔"

جو کام سرسید کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے اور جن کا کرنا نہ کرنا خود ان کے اختیار میں تھا ان میں رسم و رواج کی پابندی کو انھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شادی غمی اور تیج تہوار میں جو فضول رسمیں قوم میں جاری ہیں سرسید

کے گھر میں کہیں اُن کا نام ونشان نہ تھا۔ انھوں نے اس بیٹے کا نکاح جو ہائی کورٹ کا جج تھا دلّی میں جاکر ایسا چپ چپاتے کردیا کہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا کسی کو خبر تک نہیں ہوئی اور اس خوشی میں بجائے اس کے کہ توره بندی یا دعوت وغیرہ میں زرِ خطیر خرچ کیا جاتا ایک مناسب رقم مدرسۃ العلوم کی نذر کرکے تقریب کو ختم کر دیا۔ پوتے کی بسم اللہ میں علیگڑھ سے دلّی جانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس تقریب میں وطن سے بلایا۔ جب کانفرنس کا جلسہ ختم ہو چکا اُسی قومی مجمع میں بسم اللہ پڑھی گئی اور حاضرین کو معمولی شیرینی تقسیم ہونے کے بعد پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیا گیا۔

سرسید کی کوشش سے جو نمایاں انقلاب مسلمانوں کی سوشل حالت میں ہُوا وہ اُس مغائرت اور نفرت کا دُور ہونا تھا جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مثل سمندر کے حائل ہو رہی تھی۔ حالانکہ دینِ اسلام اہلِ کتاب کے ساتھ دوستی اور میل جول رکھنے، اُن کا کھانا اور ذبیحہ کھانے اور اُن کے ہاں شادی کرنے کی صاف صاف اجازت دیتا تھا اور تمام ممالکِ اسلامیہ میں اُن کے ساتھ یہی برتاؤ دیکھا اور سُنا جاتا تھا باوجود اس کے ہندوستان کے مسلمان مثل ہندوؤں کے اُن کی ہر ایک چیز سے اجتناب کرتے تھے۔ اُن کے ہاں کی پکی ہوئی چیز کو نجس جانتے تھے اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے کو عیسائی ہو جانے کے برابر خیال کرتے تھے جس کا سبب کچھ تو ہندوؤں کی تقلید تھی جن سے صدہا رسمیں اور عادتیں ہندوستان میں آکر مسلمانوں نے سیکھی تھیں اور کچھ قومی تعصبات تھے جو ایک مدت تک مفتوح قوم کو نیچرل طور پر فاتح قوم کے ساتھ رہنے مقدر ہیں۔ مسلمانوں کی یہ نفرت اور کراہیت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اس بات میں جو کچھ شریعت کا حکم ہے اُس کو علما عوام الناس کے سامنے

صاف صاف بیان نہیں کر سکتے تھے اور اگر کوئی عالم ایسی جرأت کر بیٹھتا تھا تو اس کی بات کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا اور اُس کی طرف سے کھٹک جاتا تھا ایک اور وجہ سے بھی علما مسلمانوں کو انگریزوں کے میل جول سے مانع آتے تھے، اُن کو خوف تھا کہ حاکم و محکوم قوم کا میل جول، خاصکر اُس صورت میں کہ حکمراں قوم اپنے دین کی اشاعت میں سرگرم ہو، ضرور ہے کہ محکوم قوم کو حاکموں کے مذہب کی طرف مائل کرے۔

الغرض غدر سے پہلے مسلمان عموماً انگریزوں کی مخالطت سے اور ہر ایک بات میں اُن کے ساتھ تشبہ کرنے سے پرہیز کرتے تھے مگر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی وجہ نفرت کی نہ تھی لیکن غدر کے بعد انگریز بھی مسلمانوں سے کھنچنے لگے اور دونوں قوموں کا جمع کرنا مثل اجتماع نقیضین کے محال ہو گیا۔ مگر سرسید کو خوب یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کی اصلاح

لے معتبر ذریعہ سے سنا گیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک شریف مسلمان مولوی نے جو میان دوآب کے کسی ضلع میں منصف یا صدر امین تھے ایک روز کسی یورپین حاکم کے بنگلہ پر اس کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ یہ خبر فوراً مشہور ہو گئی۔ مولوی صاحب کی برادری نے اُن کو ذات سے خارج کر دیا۔ انھوں نے ہر چند اہل برادری کے سامنے آیتیں اور حدیثیں پڑھیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ مولوی کے مخالف اور کچھ موافق دہلی میں شاہ صاحب سے مسئلہ پوچھنے کو آئے جب شاہ صاحب کے مدرسہ کے دروازہ پر پہنچے تو شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین اندر سے نکلتے تھے اُن لوگوں نے پہلے انھیں سے مسئلہ پوچھا۔ شاہ رفیع الدین نہایت صاف گو اور آزاد طبع آدمی تھے انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ جنھوں نے مولوی کو ذات سے خارج کیا انھوں نے جھک مارا اس نے کوئی کام شرع کے خلاف نہیں کیا مگر کسی نے اُن کا

سکے لیے جس طرح اُن میں مغربی تعلیم کا پھیلانا ضروری ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اُن کے اور حکمراں قوم کے سوشل تعلقات کو ترقی اور استحکام دینا ضروری ہے جب تک دونوں قوموں میں دوستانہ معاشرت اور میل جول پیدا نہ ہوگا اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے اصلی خیالات سے آگاہی حاصل نہ ہوگی اُس وقت تک آپس میں صفائی اور خلوص اور اعتبار پیدا نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر مسلمانوں کی مخالفت کے انگریزوں کے طرف سے بھی بہت سی رکاوٹیں نظر آتی تھیں سب سے بڑا عذر انگریزوں کو یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ جن کے ہاں عورتوں کے پردہ کا رواج ہے، کسی طرح ہمارا دوستانہ میل جول نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ سرسید اس کا یہ جواب دیتے تھے کہ مسلمان جس طرح اپنی عورتوں کو غیر قوموں کے مردوں سے چھپاتے ہیں۔ اسی طرح اپنے مسلمان دوستوں اور دور کے رشتہ داروں سے بھی چھپاتے ہیں مگر اس سے باہمی دوستی اور یگانگت میں کچھ فرق نہیں آتا، پھر کیا وجہ ہے کہ پردہ کی پابندی سے ہماری اور انگریزوں کی دوستی اور سوشل تعلقات میں فرق آئے

(بقیہ)
کہنا نہیں مانا اور بڑے صاحب کے پاس پہنچے انھوں نے صورت حال سن کر ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس مولوی نے ایسا کام کیا ہے کہ قریب کفر کے پہنچ گیا ہے۔ جو لوگ مولوی کے مخالف تھے وہ یہ سُن کر خوش ہو گئے مگر اس کے طرفداروں نے پوچھا کہ حضرت وہ اب کس طرح مسلمان بھی ہو سکتا ہے؛ شاہ صاحب نے فرمایا کہ کفر کے قریب پہنچ جانے سے کوئی کافر نہیں ہو جاتا اس لیے وہ اسلام سے خارج نہیں ہوا مگر احتیاطاً اس کو پانچوں کلمے اور آمنت باللہ پڑھواؤ اور قدم شریف کا پانی پلواؤ اور پھر برادری میں شامل کر لو۔ اگر شاہ صاحب اس انداز سے تقریر نہ کرتے تو غالباً اُن کا کہنا بھی کوئی نہ مانتا اور ان مولوی کو برادری میں شامل نہ کیا جاتا۔۱۲

مگر حق یہ ہے کہ ایسی دو مختلف قوموں میں دوستانہ میل جول ہونا غیر ممکن ہے جن میں سے ایک قوم میں عورتوں کا مردانہ سوسائٹی میں شریک ہونا اس کے لیے باعث عزت سمجھا جائے اور دوسری قوم میں باعث شرم۔ لیکن باوجود ایسے سخت موانع کے سرسید نے اپنے مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ سرسید کی کوشش نے انگریزوں میں مسلمانوں کے ساتھ کہاں تک موانست پیدا کی ہے! اور اُن کی دیرینہ آرزو اس باب میں کس حد تک پوری ہوئی ہے! اور اگر سرسید کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو انھوں نے ۱۸۸۹ء میں ایک موقع پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کے سامنے صاف صاف کہدیا تھا کہ "ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی" لیکن اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سوشل معاشرت اور ان کا سوشل برتاؤ جو غدر کے بعد تک انگریزوں کے ساتھ تھا اُس میں جس قدر انقلاب گذشتہ تیس برس میں ہوا ہے اگر سرسید کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو اس کے لیے ایک صدی بھی مشکل سے کافی ہوسکتی تھی۔ اگرچہ ابھی اس بات کا فیصلہ کرنا باقی ہے کہ طریق معاشرت میں انگریزوں کی تقلید کرنا کہاں تک ہماری حالت کے مناسب ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت کو قومی تعصبات کی بیڑی اور ملکی رسم و رواج کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا ہے اور وہ اس قابل ہوگئے ہیں کہ جس بات کو اپنے حق میں قرین مصلحت جانیں اس کو اختیار کریں اور جس بات کو مضر سمجھیں اُس کو ترک کریں۔

اگرچہ سرسید نے مسلمانوں کی باہمی معاشرت کی اصلاح کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہیں کی بلکہ اُن کی سوشل حالت جو انگریزوں کے ساتھ تھی زیادہ تر اُسی کی اصلاح پر توجہ کی ہے لیکن درحقیقت انھوں نے مذہبی خیالات کی

اصلاح اور مغربی تعلیم کی اشاعت سے قومی سوسائٹی کی عام اصلاح کا بیج بو دیا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مسلمانوں میں بہت سی سوشل خرابیاں تو ہندوستان میں رہنے اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوتی ہیں اور بہت سی غلط مذہبی خیالات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں اور بعض نے دیگر وجوہ و اسباب سے وجود پکڑا ہے اور ان تمام خرابیاں کی تعداد اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی اصلاح کے لیے ایک طول طویل زمانہ اور بہت سے مصلح درکار ہیں۔ اس لیے بجائے اس کے کہ وہ جزئیات کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے انھوں نے جہاں تک کہ ممکن تھا مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح میں جو تمام اصلاحوں کی جڑ ہے کوشش کی۔ سب سے پہلے انھوں نے مذہبی خیالات و اوہام کی اصلاح کو ضروری سمجھا کیونکہ جن باتوں کو لوگ غلطی سے مذہب پر مبنی سمجھ لیتے ہیں اُن کا چھوٹنا قریب ناممکن کے ہو جاتا ہے دوسرے سب سے بڑا ذریعہ خیالات کی اصلاح کا مغربی تعلیم کی اشاعت تھی جس نے یورپین اقوام کو حسن معاشرت میں تمام دنیا پر فائق کر دیا ہے سو اُس کی اشاعت میں جو کار نمایاں انھوں نے کیے وہ سب پر ظاہر ہیں۔

تصنیف و تالیف

اگرچہ سرسید کی طبیعت ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ جو کام اُن کو پیش آتا تھا اس میں وہ ایسی دلچسپی ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہی اُن کا خاص کام اور ضروری فرض تھا؛ کالج کی تعمیر، بجٹ کی تیاری، جلسوں کا انتظام، مہمانوں کی مدارات، چندے وصول کرنے کی تدبیریں۔ غرضکہ ہر ایک کام کو وہ یکساں ذوق و شوق اور یکساں دلبستگی کے ساتھ انجام دیتے تھے مگر خود اُن کا یہ بیان تھا کہ جیسا

تصنیف وتالیف میں جیسا جی لگتا ہے ویسا اور کسی کام میں نہیں لگتا اور فی الواقع، جیسا کہ دیکھا گیا ہے، رنج میں، خوشی میں، صحت میں، بیماری میں خلوت میں اور جلوت میں اس مشغلہ سے ان کا جی نہیں اکتا تھا. گرمی کی دوپہر دن میں، جبکہ ایک صبح خیز آدمی ضرور آرام لینا چاہتا ہے، یہ شخص ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف پایا جاتا تھا. بیماری کی حالت میں ان کو کبھی نہیں دیکھا کہ دوپہر کو پلنگ پر جاکر کرسیدھی کی ہو. بارہا ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ علالت یا کسی اور وجہ سے رات کو نیند اچاٹ ہو گئی اور انھوں نے میز کرسی پر بیٹھ کر کسی مضمون کے لکھنے میں صبح کردی. جہاں اور لوگ بیماری کی راتیں لوگوں کو جگا کر یا قصے کہانیاں سن کر یا اَئے وائے کر کر بسر کرتے ہیں. یہ شخص اس جانکاہ اور دماغ سوز فکر سے دل بہلاتا تھا.

جس زمانہ میں سرسید نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی اُس زمانہ کا حال اُن کے قدیم دوست محمد سعید خاں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ میں اُن دنوں میں اکثر اُن کے ساتھ رہا ہوں. سرسید نے اس زمانے میں رات کو پلنگ پر سونا قطعاً ترک کر دیا تھا. چونکہ اُس وقت تک کرسی کی نشست کی عادت نہ تھی فرش ہی پر چاروں طرف کتابیں پھیلی رہتی تھیں اور کتابوں کے بیچ میں اُن کی نشست رہتی تھی. کبھی کبھی بات چیت کے لیے مجھے بھی پکڑ بٹھاتے تھے، نہ خود سوتے تھے اور نہ مجھے سونے دیتے تھے. باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تفسیر بھی لکھتے جاتے تھے اور اس غرض سے کہ نیند نہ آئے بار بار خود بھی چائے پیتے تھے اور مجھے بھی پلاتے تھے. جب نیند کا بہت ہی غلبہ ہوتا تھا وہیں کسی کتاب پر سر رکھ کر گھنٹا آدھ گھنٹے سو رہتے تھے اور پھر اٹھ کر لکھنے لگتے تھے اسی طرح ساری رات گذر جاتی تھی.

سرسیّد کے دماغ میں تصنیف و تالیف کے متعلق دو خاصیتیں عجیب و غریب تھیں۔ ایک یہ کہ مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں ان کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے۔ اُن کے دفتر کا بڑا کمرہ، جہاں وہ بیٹھ کر کام کرتے تھے، صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اسی مجمع میں جہاں وہ اور سب کام کرتے تھے تصنیف و تالیف کا دشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا۔ مشکل سے مشکل مضامین جو اکثر جمہور کی رائے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے اور جن میں قدیم علمائ اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی، اُن کے لیے بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لیے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیا ہو یا اُن کے پاس بیٹھنے سے تنگدل ہوتے ہوں یا لوگوں کے اٹھ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا ملتوی کر دیا ہو۔ بے شک جب کوئی مہمان باہر سے آتا تھا، یا کسی دوست سے مدت کے بعد ملاقات ہوتی تھی یا کسی اور خاص وجہ سے ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا بند کر دیتے تھے، مگر ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ حاضرین کے ہجوم کے سبب اُن کے خیالات پراگندہ ہو گئے ہوں اور اس لیے انھوں نے مضمون لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں اور آپس میں دلچسپ بحثیں یا ہنسی چہل کی باتیں کر رہے ہیں جن سے خواہی نخواہی ایک کامی آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے۔ مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی ادھیڑ بن میں مستغرق ہے۔ کبھی لکھتا ہے اور کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق خبر نہیں ہوتا۔ تاہم یہ نہیں کہتے کہ اوروں کے

کے مجمع عام میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کرنا غیر ممکن ہے بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ مذہب کو انیسویں صدی کے سائنس پر منطبق کرنا یا کسی مذہبی مسئلہ کی نسبت جمہور کے برخلاف رائے قائم کرنا ایسی غیر مطمئن حالت میں سید احمد خاں کے سوا دوسرے شخص کا کام نہ تھا۔

دوسری خاصیت شاید اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز تھی۔ جب مصنف کسی ایسے مضمون پر قلم اٹھاتا ہے جس کو اس سے پہلے کسی نے نہ لکھا ہو اور جو ترتیب کے لباس سے اب تک عاری ہو (جیسی کہ عموماً سرسید کی مذہبی تحریریں ہوتی ہیں) تو اس کے ذہن میں خیالات کا ایک بے ترتیب اور غیر منتظم انبار ہوتا ہے جس کا مرتب اور منتظم کرنا اور ہر ایک پوائنٹ کو اس کے مناسب موقع پر رکھنا اس مصنف کا فرض سمجھا جاتا ہے مگر یہ ایک ایسا دشوار کام ہے کہ مصنف کو اکثر اوقات کئی کئی دفعہ ترتیب بدلنی اور بار بار کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے۔ سرسید جب کسی مضمون کو خود لکھنا یا کسی پشیدست سے لکھوانا شروع کرتے تھے (اگرچہ کیسا ہی مشکل اور طولانی مضمون ہو) یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے تمام پوائنٹس سلسلہ وار اپنے اپنے محل اور موقع پر ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، صرف ان کو الفاظ کا لباس پہنانا باقی ہے چنانچہ مستثنےٰ حالتوں کے سوا کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس ترتیب سے انھوں نے کوئی مضمون لکھنا شروع کیا ہو اس کو بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اسی چال سے آخر تک نہ پہنچا دیا ہو۔ اس مطلب کے زیادہ دلنشین ہونے کے لیے ناظرین مندرجہ ذیل مثال پر غور کریں۔

سرسید نے معراج کے مسئلہ کا بیان اپنی تفسیر کی چھٹی جلد میں ۱۲۱ صفحہ

پر لکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ پر زمانۂ حال کی ضرورت کے موافق نہ پہلے کسی نے ایسا لکھا ہے اور نہ آیندہ اُس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس مضمون کے لکھنے کی جو کیفیت ہم کو معلوم ہوئی اُس کو سُن کر اور پھر اس مضمون کی وسعت کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے۔

مولوی سیّد وحید الدین سلیم جنھوں نے تفسیر کے لکھنے میں کئی سال تک برابر سرسید کو مدد دی ہے اُن کا بیان ہے کہ "جب تفسیر کی نوبت سورۂ بنی اسرائیل تک پہنچی اور سید صاحب نے معراج کے مسئلہ پر مفصل بحث کرنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے کہا کہ "جس قدر روایتیں صحاح اور دیگر کتب حدیث میں معراج اور شق صدر کے متعلق اور اس باب میں صحابہ کے اختلاف کے متعلق وارد ہوئی ہیں اور عقل و نقل کی تناقض کی صورت میں جو رائیں اور اقوال علما کے ہیں اُن سب کو آپ اس طرح پر کتابوں میں سے انتخاب کر کے نقل کر لیں کہ ایک ایک صفحہ پر اُن کو لکھتے جائیں اور دوسرا صفحہ کورا چھوڑتے جائیں۔" میں نے کتابیں دیکھنی شروع کیں اور بے شمار روایات و اقوال علما جو کہ سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں درج ہیں، موافق ہدایت کے نقل کر کے سید صاحب کے سامنے پیش کیں۔ میں سمجھتا تھا کہ جب میں تمام روایتیں اور اقوال نقل کر لوں گا اُس وقت سید صاحب ان کو دیکھ کر معراج کے مسئلہ پر لکھنا شروع کریں گے۔ مگر میرا یہ خیال غلط تھا۔ انھوں نے اس مضمون کو اُس ترتیب پر جو اُن کے ذہن میں تھی بجائے خود اُسی وقت لکھنا شروع کر دیا تھا جب کہ مجھکو روایات وغیرہ کے نقل کرنے پر مامور کیا تھا۔ وہ مسودہ کے ہر ایک صفحہ پر کہیں کہیں کچھ عبارت لکھتے تھے اور کہیں سفید ہی چھوڑتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ میں ابھی اپنا کام پورا کرنے نہ پایا تھا کہ جو کچھ اُن کو لکھنا

تھا وہ سب لکھ چکے اور اس مضمون کو کچھ کم ڈیڑھ سو صفحوں پر ختم کر دیا۔ جب
میں اُن بے شمار روایتوں اور اقوال کا دفتر لے کر پہنچا تو انھوں نے وہ تمام
کاغذات لے کر اُن کو قینچی سے کترتا اور اُن ٹکڑوں کو جا بجا سفیدیوں پر
لئی سے چپکانا شروع کیا یہانتک کہ تمام پرچے جن کا شمار بتانا مشکل ہے
جہاں جہاں اُن کا موقع تھا چپکا دیے اور کاتب کو صاف کرنے کے لیے دیدیا۔
جب تمام مسودہ صاف ہو چکا اور میں نے اُس کو اول سے آخر تک پڑھا تو
مضمون کی ترتیب اور انتظام اور تمام روایات و اقوال علما کو اپنے اپنے موقع
پر چسپاں دیکھ کر میرے ہوش جاتے رہے" وہ کہتے ہیں کہ سرسید کو مسودہ لکھتے
وقت ان روایات کے مضمون سے اس کے سوا کچھ علم نہ تھا کہ جب میں کتابوں
میں روایتیں تلاش کر رہا تھا اُس وقت جس قسم کے اختلافات ان میں پائے
جاتے تھے اُن کا ذکر بالاجمال سرسید کے سامنے ہوتا رہتا تھا صرف اس قدر
واقفیت پر انھوں نے تمام مضمون کا خاکا اپنے ذہن میں کھینچ لیا تھا اور ہر
ایک روایت کا موقع اور محل جہاں جہاں کہ ہونا چاہیے تھا قرار دے لیا تھا۔

اگرچہ یہ دونوں خاصیتیں جو ہم نے سرسید کی مصنفانہ قابلیت کے
متعلق بیان کیں۔ فی نفسہ عجیب ہیں مگر اُن سے سوا اس شخص کے جو اُن کی
طرز تصنیف کو بہ نظر غور دیکھتا رہا ہو دوسرا واقف نہیں ہو سکتا۔ اب
ہم ایک تیسری خاصیت کا ذکر کرتے ہیں جس کو ہر سمجھدار آدمی جو اُن کی
تصنیفات کو دیکھے گا یقیناً تسلیم کریگا اور اس سے ہماری مراد **قوت استدلال**
ہے۔ ظاہر ہے کہ سرسید کی بعض پولٹیکل اور اکثر مذہبی تحریریں ایسی ہیں جن میں
انھوں نے ایک جماعت کثیر یا جمہور اہل اسلام سے اختلاف کیا ہے، باوجود
اس کے اُن کو اپنے دعوے کے اثبات میں خلاف توقع اکثر ایسی کامیابی ہوئی

ہے جیسی کہ ایک مسلم الثبوت رائے کی تائید کرنے والے کو ہونی چاہیے۔

اسباب بغاوت میں جو کچھ انھوں نے لکھا وہ تمام اینگلو انڈینز بلکہ شاید تمام انگلش نیشن کی رائے کے برخلاف تھا اور اسی لیے اس کا مارشل لا کے دور دورہ میں شائع کرنا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے جس دھڑتے سے کہ اس کا بہت بڑا حصہ منوایا گیا اور جو کام کہ اس نے اعیان سلطنت کے غیظ وغضب کی آگ بجھانے میں کیا اور جو عمدہ نتائج اس پر مترتب ہوئے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر مدلل اور موجّہ لکھا گیا تھا اور اس میں کیسے صحیح اصول پر استدلال کیا گیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو ایک ایسے خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لیے لکھا گیا تھا جو عموماً مدبران سلطنت کے دل میں جما ہوا تھا اور جس کو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب نے اور بھی زیادہ پختہ کر دیا تھا، لیکن اس ریویو کے شائع ہونے سے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے، اس خیال کی غلطی علی العموم سب پر ظاہر ہو گئی۔

جس وقت کہ سرسید نے غلامی کے مسئلہ پر جمہور اہل اسلام کے برخلاف رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تو مولوی سید مہدی علیخاں نے ان سے کہا کہ تم اس باب میں ایک حرف بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسا نہیں لکھ سکتے جو اصول اسلام کے موافق صحیح ہو۔ لیکن جب انھوں نے سرسید کا ابطال غلامی کا مضمون تہذیب الاخلاق میں اول سے آخر تک پڑھا تو ان کو ماننا پڑا کہ اسلام نے فی الواقع ہمیشہ کے لیے غلامی کا استیصال کر دیا ہے یہاں تک کہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک موقع پر صاف صاف لکھ دیا ہے کہ جن مسائل میں ہم اور سید مہدی علی متفق ہیں انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ "اسلام میں رقیّت نہیں ہے۔"

مسلمانوں کا جہاد کا مسئلہ جو تمام عیسائی دنیا میں انگشت نما تھا اور جس سے بڑھ کر کوئی بے رحمی اور ناخدا ترسی کا کام نہ سمجھا جاتا تھا، اس کا مقابلہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، سرسید نے انجیل کے اس مشہور اخلاقی حکم سے کیا ہے کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دے" اور نہایت عام فہم طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ فطرت انسانی کے موافق اور قابل عملدرآمد جہاد کا حکم ہے جو قرآن میں آیا ہے نہ انجیل کا وہ اخلاقی حکم جو قرآن کی تعلیم پر اعتراض کرتے وقت مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جس پر نہ آجتک کبھی عمل ہوا ہے نہ آیندہ ہونے کی امید ہے۔

اسی طرح سرسید کی تصنیفات میں بشمار مقامات ایسے نکلیں گے جو بادی النظر میں ممتنع الثبوت معلوم ہوتے ہیں مگر جب اُن دلائل پر نظر کی جاتی ہے جو سرسید نے اُن کے ثبوت میں پیش کی ہیں تو مخالفوں کو بھی بشرطیکہ تعصب سے خالی ہوں، تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں معلوم ہوتا۔

ہمارے نزدیک مصنفوں میں سرسید کا جو درجہ خاصکر مذہبی تصنیف و تالیف کے لحاظ سے قرار پا سکتا ہے اُس کا ٹھیک اندازہ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا، کیونکہ اس وقت کچھ لوگ اُن کے حد سے زیادہ معتقد ہیں جن کو اُن کی تصنیفات میں کوئی لغزش یا خطا نہیں معلوم ہوتی اور بہت بڑا گروہ اُن کے منکروں اور مخالفوں کا ہے جن کو اُن کی مذہبی تحریروں میں کفر والحاد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پس جب تک یہ دونوں گروہ موجود ہیں اُن کی تصانیف کے باب میں بغیر حیف ومیل کے رائے دینے کی کسی سے اُمید نہیں ہو سکتی۔

اس کے سوا اول تو مسلمانوں کے خیالات میں عموماً یہ بات جمی ہوئی ہے

کہ اعلیٰ درجہ کی مذہبی تصنیفات کے لیے ضرور ہے کہ وہ عربی یا کم سے کم فارسی زبان میں ہوں۔ اُردو زبان میں کیسے ہی محققانہ مضامین لکھے جائیں اور کیسے ہی بلند خیالات ظاہر کیے جائیں ان کے نزدیک وہ اُردو کی معمولی کتابوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ دوسرے جن لوگوں نے تقلید کے دائرے سے نکل کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے اُن کی تصنیفات ہمیشہ علمائے دین کے حلقوں میں ایک مدت تک مردود و مطرود رہی ہیں۔ لیکن چونکہ حق کبھی نہ کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا اس لیے آخر کار لوگ ان کے حسن و قبح کی چھان بین کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور انھوں نے صواب کو خطا سے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کیا ہے اور باوجود اُن کی غلطیاں ظاہر ہونے کے جن سے کسی محقق کا کلام محفوظ نہیں ہو سکتا جس درجہ کے وہ مستحق تھے وہ درجہ اُن کو دیا گیا ہے۔

طرزِ تحریر

سرسید کی طرزِ تحریر پر کچھ ریمارک کرنا جس قدر ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ ضرورت تو ظاہر ہے کیونکہ بیوگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام کلی و جزئی حیثیات پر بحث نہ کر سکے تو کم از کم اُس کی نمایاں اور مسلّم لیاقتوں کو دکھائے بغیر اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ پس سرسید کی طرزِ تحریر جس نے تیس پینتیس برس کے عرصہ میں اُردو لٹریچر کا رُخ پھیر دیا اور مسلمانوں کے پولیٹکل، سوشل اور مذہبی خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اُس کے بیان سے کیونکر خاموش رہا جا سکتا ہے اور مشکل اس لیے ہے کہ جس تحریر میں بجائے "تاثیر اور بہ کرشمہ تھا اُس کو ہم اُن متعارف خوبیوں سے جو مشرقی لٹریچر میں کلام کی

عمدگی کا معیار سمجھی جاتی ہیں، بظاہر معرا پاتے ہیں۔ پس اس بات کا دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جو تحریر تشبیہات و استعارات سے، صنائع لفظی و معنوی سے، شاعرانہ نزاکتوں سے اور فاضلانہ و نبشیانہ تراش خراش سے خالی نظر آتی ہے اُس میں وہ کیا چیز تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں ایسے غیر مترقبہ نتائج پیدا کر دیے۔ لیکن چونکہ سرسید کی بائیوگرافی لکھنے کا مشکل کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے اس لیے چار و ناچار ہم کو کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے۔

سرسید کی ابتدائی تحریریں غالباً سیدالاخبار[1] میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں جس کو اُن کے بڑے بھائی سید محمود خاں نے ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں اُس وقت جاری کیا تھا جبکہ سرسید کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔ اگرچہ اُس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک انھوں نے متعدد کتابیں اور رسالے مذہب اور تاریخ کے متعلق لکھے اور اُن میں سے بعض کتابیں (جیسے آثار الصنادید) بدرجۂ غایت مقبول اور مشہور بھی ہوئیں لیکن طرز تحریر میں اُس وقت تک کوئی ایسی صریح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جس کے لحاظ سے سرسید کو اُردو لٹریچر میں کسی ممتاز حصہ کا مستحق کہا جا سکے۔

البتہ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی جو سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے، وہ ۵۷ء سے پہلے کی تحریروں میں بھی، جبکہ تصنع اور تکلف انشا پردازی کا زیور سمجھا جاتا تھا، بیلا ہر پائی جاتی ہے اور آثار الصنادید کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے، وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔

---

[1] چونکہ سید احمد کا عرف اس زمانہ میں سید تھا اور اُن کے بھائی کو اُن سے بہت محبت تھی اس لیے اخبار کا نام اُن کے عرف کے لحاظ سے سیدالاخبار رکھا تھا۔ ۱۲

معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت طبع سلیم کے اقتضا سے خود سرسید کی طرز تحریر سیدھی سادی تھی مگر سوسائٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جانکاہ کوشش سے انجام کو پہنچائی ہے، اُن کا حال اپنی سیدھی سادی عبارت میں جو اس وقت خود ان کی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی، تحریر کریں۔ مگر اس ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد وہ بہت جلد اس غلطی سے متنبہ ہوئے اور اُس کو دوبارہ اپنے سیدھے سادے نیچرل اسٹائل میں لکھ کر شائع کیا جس کا فرنچ میں ترجمہ ہو کر فرانس میں چھپا۔

نہایت صحیح اور سچا مقولہ ہے کہ "اذا اراد اللّٰہ شیئاً ھیأ اسبابہ" چونکہ سرسید سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اس لیے خدا تعالےٰ نے اُن کی ذات میں وہ تمام خاصیتیں جمع کر دی تھیں جو ایک ریفارمر میں ہونی ضرور ہیں۔ انھیں خاصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گرامر کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جو اول اول دلی میں اپنے گرد شعرا کا جمگھٹا دیکھ کر ان کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا کچھ بہت دن نہ گذرے کہ وہ ان "تکلفاتِ لایعنی" سے جو شاعری کے لیے لازم ہیں اور خفقان نگاری میں محل ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے۔ انھوں نے سیرت فریدیہ میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ ان کے نانا نے جب کہ وہ بوستان پڑھتے تھے، ان کا سبق سنا۔ سبق میں وہ شعر بھی تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے "طمع را سہ حرف ست ہر سہ تہی" انھوں نے اس کا ترجمہ کیا کہ "طمع کے تین حرف تینوں خالی" نانا نے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوئے مگر

یہ وہی معنی کیے گئے۔ چونکہ محاورہ کے موافق ترجمہ یہی فصیح تھا اس لیے گرامر کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال ان کا اُس بچپن کے زمانہ میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تحریر یا تقریر کی رو میں گرامر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے، وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں، صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے ان کی زبان دلی کی بول چال پر محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی بول چال تھی، غالباً انھوں نے کسی لفظ کے استعمال کرنے وقت یہ خیال نہ کیا ہو گا کہ یہ لفظ اہل زبان بولتے یا نہیں؟ اور کسی فقرہ کو لکھ کر پھر یہ نہ دیکھا ہو گا کہ قواعد کی رو سے اس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟

یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچے ریفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راستبازی۔ وہ مثل شاعروں اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لیے پکارتا ہے، ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسانوں کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔ وہ واقعات پر تشبیہ و استعارہ کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ ان کی ننگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے۔

الغرض سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانہ تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے۔

اپنے اُسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں کیا کتابیں کیا مضامین اور کیا مقدمات کے فیصلے اور تجویزیں، برابر لکھتے رہے۔ اس میں بیس سال کی مشق و مہارت نے جو کہ ایک انداز پر متصل جاری رہی، ضرور ہے کہ اُن کی قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون کو سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی، کیونکہ نیچرل قویٰ سے جب اُن کے مقتضا کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو ان سے اکثر فوق العادۃ کرشمے ظہور میں آتے ہیں مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے والے تھے۔

غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر یا تقریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے! اسی ایک مقصد کے لیے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی، کوئی کلام کی بنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر، کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اہل زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے، اسی طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔

؎ جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

بے شک کلام کے موثر ہونے کے لیے اُس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ موثر بھی ضرور ہوگا۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو جب تک کہ متکلم کا

دل آزادی اور سچائی سے بھرا ہوا نہ ہو، کبھی مؤثر نہیں ہو سکتا جس طرح تلوار کا کاٹ درحقیقت اُس کی باڑھ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے اسی طرح کلام کی تاثیر اُس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی اور اُس کے نڈر دل اور بے لاگ زبان میں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک سچے اور دلسوز ناصح کی زبان سے نکل کر لوگوں کے دلوں پر تیر وسناں کا کام کرتے ہیں ممکن نہیں کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر آئے اُن میں کچھ بھی اثر باقی رہے سچے ناصح کے لعن وطعن میں جو اثر ہوتا ہے وہ جھوٹے واعظ کی بشارتوں میں نہیں ہوتا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت اُن کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔

باوجودیکہ مسلمان صدہا سال سے نہ صرف مذہب میں بلکہ علوم و فنون میں، لٹریچر میں، رسم و رواج میں، اخلاق و عادات میں، طریق معاشرت میں، غرضیکہ ہر چیز میں اگلوں کی لکیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات جس سے کبھی ان کے کان آشنا نہ ہوئے ہوں، ہرگز سُننی نہیں چاہتے تھے مگر سچ میں وہ کرشمہ ہے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا۔ جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر اور سوسائٹی کی رکاوٹوں کو برطرف کر کے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ہے گو کہ وہ قوم کے مذاق اور الف و عادت کے کیسے ہی برخلاف ہوں، اُن میں عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے کہ اُن کے سننے کے لیے کیا موافق اور کیا مخالف سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور دونوں فریق مختلف طور پر اُن سے متاثر ہوتے ہیں، پہلا اُن کو حق سمجھ کر بے چون وچرا قبول کرتا ہے اور دوسرا اُن میں مقبولیت کے آثار نمایاں دیکھ کر خائف ہوتا ہے کہ مبادا یہ خیالات تمام قوم میں شائع ہو جائیں۔ سرسید کی تحریر میں بھی چیز تھی جس نے ان سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادو کا سا اثر پیدا کر دیا

تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی۔

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سرسید کی تحریر جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی درحقیقت اس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب عمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اُترتے جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی بلکہ محاسن لفظی خیالات کی شکوہ میں دب جاتے ہیں۔ اس کے سوا جب مصنف کی ہمت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مقصود ہوتی ہے تو اس کے بیان میں محاسنِ لفظی کی اسی قدر گنجائش ہوتی ہے جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضا ہوتا ہے اور اس لیے وہ عبارت میں اس قدر گھل مل جاتے ہیں کہ جب تک بہ نظر غور نہ دیکھا جائے۔ عام بیان اُن سے سادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں ایسی اجاگر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنفوں کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں ورنہ صنائع لفظی کے سوا اس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں تشبیہیں بھی ہیں، استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں، بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش اور دلفریب ہیں، کہاوتیں اور اشعار برمحل جا بجا نظر آتے ہیں مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اُس میں ایسا بیساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کے قلم سے ٹپکی ہے۔

مگر جو چیز کہ سرسید اور دیگر مصنفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الامتیاز ہے۔ وہ قدرت بیان ہے جس کے ثبوت کے لیے خود اُن کی مختلف تحریروں کا دیکھ لینا کافی ہے۔ مصنف کی قدرت بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہر ایک مضمون کو اُسی پیرایہ میں بیان کر سکے جو اُس مضمون کی حالت کے

مناسب ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے کلام کا پیرایۂ بیان جدا ہوتا ہے جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ہے اُس ڈھنگ پر تاریخ یا بائیوگرافی نہیں لکھی جاتی۔ جہاں متانت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہے مگر کسی سررشتہ کی سالانہ رپورٹ، یا کسی مقدمہ کے فیصلے، یا کسی پبلک جلسہ کی روئیداد میں اس سے زیادہ کوئی چیز بدنما نہیں ہوتی۔ اسی لیے کہا گیا ہے "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد"، مگر جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہر مصنف پر اُس کی طبیعت کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا اور یا جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اُس کو اُسی خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ مثلاً بعضوں کا قلم حسن و عشق کے میدان میں خوب دوڑتا ہے۔ پس یا تو وہ ایسے مضمون پر قلم ہی نہیں اٹھاتے جس میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ہو اور یا جو مضمون لکھتے ہیں اُس کو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ سیدھے رستے سے بھی چکر کاٹے بغیر نہیں گذرتے۔ بعضے ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں اگرچہ نفس مضمون اُس سے اِبا کرتا ہو۔ غرض کہ جس مصنف یا مضمون نگار کو دیکھیے اُس پر کوئی نہ کوئی ہیٔت سوار ہوتا ہے۔

مگر سرسید کی تحریروں کو ہم اس عام قاعدہ سے مستثنٰی پاتے ہیں۔ اُن کی ہر قسم کی بیشمار تحریریں کیا تاریخی، کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولیٹیکل کیا اوفشل اور کیا پبلک علیگڑھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، تصانیف احمدیہ، سالانہ رپورٹوں، عدالت کے فیصلوں، جلسوں کی روئیدادوں اور پرائیوٹ خطوط وغیرہ

میں موجود ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایۂ بیان پایا جاتا ہے جو اُس کے لیے موزوں اور مناسب ہے حالانکہ مصنف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لیے کونسا پیرایۂ بیان موزوں ہے مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد اور ارادہ کے قلم کو اُسی راہ پر ڈال دیتی ہے جس پر اُس کو چلنا چاہیے۔ جس طرح پہاڑ کی رو رستے کے موڑ توڑ اور پیچ و خم کے ساتھ رخ بدلتی چلی جاتی ہے اسی طرح ہر مقام کے مقتضا کے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرائی کا سازور ہے اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلہ میں ظرافت وخوش طبعی نصیحتیں نشتر سے زیادہ دلخراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں، غصہ مہربانی سے زیادہ پُر لطف ہے اور نفرین آفرین سے زیادہ خوش آیندہ وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی رودادوں میں ایک تجربہ کار سکریٹری کے ہاتھ میں۔ یہاں ہم ایک نہایت معمولی مثال کے ذریعہ سے ناظرین کو اس بات کا خیال دلانا چاہتے ہیں کہ اس شخص کے قلم میں ہر ایک مطلب کو اُس کے مناسب پیرایہ میں بیان کرنے کی کس قدر قابلیت تھی۔

سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک آرٹیکل میں آدم کی سرگذشت ایک قصہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے، وہاں اُس موقع پر جبکہ آدم نے محض تنہائی اور سناٹے کے عالم میں حوا کو اچانک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے پایا اور اس سے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی۔ خدا کے شکر کے چند الفاظ فرضی طور پر آدم کی زبان سے

اس بات کا تصور دلانے کے لیے لکھے ہیں کہ آدم کا اُس غیر مترقبہ خوشی اور اُس کے وجد و ذوق میں کیا حال ہُوا ہوگا ! اور انسان کی اُس ابتدائی اور نیچرل حالت میں جبکہ زبان میں لفظ موجود نہ تھے، کس قسم کے بول خُدا کے شکر میں اُس کی زبان سے نکلے ہونگے ؟ اور کیسے سیدھے سادے لفظوں سے اُسے خدا کو پکارا ہوگا!

گویا آدم کہتا ہے کہ "جب میں نے اپنے ہمجنس (یعنی حوا) کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہُوا دیکھا تو میں بہت خوش ہُوا اور تالیاں بجا کر خوب اُچھلا اور خوب کودا اور اوپر کو دیکھ دیکھ کر ایک بڑی ہستی کا دھیان کر کے خوب گیت گائے اور نہایت ذوق و شوق میں یوں چلّایا " اؤ ! اؤ ! ارے اؤ ! ارے اؤ ! ارے وہ جو ہے ! ارے وہ جو ہے ! ارے وہ جو رہے گا ! ارے وہ جو رہے گا ! ارے وہ جو تو ہی ہے ! ارے وہ جو تو ہی ہے ! میرا شکر لے" اُس انجان جا جب کا ر نے میرا شکر لیا اب تم سب اُسی برکت کے پھل پھول ہو" اگرچہ بادی النظر میں یہ مثال بہت کم وزن اور حقیر معلوم ہوگی مگر موقع کا تصور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جو حالت ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے اُس کے بیان کرنے کے لیے ان سے بہتر الفاظ ملنے کس قدر مشکل تھے۔

دوسرے مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب کو اس طرح سلجھا کر ادا کر جانا کہ جو مضمون لفظوں میں سماتا نظر نہ آتا ہو وہ ایسی خوبی سے ادا ہو جائے جیسے انگوٹھی پر نگیں جڑ دیا ۔ اس لحاظ سے جو قدرت سرسید کے قلم میں دیکھی گئی ہے وہ فی الواقع نادر الوجود تھی ۔ قرآن مجید میں بشمار مقامات ایسے ہیں کہ سرسید کی تفسیر دیکھنے سے پہلے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات کے معنی اُس اُصول کے موافق قرار دیئے جا سکیں جس کے مطابق سرسید نے تمام قرآن کی تفسیر کرنے کا دعویٰ کیا ہے ۔ مگر تفسیر دیکھنے کے بعد مستثنیٰ مقامات

کے سوا کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جس کی تفسیر اسی اُصول کے موافق پوری نہ اتر گئی ہو۔ اگرچہ اس کی مثال قرآن کی تفسیر میں جابجا موجود ہیں مگر ایک نہایت بدیہی مثال آدم کے قصہ کا بیان ہے۔ اس قصہ کی نسبت جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہے اگرچہ علمائے سلف میں سے بھی بعض محققین نے یہی لکھا ہے کہ یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا بیان بطور تمثیل کے کیا گیا ہے مگر علمائے سلف اس رمز کی طرف ایک مجمل اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے ہیں کسی نے قصہ کی تمام جزئیات کو تمثیل کے قالب میں ڈھال کر نہیں دکھایا۔ سر سید نے اول تہذیب الاخلاق میں اسی مضمون کو ایک فرضی قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور پھر تفسیر میں بہ حیثیت ایک مفسر کے تمام قصہ کے جزئیات کو انسان کی فطرت اور اس کے قویٰ پر ایسی خوبی سے منطبق کیا ہے کہ اُن سے پہلے کسی سے یہ کام بن نہیں آیا۔ بس صرف اسی مضمون کو تہذیب الاخلاق یا تفسیر میں دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو بذریعہ تحریر کے مشکل عقدوں کے سلجھانے پر کس قدر قدرت تھی۔

تیسرے واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ جو برائیاں بسبب الف و عادت کے دلوں میں کھُب گئی ہوں اُن کی بُرائی اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں اُن کی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔ یہ کمال بھی جو سر سید کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے دوسری جگہ آج تک نہیں دیکھا گیا اور اُس کی مثالیں خاص کر تہذیب الاخلاق کی قدیم اور جدید جلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔

مثال نمبر ۱

مثلاً وہ ایک آرٹیکل میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا طریق اس طرح بیان کرتے

ہیں کہ : "ہندوستان میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی وہی طریق ہے جو ہندوؤں کا ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں اور مسلمان دستر خوان بچھا کر بیٹھتے ہیں، جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی تھالوں اور رکابیوں اور غوریوں اور تشتریوں اور پیالوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی کے پیالے اور اچار چٹنی کی پیالیاں شیتلا کے پوجا پے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اور اس ایک دستر خوان پر کوئی فیرنی کلمۂ شہادت کی انگلی سے اور کوئی (دست بخیر) چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے، کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے، کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجۂ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے، کسی نے بورانی کے پیالے کو منہ سے لگا کر سڑپا بھر اور یہ کہہ کر کہ واللہ مرچیں تیز ہے اوہ اوہ کرنا شروع کیا ہے، تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں نکلی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں اس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور بیسن سے دانت رگڑنے اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا ہے۔ اور اور بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ ان ہاتھ منہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو ان لوگوں کی کریہ آواز سننے اور زرد زرد ہلدی ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھوک تھوک کر کے چلمچی یا تاش میں تھوک دینے اور بتاشے کی طرح اس کے پانی پر تیرنے پھرنے کی پروا ہے۔ نعوذ باللہ منہا !!"

مثال ۲

یا مثلاً ایک آرٹیکل میں بے تہذیب آدمیوں کی بحث و تکرار کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ "جب اُلٹے کُتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چیر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں، اس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اُس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں۔ اس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔"

"نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ! یوں نہیں، یوں ہے، وہ کہتا ہے واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراونی ہو جاتی

ملہ یہ مضمون اصل میں انگریزی سے لیا گیا ہے مگر سرسید کا اس میں بہت کچھ تصرف ہے جس کے سبب سے وہ بہ نسبت اصل کے بہت زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے ۱۲۔

ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ ناک بھوں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، علیف علیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اُس کی گردن اِس کے ہاتھ میں اور اُس کی داڑھی اِس کی مٹھی میں لپا ڈگی ہونے لگتی ہے، کسی نے بیچ بچاؤ کرکر چھڑا دیا تو غرّاتے ہوئے ایک اُدھر چلا گیا اور دوسرا اِدھر، اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی"

"جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں عرفش ہو کر رہ جاتی ہے کہیں تو تکار تک نوبت آجاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

مثال ۳

یا مثلاً ایک آرٹیکل میں جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی میں کوشش کرنا اُن کی دنیا اور دین دونوں کی خیر خواہی کا کام ہے، ایک موقع پر لکھتے ہیں" اب دوسری طرح پر غور کرو اور ایک خیالی دنیا بناؤ اور یہ تصور کرو کہ ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے، سب مفلس اور نان شبینہ کو محتاج ہوں (جیسا کہ انشاء اللہ تعالےٰ ان بدعقلیوں اور بدفہمیوں اور بدنصیبیوں کے سبب جو زمانۂ حال میں اُن کے خطوط پیشانی سے پڑھی جاتی ہیں، عنقریب ہونے والا ہے) اور در بدر

بھیک مانگتے پھریں اُن کی اولاد جاہل اور نالائق چور اور بدمعاش ہو، واعظین کو جو محض ریاکاری اور مکاری سے دنیا کماتے پڑے پھرتے ہیں، کوئی ٹکا دینے والا یا لقمۂ ترکھلانے والا نہ رہے، جناب حضرت پیرجی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کر اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ اُن پر مقرر کرتے ہیں اور ہر سال اُس کی تحصیل میں مصروف ہیں، اُن کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث وتفسیر یا صدرا و شمس بازغہ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں، اُن کو کوئی چار پیسے کو نوکر رکھنے والا نہ رہے (جیسا کہ اب بھی یہی حال موجود ہے کہ اچھے اچھے مولوی ٹکے کو مارے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا) تو اس وقت دین کا کیا حال ہوگا۔"

"مگر اس کے ساتھ یہ بھی تصور کرنا چاہیے کہ پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے، خدا ملے یا نہ ملے اس کو بھرنا چاہیے، تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو پیٹ بھرنے کی کچھ تو فکر کرنی چاہیے ہوگی۔ سو اُس کا خیال بڑے دینداروں کی نسبت تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر چھپتری ڈھو رہے ہیں، کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں، کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہوں گے، کسی کا گھوڑا مل رہے ہوں گے اور جو ایسے پکے دیندار نہیں ہیں اُن کی نسبت کچھ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کریں گے، معلوم نہیں کہ اُن سے جیلخانے اور جزائر نو آباد بھریں گے یا تیم خانے اور کلیسا رونق پاویں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ دین اسلام کی کیا شان ہوگی؛ اور اُس وقت ہم سلام کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیوں جناب قبلہ وکعبہ! ہم جو مسلمانوں میں دنیوی ترقی و تہذیب و تربیت و شائستگی میں کوشش کرتے تھے وہ ہمارا امر معاش میں[1] منہمک ہونا اور اس کی ترغیب دنیا اور

---

[1] جب کالج قائم کرنے کی تدبیریں شروع ہوئیں اور تہذیب الاخلاق جاری ہوا اُس وقت ایک آرٹیکل

امر معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈال تھا؟ یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سرتاسر معاد کا تھا۔"

"خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام کو عین حکمت بنایا ہے۔ اس کی بھلائی چاہنے والے کو ضرور ہے کہ وہ بھی حکیم ہو، نہ مکار اور دغا باز۔ اور حکیم کا یہ کام ہے کہ جو مرض دیکھتا ہے اس کی دوا کرتا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امور معاش و تمدن و معاشرت اور علم کی ابتری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر و برباد ہوتے جاتے ہیں اور واعظ و مولوی اور پیرجی خدا و رسول کے دشمن ان کو روز بروز برباد و تباہ کرتے جاتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں کہ ہم بخوبی یقین کرتے ہیں کہ مسلمان یقینی اپنے مذہب پر پختہ ہیں، خدا کو ایک جانتے ہیں، رسول کو برحق سمجھتے ہیں، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ فرض جانتے ہیں، ادنےٰ ادنےٰ آدمی ضروری نماز روزے کے مسئلے جانتا ہے یا ہر طرح پر اس کے جاننے کا سامان یا موقع موجود ہے۔ آیا مذہب اسلام کے دوستدار کا یہ کام ہے کہ اپنے تئیں پیرجی یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلانے اور دغا بازی سے دنیا کمانے کے لیے انھیں باتوں کا جن کی ضرورت نہیں ہے، میٹھا میٹھا وعظ کہا کرے! یا جن کی ضرورت درحقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہے اس کی تدبیر و کوشش کرے!

" افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا، جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں ہیں، ورنہ ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لیجاتا اور کہتا او خدا! اور لے

علیگڑھ گزٹ میں کسی نے شائع کیا تھا جس میں یہ لکھا تھا کہ جو تو میں امر معاش میں منہمک ہو گئی ہیں وہ دین سے بالکل غافل اور دست بردار ہو گئی ہیں، سید صاحب نے یہ آرٹیکل اسی کے جواب میں لکھا تھا ۱۲

جناب رسول خدا! تم مجھ میں اور ان میں محاکمہ کرو اور بتاؤ کہ کون تمہارا دوستدار ہے! میں گنہگار! یا یہ دیندار! اور انشاء اللہ تعالے اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہونا ہے۔ لیکن باایں ہمہ اگر کوئی مباہلہ پر آمادہ ہو تو میں مباہلہ کو موجود ہوں"

مثال ۲

یا مثلاً شرعی حیلے جو فقہ کے فتاووں میں گناہ سے بچانے یا گناہ پر دلیر کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں ان کی مذمت پر سرسید نے ایک آرٹیکل ظریفانہ سوال و جواب کے پیرایہ میں تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے جس کا عنوان ہے "انشاء اللہ" ہم اس آرٹیکل کو بجنسہٖ اس مقام پر نقل کرتے ہیں:۔

کافر کافر!

کیوں حضرت کافر کیوں؟

تم نے کیا کہا!

میں نے کہا "انا مومن انشاء اللہ"

کافر کافر! یوں کہو "انا مومن حقاً" اس جگہ انشاء اللہ کا لفظ نہیں کہتے، ایسے موقع پر یوں بولنا کفر ہے۔

پھر حضرت کس جگہ کہتے ہیں:۔

قسم سے بچنے، وعدہ پورا نہ کرنے، بے گناہ دھوکا دینے، جھوٹ بولنے اور جھوٹا نہ ہونے میں۔

حضرت پھر تو انشاء اللہ خوب اوزار ہے۔

کیا مسلمانوں کا برتاؤ اسی مسئلہ پر ہے!

ہاں جو پرہیزگار مولوی، عالم، شرع پر چلنے والے ہیں، گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس پر خیال رکھتے ہیں۔

حضرت میں تو نہیں سمجھتا۔

فقہ پڑھی ہو، اصول فقہ کو جانا ہو، عالموں

ؔ گویا ایک مولوی یا فقیہ ایک جاہل آدمی سے خطاب ہے اور اس نے جو یہ لفظ کہا ہے کہ انا مومن انشاء اللہ اس پر اس کو کافر بتاتا ہے۔ (۲)

کی صحبت اٹھائی ہو تو جانو جاہل کندۂ ناتراش نہ پڑھے نہ لکھے جانو تو کیا جانو !
حضرت آپ ہی سمجھا دیجیے۔
ارے میاں ! ان کے معنی تو اگر، شاءٔ کے معنی چاہا، اللہ کے معنی تو اللہ کے ہیں ہی مگر وہ فاعل واقع ہوا ہے جس کے معنی نے کے ہوتے ہیں اب سب کو ملاؤ تو یہ معنی ہوئے "اگر چاہا اللہ نے" اب دو مسئلے فقہ کے اور سمجھ لو، اگر کوئی امر کسی پر مشروط ہو اور سبب نہ پورے ہونے شرط کے ادا نہ کیا جاوے تو کچھ گناہ لازم نہیں آتا۔ "اذا فات الشرط فات المشروط" ایک مسئلہ ہوا! دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خالق جمیع افعالِ عباد کا خدا ہے، پس جب ان دونوں مسئلوں کو ملا کر انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو تو پھر انشاء اللہ کہنے کے بعد کچھ گناہ نہیں رہتا۔
حضرت ! یہ مسئلے تو بخوبی سمجھ گیا۔ مگر اب تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ گناہ کیونکر نہیں رہتا ! کیا وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے الٹ جاتا ہے !
جاہل ! اور کیا ! ہماری جیب میں ایک گھڑی ہے ہمارے دوست کو اس کی ضرورت ہے جب اس نے ہم سے مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے گھر میں کوئی گھڑی ہی نہیں۔ اس نے کہا قسم تو کھاؤ ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے گھر میں کوئی گھڑی نہیں۔ ہمارے گھر میں ایک اشرفی رکھی ہے ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں اس نے کہا قسم تو کھاؤ ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں کیوں ! سچ بات ہوئی کہ نہیں ! بات ہی بات میں گناہ الٹ گیا کہ نہیں ! یہ تو باتیں ہی باتیں ہوئیں، روپے پیسے، سود بٹے کے معاملہ میں بھی لفظوں ہی کے الٹ پھیر سے گناہ الٹ جاتا ہے۔ تولہ بھر سونا سولہ روپیہ کی قیمت کا ہم سے قرض لو سود سے بچنے کو کہہ لو کہ بیس تولہ چاندی لیں گے،

سولہ تولہ چاندی میں وہی تولہ بھر سونا آیا
اور چار تولہ چاندی سود میں بچ رہی اور
سود نہ ہوا۔ کھوٹا سونا جس میں ذرا سا
تانبے کا میل ہو، قرض دو اور اسی
وزن کے برابر کھرا سونا لے لو۔ مال
تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا اور سود نہ ہوا۔
مکان گروی رکھو۔ راہن سے کہلوا لو کہ
سکونت میں نے بحل کی کرایہ کا فائدہ
ہوا اور سود نہ ہوا، گانو گروی لو مثلاً
ہزار روپئے کو جس میں دو سو روپیہ
کا فائدہ ہو، راہن سے اسی روپیہ سال
دینے کے اقرار پر پٹا لکھوا لو اور گانو
پر قبضہ کر لو کل منافع تحصیل کرو، ایک
سو بیس روپیہ سال سود کے۔ پٹے کے
نام سے بیچے کہ نہیں! اور سود نہ ہوا۔

حضرت! کیا یہ ہوتا ہے!

خدا کی قسم سب کرتے ہیں۔ جتنے مقدس
خدا پرست۔ وہابی، نیم وہابی، مقلد،
حنفی، زمیندار، تعلقہ دار ہیں سب کرتے
ہیں۔ بڑے بڑے مولویوں نے فتوے
دیدیے ہیں۔

اب سمجھے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے
گناہ پلٹ گیا کہ نہیں کہ ! اجی ابھی
ہمارے پاس زکوٰۃ کا روپیہ لاوے
اور ہم مستطیع ہوں، ابھی گھر میں جا کر
بیوی سے کہہ آویں کہ ہم نے اپنا کل
مال تم کو ہبہ کیا، اب مفلس ہو گئے
کہ نہیں ! باہر آویں اور زکوٰۃ کا روپیہ
لے لیں، باتیں ہی تو ہیں، ان باریکیوں
کے سمجھنے کے لیے علم درکار ہے۔

بھلا حضرت یہ تو ہوا، انشاء اللہ والی
بات رہ گئی اس کو بھی کسی مثال سے
سمجھا دو۔

ارے میاں یوں سمجھو کہ ہم نے تمہارا
دل خوش کرنے کو تم سے کہہ دیا کہ ہم
کل تمہارے ہاں آویں گے انشاء اللہ،
ہمارا ارادہ آنے والے کا کچھ نہ تھا
یوں ہی کہہ دیا تھا، جب نہ گئے تو معلوم
ہوا کہ خدا نے نہیں چاہا، اسی وعدے
کو مشروط کیا تھا۔ اذا فات الشرط
فات المشروط۔ بات کی بات میں
گناہ پلٹ گیا کبھی تم عدالت میں

گواہی دینے بھی گئے ہو؟

ہاں صاحب! ایک دفعہ گیا تھا۔ میں نے تو جو سچ تھا وہ کہدیا تھا، مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا میں کیا کرتا۔ وہاں ایک کالی مخمل کی گول چنٹ دار ٹوپی پہنے ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پر بیٹھا تھا، اُس نے قسم دی کہ سچ کہنا میں جھوٹ بولنے سے ڈر گیا، سچ کہدیا۔

ہاں فقہ نہ جاننے سے عالموں کی صحبت نہ اٹھانے سے یہی تو نتیجہ ہوتا ہے، ارے جب اُس مولوی جج نے قسم دی تھی کہ سچ بولنا تو نے کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا انشاء اللہ اگر وہ جج نام کا مولوی تھا اور فقہ نہ جانتا تھا تو پکار ہی کر انشاء اللہ کہدیا ہوتا اور اگر وہ مولوی تھا اور ٹھیٹرے ٹھیٹرے بدلائی آن پڑی تھی تو پکار کر کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا اور جھٹ پٹ دل میں کہہ گیا ہوتا انشاء اللہ۔ مگر یہ خیال رکھا ہوتا کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے ورنہ انشاء اللہ کا جوڑ ٹوٹ جاتا پھر چاہتے وہ کہدیتے، ذرا بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ نہ ہوتا۔

حضرت! باتیں تو آپنے خوب بتائیں مگر میں حیرت میں ہو گیا، اب تو رخصت ہوتا ہوں، اور کسی سے بھی تحقیق کروں گا، میرا دل دُھکڑ پکڑ کر رہا۔

تم جس مولوی سے چاہنا پوچھنا، یہی بتاویگا۔ کہو میں ابھی ہدایہ، شرح وقایہ، دُرِ مختار، بحر الرائق، نہر الفائق اور بڑے بڑے معتبر فتاووں سے ہر ایک جزئی کی روایت نکالدوں اور تم نے وہ فتاوی بھی دیکھا ہے! جو پرانے خاندانی مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ میں اس وقت اُس کا نام بھول گیا ہوں، یاد آجاوے گا تو بتا دونگا، اس میں ہر ایک مسئلہ کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں، ایک میں جائز، حلال، اور دوسری میں ناجائز حرام لکھا ہے پھر جونسی روایت کے مطابق چاہا فتویٰ لے لیا، بہت

ہزار روپیہ دو روپیہ، فتوے کے نام سے نہیں اور کسی نام سے کبھی کبھی دیتے رہے کیوں! بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا کہ نہیں! مگر اس زمانے میں جو کمبخت مقلدین فلاسفہ ملاحدہ نکلے ہیں وہ تو مذہب اسلام کی جڑ کاٹتے ہیں۔ یا اللہ کیا مشکل[1] پڑی ہے!!!

تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک پیرمرد متبرک صورت سفید ریش ملے، جانا کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں، پکار کر کہنے لگے کہ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی! کیا کوئی مذہبی مسئلہ ہے! بولے حضرت! ہاں مذہب کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی! نہ میں مولوی نہ مولوی کی دم مجھ سے اور مذہبی مسئلوں کے پوچھنے سے کیا واسطہ! کسی مولوی صاحب سے جاکر پوچھو۔ اسی شہر میں بہت سے مولوی ہیں۔ یہاں سے دس پندرہ کوس پر نامی نامی قصبے ہیں، وہاں مولویوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں، وہاں جاکر پوچھو!

نہیں حضرت! میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں آپ کا نام بھی تو مشہور ہے۔

ارے میاں! شیطان کا نام تو مجھ سے بھی زیادہ مشہور ہے، ایسی ویسی شہرت تو مجھکو ہوئی بھی نہیں، میں نیچری مشہور ہوں، مُلّا مولوی نہیں ہوں مجھ سے مت پوچھو!

حضرت! اگر مولوی مُلّاؤں سے دل کو تسکین ہوتی تو آپ تک کیوں آتے! جب دل ہی کو تسکین نہ ہو تو مولوی مُلّاؤں کو کیا کریں! پھر آپ نیچری ہوں یا پیغمبری کے سے پوچھے تو دل مانتا نہیں خدا کے

[1] یہاں تک مولوی اور اُن کے جاہل مخاطب کی گفتگو تھی اس کے بعد گویا آرٹیکل لکھنے والا کہتا ہے کہ اس جاہل کا مقابلہ راہ میں نیچریوں کے کسی سرگروہ سے ہوگیا پھر اُن دونوں کے سوال جواب ہیں ۱۲۔

واسطے بتا ہی دو!

اچھا صاحب پوچھو کیا پوچھتے ہو، مگر میں کسی فتووے وتاوے کو نہیں جانتا خدا کی کتاب اور خدا کے فتاوے[1] کو جو سب کی آنکھوں کے سامنے کھلا ہُوا ہے، جانتا ہوں، جو کہوں گا اسی سے کہوں گا۔

بہت اچھا آپ اُسی سے فرمایئے گا، میں پوچھتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ کو جانتے ہیں! خوب جانتا ہوں، ہماری دلّی کے رہنے والے تھے بڑے شاعر تھے، ذرا مزاج میں ظرافت تھی اُن کے یہ اشعار مجھے یاد ہیں، پہلے

پہلے مصرع میں شاید کچھ لفظ اول بدل ہو گئے ہیں۔

"مولوی کہتے ہیں ہم کو تو نے کیوں رسوا کیا کیا گنہ کیا جرم کیا تقصیر ہم نے کیا گیا واسطہ باعث، سبب موجب جہت کچھ بات بھی راز وہ کمبخت کیا تھا ہیں تے جو افشا کیا کیا کہا، کس سے کہا، کس نے سُنا، کب کس گھڑی کس جگہ کس وقت کس دم آپ کا چرچا کیا"

حضرت! میں آپ سے انشاء اللہ خاں شاعر کا حال نہیں پوچھتا انشاء اللہ کے لفظ کی نسبت حکم شرع کا پوچھتا ہوں کہ کس مراد اور کس

---

[1] خدا کے فتاوے سے مراد فطرت انسانی ہے جس میں حسن و قبح اشیا کا علم ودلیت کیا گیا ہے اور جس کی طرف مخبر صادق نے اس حدیث میں اشارہ کیا ہے کہ "اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَلَوْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْنَ" اور جو لوگ اس فتاوے کے موافق عمل کرتے ہیں وہ مفتیوں کے فتووں سے مستغنی ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے پاس ایک موضع گروی تھا بہت مدت کے بعد مالک نے اس کو چھڑانا چاہا، ہر چند کہ رہن نامہ میں تمام منافع موضع مرہونہ کا مرتہن کو معاف ومباح کر دیا گیا تھا اور نیک رہن کے وقت مالک بخوشی کُل زرِ رہن ادا کرنا چاہتا تھا اور مفتیوں نے بھی اباحت کا فتوی دیدیا تھا مگر اس مرحوم مغفور نے یہی حدیث پڑھی کہ استفت قلبک ولو افتاک المفتون اور جس قدر محاصل اس موضع سے وصول ہُوا تھا سب زرِ رہن میں سے مجرا دے کر باقی روپیہ راہن سے لے لیا ۱۲۔

مطلب ہے اور کس مقام پر اس لفظ کا
استعمال ہوتا ہے۔

یہ کہو، ذرا مجھکو خدائی فتاوے پھر دیکھ
لینے دو۔ اس میں تو یہ لکھا ہے کہ تم کو
کسی کام کی نسبت نہ یہ کہنا چاہیے کہ
میں کل کروں گا، بلکہ یوں کہنا چاہیے
کہ اگر خدا چاہے تو میں کل کروں گا۔
خدا السبب علۃ العلل ہونے کے ہر
کام کو خواہ انسان کرے یا حیوان اپنی
طرف منسوب کرتا ہے۔ اس لیے
انسان کو بھی لازم ہے کہ ہر چیز کو خدا
سے متعلق کرے۔ پس جس بات پر
انشاء اللہ کا لفظ کہا جاتا ہے تو انشاءُ
اللہ کے لفظ سے اس بات پر تعلیق
ہوتی ہے اور وعدہ کو زیادہ استحکام
ہوتا ہے، سننے والے کو کامل یقین ہو
جاتا ہے کہ وعدہ کرنے والے نے
خدا پر اس وعدہ کی تعلیق کی ہے تو ضرور
اس کو پورا کرے گا۔ اگر تم نے کسی
سے وعدہ کیا کہ میں کل تمہارے گھر
آؤں گا اور اس کے ساتھ انشاء اللہ
نہیں کہا اور نہیں گئے، تو صرف وعدہ
خلافی کا گناہ ہوا اور اگر اس کے ساتھ
انشاء اللہ بھی کہا اور پھر نہ گئے تو تین
گناہ ہوئے ایک وعدہ خلافی کا، دوسرا
اس بات کا کہ جس سے وعدہ کیا تھا
اس کو وعدہ پورا کرنے کا زیادہ یقین
دلایا اور وعدہ پورا نہ کیا تیسرا اس بات
کا کہ خدا کو ضامن دیا اور اس کے نام
کی عزت کا بھی کچھ ادب نہ کیا۔ اگر
کسی بات پر قسم کھا کر انشاء اللہ کہا ہو
تو قسم توڑنے پر گناہ سے نہیں بچتے
بلکہ دگنا گناہ ہوتا ہے، قسم توڑنے
کا، خدا کے ساتھ تعلیق کر کر اس کا ادب
نہ کرنے کا۔ جب قسم کھائی کہ سچ
کہوں گا اور ظاہر میں یا دل میں انشاء اللہ
کہہ لیا اور پھر جھوٹ بولے تو تین
گناہ ہوئے، جھوٹ بولنے کا، قسم
توڑنے کا، خدا پر تعلیق کر کے اس کا
ادب نہ کرنے کا جس بات کا وعدہ
کیا جاتا ہے جب مصمم اور نہایت
مضبوطی اور سچی نیت سے اس کے

پورا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اُسوقت اس کے ساتھ انشاء اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تم نے ایک مولوی سے کہا کہ میں تم کو انشاء اللہ دس روپئے دوں گا تو اس کے یہ معنی ہوئے ضرور بیشک تم کو دس روپئے دوں گا۔

حضرت: اپنے وعدوں کی نسبت تو مولوی بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ وعدہ نفلی نہیں رہتا، بلکہ بحکم نصوصِ صریحہ مثل زکوٰۃ اور نذر معین کے واجب ہو جاتا ہے، مگر اور جگہ کہتے ہیں کہ نہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوتا ہے، نہ قسم ٹوٹنے کا گناہ ہوتا ہے۔ اور انشاء اللہ کو ایک سپر بتلاتے ہیں جو ہر ایک حربے سے بچا لیتی ہے۔ حضرت: خدا مارے یا چھوڑے ان مولویوں نے جو اسلام بنا رکھا ہے۔ اگر وہی اسلام ہے تو میرا اسلام، اس سے بہتر یہ ہی اچھے جو سچائی کو اسلام بتاتے ہیں "

اگرچہ یہ تمام آرٹیکل ظرافت کے پیرایہ میں لکھا گیا ہے مگر اس میں جس قدر مسائل فقہا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں ان میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو فقہ کے فتاوٰوں میں موجود نہ ہو۔ اسی قسم کے فتووں کی نسبت کہا گیا ہے کہ "استفت قلبك ولوا فتاك المفتون " اور ایسے ہی حیلوں کی نسبت علی مرتضیٰ رضؓ سے پوچھا گیا کہ ما الحِیلَۃُ ؟ تو آپ نے فرمایا "ترکُ الحِیلَۃِ"

مثال ۵

یا مثلاً وہ امام غزالی کے ایک رسالہ کے ریویو میں اہل دنیا اور مشائخ و علما کی نسبت[1]

---

[1] یہ وہ مقام ہے کہ امام غزالی نے اپنے رسالہ "التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ" میں دو قسم کے لوگوں کا

بقیہ آگے

ایک مقام پہ لکھتے ہیں "اس مقام پر امام صاحب نے دو قسم کے دلوں کا حال لکھا ہے ایک ان کا جو اسرار ملکوت اور کفر و ایمان کی حقیقت سمجھنے کے قابل ہیں (یعنی اہل دین) اور دوسرے وہ جو ناقابل ہیں (یعنی اہل دنیا) اور دونوں کے اوصاف بیان کیے ہیں مگر یہ مقام کسی قدر زیادہ تشریح کے قابل ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس مقام پر امام صاحب نے جو دوسری قسم کے لوگوں کے حال سے بحث کی ہے (یعنی اہل دنیا کے حال سے) ان میں وہ لوگ جو اعلانیہ اہل دنیا کہلاتے ہیں، داخل نہیں ہیں۔ اہل دنیا سے میری مراد ان دنیا داروں سے نہیں ہے جن کو اہل دنیا بھی الدّ الخصام سمجھتے ہیں بلکہ اُن سے مراد ہے جنھوں نے دنیا کو بغیر کسی بے ایمانی اور دغا بازی کے اختیار کیا ہے، دنیا میں بہ حیثیت دنیا داری اپنی عزت، اپنا نام، اپنی شہرت، اپنا آرام، اپنی حشمت چاہتے ہیں زہد و تقوے، علم و افتا، صبر و قناعت کے ذریعہ سے دنیا و آخرت میں تفوق کی خواہش انھوں نے ظاہر نہیں کی۔ انھوں نے ایمان میں سے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر دل سے یقین کیا ہے۔ وہ خدا کی ذات کو بے نقص اور رسول کو بے عیب سمجھتے ہیں، وہ کسی ایسی بات کو جس میں ان کی دانست میں خدا پر کوئی نقص آتا ہو اور رسول پر کوئی عیب لگتا ہو، نہیں مانتے۔ گو وہ کہیں

حال لکھا ہے ایک اہل دنیا جنھوں نے ہوائے نفس کو اپنا خدا، سلاطین کو اپنا معبود، درہم و دینار کو اپنا قبلہ، حب جاہ کو اپنی شریعت اور اہل دول کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دیا ہے اور اس لیے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی میں تمیز نہیں کر سکتے دوسرے اہل دین جن کا دل دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے، کامل ریاضت سے مجلّیٰ ہے خدا کی یاد سے منوّر ہے وغیرہ وغیرہ اور اس لیے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو بخوبی تمیز کرتے ہیں سرسید نے امام صاحب کے برخلاف اہل دنیا کے ایک خاص گروہ کو مستثنیٰ کر کے دنیا داروں کی برات کی ہے اور پھر اہل دین کی خبر لی ہے۔"

نے کہی ہو اور کسی نے لکھی ہو اور گو کہنے والے اور لکھنے والے کے نزدیک اُس سے کوئی نقص نہ آتا ہو اور عیب نہ لگتا ہو، اور گو بالفرض درحقیقت وہ بات کوئی نقص یا عیب کی نہ ہو مگر اس وجہ سے کہ وہ اُس کے ناقص اور معیوب ہونے پر یقین رکھتے ہیں، گو کہ وہ غلطی پر ہوں، خدا اور رسول کی شان سے اس کو بعید سمجھتے ہیں اور اس لیے اُس پر یقین نہیں کرتے۔ غرض کہ اُن کو خدا کے تقدس اور رسول کی منزلت پر ایسا یقین ہے کہ کسی دوسرے کی اُس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں سمجھتے، پھر وہ کوئی کیوں نہ ہو۔

اعمال میں سے فرائض کو حق سمجھنا اور جس طرح پر ہو سکے اُن کو ٹوٹا پھوٹا مسلسل باگندے دار ادا کرنا اور اُس میں کوتاہی کو اپنی شامت اعمال سمجھنا، اور اُس پر تاسف کرنا، دل کو بدی اور بدنیتی کینہ اور فساد و بغض وحسد سے پاک رکھنا، کسی کے ساتھ دغابازی نہ کرنا، کسی کا مال نہ مار رکھنا، کسی کو ایذا و تکلیف نہ پہنچانی، ہر ایک کے ساتھ محبت سچی دوستی سے پیش آنا، سب کی بھلائی چاہنا، سب کے ساتھ ایمان داری سے معاملہ کرنا اور رکھنا اختیار کیا ہے۔

دنیا تو گویا اُن کا مقصد ہی ہے ان باتوں کے سوا، انھوں نے دنیا ہی دنیا کو پکڑا ہے۔ روپیہ کے ایمانداری سے پیدا کرتے ہیں، اپنی محنت و مشقت سے روٹی کمانے میں بے انتہا کوشش کرتے ہیں، روپیہ کماتے ہیں، عمدہ عمدہ مکانات بناتے ہیں، دنیا میں عزت و ترقی و حشمت حاصل کرتے ہیں، باغ بناتے ہیں اور اُس کے پھولوں اور بیلوں کی سیر سے خوش ہوتے ہیں، میوے کھاتے ہیں، گھوڑوں پر چڑھتے ہیں، عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنتے ہیں اور اچھے سے اچھے کھانے کھاتے ہیں۔ قالینوں کے فرش کو جوتیوں کے تلے بچھاتے ہیں، تمام عیش و آرام جو کہ انسان عمدہ اخلاق اور شائستگی کے ساتھ کرسکتا ہے، کرتے ہیں، خدا کی پیدا

کی ہوئی چیزوں کو جس لیے اُس نے پیدا کیا ہے، برتتے ہیں اور کام میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے ہم کو دیا ہے ہم کیوں نہ برتیں اور کیوں مصیبت بھگتیں اگر خدا کو ان سے ہمارا عیش و آرام مقصود نہ تھا تو اُن کو پیدا ہی کیوں کیا تھا ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کو برتیں اور عیش اڑاویں، مگر زیادتی نہ کریں کیونکہ جس طرح کے استعمال کے لیے وہ بنائے گئے ہیں اگر اُس طرح پر استعمال نہ کریں تو نمک حرام اور چور ہوں گے نہ شریف دنیادار۔ وہ نہ دعویٰ دینداری کرتے ہیں، نہ کسی کے پیشوا بننا چاہتے ہیں، نہ اپنے تئیں تابع سنت کہلانا پسند کرتے ہیں نہ پیر و مرشد نہ ممبر پر واعظ بننا چاہتے ہیں، نہ استفتا کے مفتی، سیدھی طرح سے خدا کے بندے رسول کی امت ہیں، خدا کے دیئے ہوئے عیش و آرام میں مست رہتے ہیں پس ایسے لوگ تو امام صاحب کی بحث سے خارج ہیں۔

ہاں جو کچھ اس مقام میں امام صاحب نے لکھا ہے، وہ اُن لوگوں کی نسبت لکھا ہے جو جبّہ و عمامہ دار ہیں، دنیا چھوڑ دین کی راہ چلتے ہیں، دن رات قال اللہ و قال الرسول میں بسر کرتے ہیں، دین ہی دین پکارتے ہیں، دین ہی کا اوڑھنا دین ہی کا بچھونا بناتے ہیں۔ دنیاداروں نے جس قدر مختصر انچھر دین کے اختیار کیے تھے اُن دینداروں نے اُسی قدر مختصر باتیں دنیا کی اختیار کی ہیں اور جس قدر وہ دنیا کے حاصل کرنے میں مشغول تھے، اسی قدر یہ دین کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں، گو پہلے فرقہ کے بالکل برعکس ہیں اس مقدس فرقہ کا (خدا ان سے پناہ میں رکھے) امام غزالی صاحب نے ذکر کیا ہے۔ بیشک جب یہ فرقہ کریلا اور نیم چڑھا ہو جاوے یعنی ہوائے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور درہم و دنانیر کو اپنا قبلہ اور حُبّ جاہ کو اپنی شریعت اور اہل دول کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دے تو وہ کبھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تمیز نہیں کر سکتا تھا قال الغزالی

فہو حق لاریب فیہ۔

مگر وہ دوسرا فرقہ بھی نہایت ہی خوفناک ہے کہ جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ "اُن کا دل[1] دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے کامل ریاضت سے مجلّٰی ہے خدا کی یاد سے منور ہے، فکر کی شیرینی سے شیریں ہے، شریعت کی پابندی سے مزین ہے، مشکوٰۃ نبوت سے روشنی لیتا ہے، جلادار آئینہ کی مانند ہے اُن کا نور ایمان شیشہ کی ہانڈی میں بے آگ کے سلگتا ہے، نور کے چکارے اُن کے دل سے نکلتے ہیں۔" ہاں یہ سچ ہے کہ اس فرقہ نے ہوائے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور درہم و دنانیر کو اپنا قبلہ نہیں بنایا، مگر خود ہوائے نفس نے اُن کو اپنا خدا اور خود سلاطین نے اپنا معبود اور درہم و دنانیر نے ان کو اپنا قبلہ بنایا ہے، پھر اُن کو بنانے کی کیا حاجت تھی۔

جس وقت کہ پیر صاحب یا مولوی صاحب کے گرد اُن کے معتقدین کا حلقہ ہوتا ہے اور حجر اسود کی مانند اُن کے دستِ مبارک کے بوسہ دینے کو لوگ دوڑتے ہیں تو اُن کا دست مبارک یمین الرحمٰن سے بھی بالا دست ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب حضرت صاحب کی آواز کا چاروں طرف سے اُن کے کان میں آنا چاؤشانِ کسریٰ و کیقباد کی آواز سے بھی قوی اثر اُن کے دل پر ڈالتا ہے۔ مسکینی اور انکسار اُن کو آسمان پر چڑھاتی جاتی ہے، اس لیے وہ اور زیادہ مسکین اور منکسر ہوتے جاتے ہیں۔ سادہ وضعی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں، اس لیے وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دُنیا سے نفرت اُن کو دنیا دلاتی ہے، اس لیے وہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی حاجت سے زیادہ

---

[1] یہ اقوال امام صاحب کے رسالہ سے لیے گئے ہیں جو اس جملہ پر ختم ہوتے ہیں کہ "نور کے چکارے اُن کے دل سے نکلتے ہیں"۔

بغیر محنت کے درہم و دنانیر دلادیتی ہے، اس لیے وہ زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں ان کی ہر ایک بات پر لوگ آمنا و صدقنا کہتے ہیں، اس لیے ان کے دل میں دوسرے کی بات کی حقارت جمتی جاتی ہے۔ ہاتھوں کو چھواتے چھواتے ہر ایک مشکل کی حل کو دعائیں منگواتے، ہر ایک مسئلہ کا فتویٰ دیتے دیتے ایک اور بیماری ان میں پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب برائی بھلائی، دوزخ و بہشت، کفر و ایمان کی کنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھنے لگتے ہیں۔ کسی کو کافر بنا دیتے ہیں اور کسی کو مرتد۔ کسی کو جہنم دیتے ہیں اور کسی کو بہشت۔ کبھی خازن جنت ہیں اور کبھی مالک جہنم۔ خدا کے نور کے دل میں بھڑکنے کے خیال سے ظلمت پر ظلمت میں پڑتے جاتے ہیں یہ تمام باتیں مل ملا کر حضرت کو ایک ایسا شخص بنا دیتی ہیں جو پھول پُھلا کر کپّا ہو جاتا ہے۔ نہ کان رہتے ہیں جو کچھ سنیں نہ آنکھیں رہتی ہیں جو کچھ دیکھیں، نہ منہ رہتا ہے جو حق بات کہیں۔ جو سرور اور دلی آسایش اور دل کے پھولنے سے جو مزا اس فرقہ کو آتا ہے نہ کسی دنیا دار کو میسر ہوتا ہے نہ کسی دولتمند کو اور نہ کسی صاحب تخت و سلطنت کو۔ پس اس فرقہ سے بھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تمیز کرنے کی توقع نہیں ہے، الاماشاء اللہ۔ کوئی آفت انسان کے لیے اس سے زیادہ نہیں ہے جبکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نیک ہوں۔ کوئی گمراہی انسان کے لیے اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جب وہ جانتا ہے کہ میں پابند شریعت ہوں۔ وہ زبان سے اپنے تئیں گنہگار کہتا ہے مگر اس کا دل اس کو جھٹلاتا رہتا ہے۔ اس کہنے کو بھی وہ ایک نیکی اور تعلی سمجھتا ہے اپنی چال ڈھال شریعت کے موافق بناتا ہے مگر اس کا دل روز بروز سیاہ ہوتا جاتا ہے۔ ازار کے دو انگل نیچے ہونے، ڈاڑھی کے لمبی یا ایک مشت و دو انگشت ہونے، کپڑے کو نجاست سے پاک

کرنے، پانی کے پاک ناپاک ہونے پر دن رات بحث کرتا ہے۔ لمبے لمبے فتوے لکھتا ہے۔ مگر دل کو نجاستوں سے پاک کرنے کا خیال بھی نہیں کرتا اکل حلال اور صدق مقال پر لمبے لمبے وعظ کہتا ہے مگر جب کوئی لقمۂ تر آجاوے تو جھٹ نگل جاتا ہے۔ اور اگر کبھی اُگل دیتا ہے تو اس امید پر کہ اس سے بھی زیادہ لقمۂ تر بہتر آوے گا۔ یہی باتیں تھیں جن کے سبب حضرت عیسیٰ نے فریسیوں اور صدوقیوں کو یعنی شریعت پر چلنے والے یہودیوں کو ملامت کی۔ یہی لوگ اس کے مصداق ہیں کہ "یلعنھم اللّٰہ ویلعنھم اللاعنون" عمدہ زندگی وہی ہے جو سیدھی سادی ایک دنیادار جیسی ہو۔ پھر خواہ وہ دوزخ میں جائے، یا بہشت میں۔ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم "مَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ"

اگرچہ سر سید نے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اردو زبان اور اردو لٹریچر کو طرح طرح سے مدد پہنچائی ہے مگر جو سب سے بہا مدد خاصکر اُن کے لٹریری ورکس سے اردو لٹریچر کو پہنچی ہے اس کے لحاظ سے اُن کو فادر آف اردو کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ اگرچہ سر سید کے سوا اور بھی بہت سے لائق لائق مصنف، مترجم اور مضمون نگار ملک میں موجود ہیں جو نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسلوبوں سے اردو زبان کو سرمایہ دار کر رہے ہیں، لیکن ہر شخص طرز تحریر میں گو کہ وہ فی نفسہ کیسی ہی عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی ہو، یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ عام تحریروں کو اپنی سطح پر لے آئے۔ بعضے اسٹائل ایسے اچھوتے اور شارع عام سے ایسے بعید ہوتے ہیں کہ اور لوگ اُن کا تتبع کرنے کی دسترس اپنے میں نہیں پاتے۔ اور بعضے ایسے سپاٹ اور سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں کہ اُن کی طرف کسی کی توجہ مائل نہیں ہوتی اور اس لیے دونوں قسم کے اسٹائلوں کا عام

لٹریچر پر کوئی معتدبہ اثر نہیں ہوتا، سرسید کی طرز تحریر میں یہی خصوصیت تھی کہ اُس کی لطافت اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اُس کو شوق اور توجہ سے پڑھتے اور اُس کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگرچہ بیان کی قدرت اور اس کا زور اور تاثیر جو اس شخص کی خاص تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ تو اُسی کے دل و دماغ کا حصہ تھا، دوسرے کی تحریر میں اُس کا ڈھونڈنا لاحاصل ہے مگر جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شائستگی اور گھلاوٹ آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے، اور جس قدر آرٹیکل نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہانتک اہل قلم میں ہر قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کا حوصلہ پیدا ہُوا ہے اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اُسی ایک قلم کی آواز بازگشت ہے اور اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو اخبارات سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے ملک میں جاری تھے اُن کا مقابلہ اُن اخباروں کے ساتھ کیا جائے جو اُس کے بعد جاری ہوئے اور جو اخبار یا میگزین تہذیب الاخلاق سے پہلے شائع ہوتے تھے ان کا موازنہ اُن اخباروں یا میگزینوں سے کیا جائے جو اس کے بعد شایع ہوئے، اس مقابلہ سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اُردو اخباروں نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔ اگرچہ سرسید کی دیگر تصانیف سے بھی اردو لٹریچر کو بہت کچھ مدد پہنچی ہے مگر سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق نے خاصکر اُس میں ترقی کی روح پھونکی ہے کیونکہ اُن کے مضامین جلد جلد شایع ہوتے تھے اور مہینے میں کئی کئی دفعہ پبلک کی نظر سے گذرتے تھے اور یہ سلسلہ تیئیس برس تک برابر جاری رہا۔

بیشک یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں پرچوں میں سرسید کے سوا اور

بھی بہت سے لکھنے والے تھے خصوصاً سید مہدی علیخاں قدیم تہذیب الاخلاق میں گویا سرسید کے برابر کے شریک تھے اور اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ جو لٹریری فوائد ان پرچوں سے مترتب ہوئے اُن کو صرف سرسید کی تحریرات سے منسوب کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ سرسید کے قدم بہ قدم چلنے والے اور انھیں کے اسٹائل کی پیروی کرنے والے تھے اس لیے اگر ان تمام فوائد کو صرف سرسید کی تحریروں سے منسوب کیا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔

چونکہ اس مقام کو ہم تہذیب الاخلاق کے نتائج کے ذکر میں مفصل بیان کر چکے ہیں اس لیے یہاں اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اُن کو فارسی نظم و نثر لکھنے کا بھی شوق رہا ہے۔ اگرچہ فارسی زبان میں، جیسا کہ وہ خود بیان کرتے تھے، انھوں نے معمولی کتابوں کے سوا جو مکتبوں میں پڑھائی جاتی تھیں کوئی اعلیٰ درجہ کی کتاب نہیں پڑھی تھی مگر جن مجلسوں اور صحبتوں میں ان کا ابتدائی زمانہ گذرا تھا اُن میں دن رات فارسی نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا۔ مولانا صہبائی سے اُن کی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ مولانا سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے ابتدا میں وہ سرسید ہی کے مکان پر اُن کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں کے ہاں بھی اُن کا ایک پھیرا ہر روز ہوتا تھا جہاں صہبائی اور شیفتہ اور مومن وغیرہم کا مجمع رہتا تھا۔ مرزا غالب کو وہ چچا کہتے تھے اور مرزا اُن پر بزرگانہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اُن کے نہایت گاڑھے دوست تھے اور یہ سب لوگ فارسی نظم و نثر میں کمال رکھتے تھے اسی لیے ضرور تھا کہ فارسی لٹریچر پر اُن کی توجہ مائل ہو مگر باوجودیکہ یہ سب لوگ بیدل یا ابوالفضل یا جلالائے طباطبا یا اور مشہور نازک خیال نثاروں کی

پیروی کرنے والے تھے لیکن ظاہرا سرسید نے فارسی نثر میں بھی مثل اُردو کی سادگی سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ اگرچہ اُن کی ابتدائی تحریریں، ایک رسالہ کے سوا جو مسئلہ تصور شیخ کے بیان میں ہے، دستیاب نہیں ہوئیں مگر غدر کے بعد کی جو بعض تحریریں ملی ہیں اُن میں ویسی ہی سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی اُن کی اُردو تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ ازانجملہ ایک وہ فارسی لکچر ہے جو انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کرتے وقت کلکتہ کی مجلس مذاکرہ علمیہ میں پڑھا تھا اور جو اُن کے لکچروں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے۔ اس کے سوا اُن کا ایک اور فارسی خط منشی سراج الدین احمد کے مسودات میں ہم کو ملا ہے جو اُن کو حیدرآباد میں دستیاب ہوا تھا اور جو سرسید نے ۱۳، اگست ۱۸۸۱ء کو حاجی سید محی الدین خاں رضوی کے نام اُن کے خط کے جواب اور پندرہ سو روپیہ چندہ کے شکریہ میں لکھا تھا۔ چونکہ یہ خط کہیں نہیں چھپا ہے اس لیے اس کے تلف ہو جانے کے خیال سے ہم اس کو بجنسہٖ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"مخدوما و ملاذا! نامہ یافتم و متحیر گشتم۔ خواندم و نہ خواندم، بلند پایگی نویسندہ اش را خود آں نامہ نشان میداد، تحیر در آں بود کہ مخاطب آں کیست، بغلط خود را دانستم و باز گشتم کہ انچہ دراں نامہ مرقوم ست سزاوار ہیچمدانے دامن آلودہ، بکنج مخلوتے، ہیچ میرزے، گم کردہ راہے نمیتوانند شد، بجز آں کہ اوصاف حمیدہ و اخلاق پسندیدۂ شما شخص خیالی خود را با خود اوصاف خود را مخاطب ساختہ باشد۔ سخنے دیگر قرار دادن نمی توانم۔ و اگر ازیں فرو تر آیم و خود را مخاطب آں دانم حاشا کہ بدون اختیار مذہب وحدت وجود ایں چنیں توانم دانست، تا کہ من کہ حجاب خودم از میاں برخیزم و تفاوت من و تو و تو من از میاں بر افتد و ہمہ انچہ نوشتہ اید خود شما مصداق آں باشید واللہ درّ من قال تو خود حجاب

خودی احمد از میاں برخیزد"

"راست فرمودہ اند کہ "رضویت ذریعۂ یک گوہری ست نہ وسیلۂ یکجہتی" مگر الحمد للہ کہ باما و شما یک گوہری و یکجہتی ہر دو محقق است، گوایں نسبت ہائے من باشما باعث ننگ و عار شماست و ما را سبب عزت. خدا داند کہ محبت پیشہ ام و بجز محبت ورکشت سینہ ام نہ کشتہ اند۔ الطاف و عنایت شما را شکر گزارم و بایں محبت جاں نثار مبلغ یکہزار پانصد روپیہ سکۂ انگریزی کہ یکجہت تعمیر بورڈنگ ہاؤس مرحمت فرمودہ اند رسید۔ قوم را عزت افزود و دلم را تقویت داد و ساعد سعی ما را قوت بخشید۔ ؛ آں از ایں قوم ناسپاس دشوار، مگر اجر کم علی اللہ صلۂ آں کافی ست۔ بن شکر یہ آں عطیۂ بجامی آرم و روزے می آید، و آں دور نیست، کہ تمام قوم و اخلاف شاں نسلاً بعد نسل بہ شکر گزاری ہمچو شما بزرگاں کہ در صلاح و فلاح قوم از قدم و قلم و درم دریغ نہ فرمودہ اند، رطب اللسان و عذب البیان خواہد بود۔"

"آنچہ بر حالِ زارم دل سوختہ اند و حسرت فرمودہ، ممنون احسانِ شما، مگر ہیچ جائے دل سوختن و حسرت نمودن نیست

> ؎ حسن شہرت عشق رسوائی تقاضا میکند
> جرم معشوق و گناہِ عاشقِ بیچارہ نیست

اگر قوم ما چشم بصیرت بودے و مآل کار خود فہمیدے، ما و شما را ایں کوشش و کشاکش ضرور نہ بودے، ہرگاہ حال این ست پس از آں قوم بجز بد گوئی و افترا پردازی و نا فہمی و از ما بجز صبر و تسلیم و رضا و بجز چہ توقع بود ۔۔۔۔۔ انصاف ما انہ دست نمید ہیم و با کسی بد ظنی روا نمیدارم، دوستاں دشمن نمائے من بد نیستند حق بجانب شاں ہم ست، چہ آنہا سخنے می شنوند و را بے می بینند کہ گاہے

از خود شان نشنیدہ و ندیدہ بودند۔ و بر نیہ غلطی ہائے ما رفتہ رفتہ استحکام آیات قرآنی بہم رسانیدہ بلکہ ازاں ہم مستحکم تر گشتہ۔ پس کسے کہ ایں اغلاط او انماید چگونہ غیظ و غضب شان مصون و از سب و شتم شان مامون تواند شد۔ آنہا از معارضات ملیان ملل دیگر کہ برایں غلط ہائے دیرینہ ما وارد ساختہ آں را بہ اسلام نسبت میدہند۔ واقف نیستند، و از آں مشکلات کہ باعتبار علوم جدیدہ و تحقیقات حدیثہ بر اصول مقررۂ اسلاف ما از فقہا و محدثین و مفسرین وارد میشود نہ بر اصل اسلام۔ اطلاع ندارند۔ بگوش شان و بگوش اسلاف شان بمقابل سخن ہائے خود شان بجز کلمۂ آمنا و صدقنا صدائے دیگر نہ رسیدہ یک گونہ خلفشارے در عہد خلفائے عباسیہ بسبب تراجم فلسفۂ یونان بہم رسیدہ بود، علمائے اسلام بمدافعت آں برخاستند۔ تعجب ایں کہ ہم خود معترض بودند و ہم خود مجیب، مخالفے بمقابل نہ داشتند، خود گفتند و خود شنیدند و دانستند کہ فتح یافتند۔ قبول می کنم کہ فتح یافتند مگر حالا نہ آں مدعیان اند و نہ آں دعوی، نہ آں جام ست نہ آں ساقی، نہ آں بادہ ست نہ آں مینا خود آں فلسفہ از پا در افتادہ است و آں جام و مینا شکستہ۔ بنائے نو بر اساس نو بپا شدہ۔ پس کسے کہ دعوے اسلام دارد و اسلام را حق میداند و غلط را در آں امکان نمی پندارد، چگونہ آں غلط ہا را باور کند و اسلام و اسلامیان را رسوا سازد۔ پس ایں در انکار آں و آنہا در تکفیر ایں معذور اند۔ و ایں امریست کہ فطرت انسانی انسان را برآں مجبور مے سازد۔ بر ایں رہبرا یعنی دلیل، ما را واجب و لازم ست کہ ہمہ مکفران و لاعنین خود را معذور داریم، و از سب و شتم شان رنجیدہ نہ شویم و صدق و صفا را پیشۂ خود داریم و ہمہ را معاف کنیم تا از مواخذۂ عقبیٰ و داوری داور بے ہمتا ہم ایمن باشند۔ اما مخالفت و افترا نسبت بہ مدرسۃ العلوم کہ کار صلاح و فلاح قومی ست، عفو آں بہ اختیار من نیست کہ حقوق عباد برگردن شان ست۔ او شان دانند و خدائے شان

قل کفیٰ باللہ بینی وبینکم شہیدا یعلم ما فی السموات والارض والذین آمنوا بالباطل و کفروا باللہ اولئک ہم الخاسرون" والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ "

العبد المفتقر الی اللہ الصمد

سید احمد

کبھی کبھی وہ اردو تحریروں میں بھی ایک آدھ فقرہ فارسی کا لکھ دیتے تھے جو لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ سید مہدی علیخاں نے ان کو ولایت سے خط بھیجا ہے جس میں کسی موقع پر سرسید کی طرف خطاب کرکے یہ مصرع لکھا ہے "آنی کہ بدیدارت خلقیت تماشائی" اس کے جواب میں سرسید جبکہ ہندوستان میں ان پر لعن طعن کی بھرمار ہو رہی تھی، ان کو لکھتے ہیں "در مصرعۂ اول کو خطاب بہ من فرمودہ اند مگر بجائے لفظ دیدارت احوالت بودے نہایت مناسب حال من بودے "آنی کہ بہ احوالت خلقیت تماشائی" اگر غم است ہمیں قدرست کہ نمی دانم خدائے من تماشائے گدائے احوال من میکند انہ ہوالغفور الرحیم

گناہ من ار نامدے در شمار
ترا نام کے بودے آمرزگار

اے خدائے من! اے رحیم وغفور من! اے محبوب ومطلوب من! خلق را بگذار ہرچہ خواہد تماشائے من کند تو مرا اینک تماشا کن۔

نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من

آہ چہ گفتم و کجا رفتم خدائے من از من جدا نیست، مرا گذاشتن نمی تواند، پس چرا پریشاں شوم، چرا اندیشہا کنم، حمد وثنای او سرایم کہ عین حمد وثنای خود ست منصور انا الحق گفت پایۂ بلند داشت من صرف الحق گویم او خدا از من بشنود

مستجاب کن"

فارسی میں بھی سرسید کی قلم اُسی آزادی سے چلتی تھی جیسے اُردو میں۔ وہ اس بات کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ کوئی لفظ اہل زبان کے محاورہ کے خلاف نہ لکھا جائے لیکن اصل مطلب بہت صفائی اور بے تکلفی سے ادا کر جاتے تھے مثلاً جس طرح اردو میں اسے حرف ندا کی جگہ او کا لفظ خاص خدا کے لیے استعمال کرتے تھے اسی طرح فارسی میں بھی یہی لفظ بول جاتے تھے۔ اُردو میں تو اتنی گنجائش بھی تھی کہ نہایت بے تکلف اور بے لنگوٹیے یار کو اوکہہ کر پکار سکتے ہیں مگر فارسی میں کہیں بھی او کا لفظ اے کی جگہ استعمال نہیں کرتے۔ اسی طرح اور بھی بعض الفاظ اُن کی فارسی تحریروں میں محاورہ کے خلاف نظر آتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مطلب کو وہ جس طرح اُردو میں بے تکلف ادا کر سکتے تھے اُسی طرح فارسی میں کر سکتے تھے۔

پبلک سپیکنگ

پبلک سپیکنگ (یعنی مجمع عام میں اسپیچ یا لکچر دینا) یہ بھی منجملہ اُن اوصاف کے ہے جو سرسید اور اُن کے معاصرین میں مابہ الامتیاز تھے۔ مشہور ہے کہ تین چیزیں تین چیزوں کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہیں، قوت نظری قوت عملی کے ساتھ، ذہن حافظے کے ساتھ اور تحریر تقریر کے ساتھ۔ یعنی سوچنے والے اکثر کام کرنے والے نہیں ہوتے، اسی طرح ذہین آدمی قوی الحفظ کم ہوتے ہیں اور اسی طرح جن کی قلم میں زور ہوتا ہے اُن میں قوت گویائی نہیں ہوتی۔ مگر یہ عجیب و غریب شخص جیسا سوچنے والا تھا ویسا ہی کام کرنے والا تھا، اور جیسا ذہن والا تھا ویسا ہی حافظے والا تھا اور جیسا لکھنے والا تھا ویسا ہی بولنے

والا تھا۔ وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

سرسید کی تقریر کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا ہے کہ اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ اُن کی قوت تقریر تھی۔ اور جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ تحریر کا اثر مدت کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور صرف معدود آدمی اُس سے متاثر ہوتے ہیں، بخلاف تقریر کے کہ اُس کا اثر آنِ واحد میں بجلی کی طرح تمام سامعین کے دلوں میں دوڑ جاتا ہے، تحریر ہر شخص پر جو اُس کو پڑھتا ہے فرداً فرداً اثر کرتی ہے اور اس لیے وہ اثر ایک سے دوسرے میں سرایت نہیں کرتا، مگر تقریر کا اثر تمام مجلس پر دفعۃً واحدۃً پڑتا ہے اور اس لیے تمام حاضرین ایک دوسرے کی حالت سے متاثر ہوتے ہیں، تحریر میں اثر کرنے والے صرف الفاظ اور معانی ہوتے ہیں اور تقریر میں ان کے ساتھ سپیکر کا لب و لہجہ، اُس کی طرزِ ادا، اُس کی آواز کا سوز و گداز اور اُس کے اعضا و جوارح کی حرکات بھی شامل ہوتی ہیں اور اس کا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا جب کہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے پورے تین برس گذر چکے تھے۔ اس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا۔ بلاشبہ جس گرمجوشی کے ساتھ اہل لاہور نے ریلوے اسٹیشن پر سرسید اور اُن کے ہمراہیوں کا استقبال کیا تھا اور جس چاؤ اور امنگ اور فیاضی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان معزز مہمانوں کی مدارات کی گئی اور جس شوق سے بیرونِ پنجاب کے لوگ سید صاحب کی آمد آمد سُن کر لاہور میں آئے اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ فی الواقع تہذیب الاخلاق نے سرسید اور اُن کے کام کی عظمت کا نقش عموماً اہل پنجاب کے دل پر بٹھا دیا ہے۔ مگر ۲۹ دسمبر کو جو لکچر کہ سید صاحب نے

راجہ دھیان سنگھ کے دیوانخانے میں جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا اس کا سماں مجھکو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتے کا سا عالم تھا، کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تین برس میں اہل پنجاب پر کیا تھا اس لکچر نے دو تین گھنٹے میں اس کو دوچند کردیا خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگوں کردی تھی۔ انھوں نے کہا:

"اے بزرگان پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر، مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم، اپنا خیرخواہ ؟ آپ کے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، پس آپ مجھکو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا، یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسل ڈبونا اور خراب و خستہ

ل ایک صاحب جو غالباً نارمل اسکول لاہور میں ہیڈ ماسٹر تھے اور سو ڈیڑھ سو سے زیادہ تنخواہ نہیں پاتے تھے انھوں نے پانسو روپیہ چندہ کی فہرست میں لکھا تھا ۱۲ -

حالت میں ڈالن چاہتے ہیں ؛ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو اُس سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو ''

یہی الفاظ جو اس وقت معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس موقع پر جب سرسید کے منہ سے نکلے تھے ان میں کچھ اور ہی جادو بھرا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر میں لفظوں اور معنوں کے سوا کچھ اور چیز بھی ہوتی ہے جو تحریر میں نہیں ہوتی۔

سرسید کے اخیر زمانے میں کسی لائق یورپین نے اُن کے لکچروں پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ '' اگر یہ سچ ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اچھا وہی جس کا انجام اچھا ہو، تو جو کامیابی سرسید کو بذریعہ اپنی لاثانی فصاحت کے حاصل ہوئی ہے اُس سے اُن کی نیکدلی اور اسلامی حمیت کامل طور پر ثابت ہوتی ہے۔ اُن کے لکچروں نے عجیب وغریب اثر کیا ہے اور اُس فصاحت کے سحر دخارستے انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اس کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لیے تھوڑی دیر کو قوم کی اس دردناک حالت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ لینا کافی ہے جب کہ سید کی فصاحت و بلاغت نے ان لکچروں کی صورت میں اپنا مشن شروع کیا۔

کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ '' (یعنی سید) ایک پیدائشی اوریٹر ہیں۔ جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش سے بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی طرز تقریر مسٹر گلیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اُس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں اُن کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہوجاتی ہے اور چہرہ متغیر ہوجاتا ہے اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں اُن کے سامعین پر بجلی کی طرح

اثر کرتی ہیں۔"

قومی اور ملکی مجمعوں میں سپیچ یا لکچر دینے کا طریقہ قدیم یونان روما اور عرب میں برابر جاری تھا اور زمانۂ حال میں فرانس، انگلینڈ اور امریکا میں نہایت ترقی پر ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہندوستان میں انیسویں صدی سے پہلے کہیں اُس کا سراغ نہیں پایا جاتا اور اس کی وجہ ظاہر ہے، جب تک سلطنت کی طرف سے رعایا کو ہر قسم کے خیالات اور رائیں ظاہر کرنے کی آزادی نہیں ہوئی کسی ملک میں عمدہ اور یٹر یا سپیکر پیدا نہیں ہو سکتے، چنانچہ جب سے برٹش گورنمنٹ نے اس ملک میں آزادی کا سایہ ڈالا ہے یہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جن میں سے بعض بنگالی لیڈروں نے پبلک سپیکنگ میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ لیکن جہاں تک سنا گیا ہے اُن لوگوں کی تمام اوریٹری اور فصاحت انگریزی زبان پر منحصر ہے۔ گویا جو سڑک برک پٹ اور فاکس وغیرہم تیار کر گئے ہیں آنکھیں بند کر کے اُسی سڑک پر پڑ لیے ہیں، اپنی زبان میں کوئی داغ بیل نہیں ڈالی۔ سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے اپنی ملکی زبان میں پبلک سپیکنگ کی راہ نکالی ہے۔ نہ وہ انگریزی جانتا تھا جس میں بڑے بڑے اوریٹروں اور فصیحوں کے لکچروں اور اسپیچوں کے نمونے موجود تھے اور نہ اُن اصول و قواعد سے واقف تھا جو یورپین زبانوں میں اس فن کی تکمیل کے لیے مقرر کیے گئے ہیں اور نہ اپنی زبان میں کوئی ایسی مثال دیکھی تھی جس سے اس راہ میں کچھ مدد ملتی۔ جس طرح اس کے تمام اوصاف فطری اور پیدائشی تھے اسی طرح سپیکنگ کی لیاقت بھی محض خداداد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی اسپیچ یا لکچر کے لکھنے، یا پہلے سے اُس کے نیلہ ہونے کا بالکل محتاج نہ تھا۔ ہم پہلے حصہ میں جہاں انگلستان کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے۔ لکھ چکے ہیں کہ سدرن سوسائٹی اور نٹ

سول انجینیرس کے سالانہ جلسہ میں جہاں انگلستان کے متعدد ڈیوک اور لارڈ اور بڑے بڑے نامور انجینیر موجود تھے اور جس کا موضوع انجینیرنگ کے سوا اور کچھ نہ تھا وہاں جب انجینیروں کی تقریریں ہو چکیں تو سرسید نے ایک ایسے فن سے متعلق جس سے وہ محض ناآشنا تھے، ایسی برجستہ تقریر کہ تمام اہل جلسہ اُن کی داد دیتے دیتے تھک گئے اور اس تقریر کرنے کا خیال اُن کو اس وقت پیدا ہُوا جب جلسہ کے اختتام پر پریسیڈنٹ نے اُن کے آنے کا شکریہ اور خوشی ظاہر کی اور اس کا جواب دینا ضروری تھا۔

جو لکچر کہ سرسید نے ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا وہ سب سے بڑی شہادت اُن کے پیدائشی اور ہیر ہونے کی ہے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے سرسید کی منظوری بغیر پروگرام میں لکچر دینے کی تاریخ چھپوادی تھی اور سرسید چند وجوہ سے جن کا ذکر سفرنامہ پنجاب میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، مذہب پر لکچر دینا ہرگز نہیں چاہتے تھے مگر لوگوں کے اصرار سے اُن کو مجبوراً ماننا پڑا۔ لیکن نہ اُن کو زیادہ غور کرنے کی مہلت ملی اور نہ کچھ لکھنے کی نوبت آئی کیونکہ ملاقاتیوں کا صبح سے رات کے دس گیارہ بجے تک برابر تانتا بندھا رہتا تھا۔ باوجود اس کے جب اُس طول طویل لکچر کو دیکھا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح بغیر قلمبند کیے ایسی عمدگی اور حسن ترتیب کے ساتھ ایسے پیچ در پیچ اور دقیق مطالب کو یوں سلجھا کر بیان کیا ہوگا! کیونکہ وہ کوئی معمولی وعظ نہ تھا بلکہ اُن تمام شبہات کا جواب دینا تھا جو سرسید کے مذہبی خیالات کی نسبت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھے، یا اُن دلائل کا بیان کرنا تھا جن سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اسلام کی سچائی کا یقین ہو، یا اُن ضرورتوں کا ذکر کرنا تھا جنھوں نے سرسید کو تفسیر قرآن لکھنے پر مجبور کیا۔ اور ان سب باتوں کے بیان کے لیے بہت

کچھ غور و فکر اور مہلت درکار تھی۔ سفرنامۂ پنجاب کے مؤلف سید اقبال علی لکھتے ہیں کہ "مجھکو سید صاحب سے اکثر ملنے اور بات چیت سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے اس قدر موثر کلام اُن کا بھی اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا"

یہ تو اُس لکچر کا حال ہے جو مذہب پر دیا گیا تھا، اس سے بھی زیادہ عجیب وہ پولیٹیکل لکچر تھا جو نیشنل کانگرس کے خلاف انھوں نے لکھنؤ میں دیا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ اُس کا خیال اُن کو چند گھنٹے پہلے ہُوا تھا باوجود اس کے وہ ایسا جامع اور مدلل اور پرزور تھا کہ اس کے بعد ہزاروں تحریریں اور تقریریں اس باب میں اُس کے موافق اور مخالف ہوئیں مگر اُس کے آگے سب ہیچ تھیں۔

افسوس ہے کہ سرسید کی بہت سی اسپیچیں اس سبب سے کہ اُردو زبان کے لیے شارٹ ہینڈ رائٹنگ (یعنی مختصر نویسی) کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہُوا، تلف ہو گئیں، ورنہ جس قدر اُن کی اسپیچیں اخباروں میں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ اسی قدر بلکہ شاید ان سے کچھ زیادہ ایسی ہوں گی جو قلمبند نہیں ہوئیں۔ بارہا لوگوں نے اُن سے چاہا کہ آپ اپنی اسپیچ پہلے لکھوا لیا کریں اور جلسے میں اُس کو پڑھ دیا کریں مگر خاص خاص حالتوں کے سوا اُنھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لکھی ہوئی اسپیچ کا جلسہ میں پڑھنا مجھے وبال معلوم ہوتا ہے، طبیعت کی آمد رک جاتی ہے اور جوش اور ولولہ بالکل باقی نہیں رہتا۔ سفرنامۂ پنجاب میں اُن کی جس قدر اسپیچیں اور لکچر چھپے ہوئے ہیں اُن میں ایک بھی غالباً ایسا نہیں جو انھوں نے لکھ کر پڑھا ہو۔ سب برجستہ اور برمحل زبانی تقریریں کی گئی تھیں جو سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلمبند ہو گئیں ورنہ یہ بھی سب تلف ہو جاتیں۔

سرسید کی سب سے زیادہ زوردار اور موثر وہ اسپیچیں ہوتی تھیں جو کسی

پبلک جلسہ میں اپنی رائے کے خلاف بہت سی تقریریں سنکر نہایت جوش کی حالت میں بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلتی تھیں خصوصاً تعلیمی معاملات میں اُن کی رائے یا پالسی کے خلاف کسی جلسہ میں تقریریں ہوتی تھیں خواہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو، یا ایجوکیشن کمیشن کا، یا سینٹ کی مجلس ہو، یا سنڈیکیٹ کا جلسہ ہو، اس وقت عنان صبر اُن کے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی، اُن کی آواز سے تمام ہال گونج اُٹھتا تھا اور فریق مخالف اُن کے رعب میں دب جاتا تھا۔ مگر باوجود اس قدر جوش و خروش کے اُن کی تقریر کبھی تہذیب و شائستگی کی حد سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ بے شک اپنے قومی جلسوں میں وہ اکثر مسلمانوں کو نفرین و ملامت کرتے تھے مگر اُس میں دلسوزی اور ہمدردی کا پہلو اس قدر غالب ہوتا تھا کہ نفرین و ملامت کسی کو ناگوار نہ ہوتی تھی۔

وہ فرمائشی لکچر دینا اور فرمائشی اسپیچ کرنی بالکل نہیں جانتے تھے اور وقت کی راگنی کے سوا کوئی راگنی نہ گا سکتے تھے۔ کبھی کبھی جو بعض اشخاص اُن کو کسی ایسی تقریر کرنے پر جس کا اُن کی طبیعت میں کچھ جوش نہ ہو، مجبور کرتے تھے اور سرسید کو اُن کی خاطر بھی عزیز ہوتی تھی تو وہ با دلِ ناخواستہ صرف اُن کی بات پوری کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے مگر جو تقریر وہ کرتے تھے اُس میں کچھ جان نہ ہوتی تھی۔

سرسید کی طبیعت کا جوشیلا پن جیسا اُن کی اسپیچوں سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ اسپیچ کرتے وقت جہاں کہیں ایسا موقع آجاتا تھا اُن سے طبیعت کا اُبال ضبط نہ ہو سکتا تھا۔ لاہور میں جو سب سے آخری دفعہ اُن کا جانا ہوا اور وہاں کسی موقع پر تقریر کرتے وقت اُن کو جوش آیا اُس وقت اُن کی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ وہ فوراً خاموش ہو کر بیٹھ گئے

اور اس روز کھانے کی طرف مطلق رغبت نہیں ہوئی۔ ہم نے سنا ہے کہ ڈاکٹر نے اُن کی یہ حالت دیکھ کر سخت ممانعت کردی تھی کہ آپ پبلک جلسوں میں اب تقریر کرنی بالکل چھوڑ دیں۔ ورنہ جان کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اُس کے بعد انھوں نے چند مختصر تقریروں کے سوا کبھی کوئی لمبی اسپیچ نہیں دی۔

سرسید میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ایک اورٹیر میں ہونے ضروری ہیں۔ اُن کا حافظہ فطرۃً نہایت قوی تھا۔ گو آخر عمر میں بسبب کبرسن کے نسیان پیدا ہوگیا تھا مگر بچپن اور جوانی اور کہولت کے زمانے کے واقعات اور معلومات سب ازبر تھے اور اس لیے اُن کی جنرل انفورمیشن نہایت وسیع تھی اور چونکہ واقعات سے نتائج استخراج کرنے کا اعلیٰ درجہ کا مادہ خدا نے دیا تھا اس لیے اُن معلومات میں اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ ہر ایک معاملہ کی نسبت جو کہ اُن کو پیش آتا تھا خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو، خواہ رسم ورواج اور معاشرت واخلاق سے، خواہ پالٹکس سے اور خواہ تعلیم سے، وہ ایک مستقل اور غیر مذبذب رائے اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور اس لیے کسی معاملہ پر اُن کو زیادہ غور کرنے کی بہت ہی کم ضرورت ہوتی تھی اور اگر کبھی ایسی ضرورت ہوتی تھی تو ذہن بہت جلد نتیجہ تک پہنچ جاتا تھا۔ تصور کی قوت کا یہ حال تھا کہ تقریر کرتے وقت تمام پوائنٹس جو اُن کو اپنی اسپیچ میں بیان کرنے منظور ہوتے تھے گویا سب مسلسل اور ترتیب وار اُن کے ذہن میں موجود ہوتے تھے۔ اسی لیے ہم نے نہیں دیکھا کہ جس طرح عام سپیکر ایک پرچہ پر کچھ نوٹس قلمبند کر لیتے ہیں اور تقریر کے وقت ہر ایک پوائنٹ پر اسی ترتیب سے گفتگو کرتے ہیں، سرسید نے کبھی ایسا کیا ہو۔ اُن کو یہ نسبت ایک کاغذ کے پرچہ کے اپنی ذہنی ترتیب پر زیادہ بھروسا

ہوتا تھا۔ اس کے سوا چہرہ کی بناوٹ جو کہ وجاہت اور ہیبت و وقار کی بولتی تصویر تھی اور آواز کی گونج بر جوش کے وقت شیر جیسی گرج محسوس ہوتی تھی، یہ دو بڑے معاون اُن کے بیان کی تاثیر کے تھے۔ پھر زبان پر پوری قدرت اور ہر مطلب کے دلنشین کرنے کا خدا داد سلیقہ اور عین وقت پر مناسب الفاظ کا سوجھ جانا اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔ مگر سب سے بڑی چیز جو اُن کو دیگر سپیکروں سے علانیہ ممتاز ٹھیراتی ہے وہ قومی ہمدردی کا سچا جوش اور ولولہ تھا جس کے سبب جو بات منہ سے نکلتی تھی وہ دل سے اٹھتی تھی اور دل ہی میں جا کر بیٹھتی تھی۔

سرسید کی سحر بیانی خاصکر اُن لکچروں اور اسپیچوں سے زیادہ ثابت ہوتی ہے جو انھوں نے مدرسہ کے قیام کی ابتدائی کوششوں کے وقت مختلف مقامات میں دی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ قوم اور قومیت کے اصلی مفہوم سے عموماً ناواقف تھے اور قومی کاموں میں مدد دینا جب کہ اُس سے ثواب اُخروی کی توقع نہ ہو، محض فضول جانتے تھے اور اس لیے انگریزی تعلیم میں جس کو وہ خلاف مذہب سمجھتے تھے، مدد ملنے کی اُن سے ہرگز توقع نہ تھی۔ اُن کو اس بات کا یقین دلانا قریب ناممکن کے تھا کہ قوم کی مدد کرنا بعینہٖ اپنی اور اپنے خاندان کی مدد کرنا ہے۔ وہ اس بات سے محض بے خبر تھے کہ انگریزی تعلیم کو قومی ترقی میں کیا دخل ہے اور سرکاری نوکری کے سوا اس سے تجارت و صنعت اور تمدن اور معاشرت میں کیا مدد ملتی ہے۔ اُن کو اس بات کا سمجھانا نہایت مشکل تھا کہ دین کا اعزاز اور دین کی ترقی بغیر دنیوی ترقی کے ناممکن ہے۔ دولتمند اس بات کے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہم کو اپنی اولاد کی تعلیم کی کیا ضرورت ہے اور متوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگ سرکاری مدارس کو اُن

کی تعلیم کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی ضرورت تو عام ذہنوں سے اس قدر بعید تھی کہ ابتک بھی مستثنے شخصوں کے سوا لوگ اس کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں کو چھوڑ کر خاص قوم کے لیے روپئے سے کالج قائم کرنے کی ضرورت اور مصلحت سے سب بے خبر تھے۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات اُس ابتدائی حالت میں عام مسلمانوں کے ذہن سے محض اجنبی اور ناآشنا تھے جن لوگوں کے ذہن نشین کرنا خاصکر اس شخص کو جس کی طرف سے قوم میں عموماً بدگمانی پھیلی ہوئی ہو حد سے زیادہ دشوار تھا جن باتوں کو سمجھانے کے لیے آج کل کی اسپیچوں میں صرف اجمالی اشارے کافی ہوتے ہیں اُس وقت اُن کو الف بے تے سے شروع کرنے اور اصل مقصد سے پہلے لمبی لمبی تمہید یں اٹھانے کی ضرورت تھی۔ باوجود اس کے سرسید نے جس صفائی سے ان تمام خیالات کو اپنی ابتدائی اسپیچوں میں بیان کیا ہے اُس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جو باتیں لوگوں کے ذہن سے اس قدر بعید تھیں اُن کو ایسی خوبی سے سمجھایا ہے کہ کوئی بات اجنبی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بھولی ہوئی باتوں کو ایک شخص یاد دلا رہا ہے اور جو نقش دھندلے ہوگئے تھے اُن کو اجال رہا ہے۔ اُن اسپیچوں پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پنی ریڈنگ کے جلسہ میں اُس نے اس بات کے سمجھانے کو کہ دولتمندوں کی اولاد کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے رئیسوں کی طرف مخاطب ہوکر کہا "اے رئیسو اور اے دولتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہوکر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی بری حالت ہو مگر ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے ہمیں اُن لوگوں کا

خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب اُنھیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں ۔"

ایک دوسری اسپیچ میں اس مطلب کو اس طرح بیان کیا ہے " نواب خلیل اللہ خاں شاہجہانی کا نام آپ لوگوں نے سُنا ہوگا۔ اُن کے پر پوتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ لوگوں کے پانو دابنے آتا تھا اور دو چار پیسے لیجاتا تھا۔ تغلق آباد کے گانو میں جس قدر گھیارے آباد ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد میں ہیں ...... دنیا میں گزرے ہوئے زمانے کے واقعات سے ہم کو عبرت اور نصیحت پکڑنی چاہیے ...... دیکھو ہوشیار ہو، یہی حال ہماری قوم کا ہونے والا ہے، کوئی آثار بھلائی اور بہتری کے اُن میں نہیں دکھائی دیتے بلکہ برخلاف اس کے تنزل اور ادبار کی علامتیں موجود ہیں ۔"

ایک اور موقع پر رئیسوں کو بورڈنگ ہاؤس میں اولاد کے رکھنے کی ضرورت اس طرح سمجھائی ہے " اے صاحبو! تعلیم و تربیت کی مثال کمہارے کے آوے جیسی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور ایک قاعدے وان کمہارے کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے وہ کبھی نہیں پکتے پھر اگر تم چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکا لو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ تم خیال کرو کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ کو کس قدر دولت و حشمت اور سلطنت اور اقتدار حاصل ہے۔ اُن کے بعد اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کو دیکھو کہ کیا کچھ دولت و حکومت اُن کو حاصل ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی اولاد کی پوری تعلیم اپنے گھر پر نہیں کر سکتے۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ حضور پرنس آف ویلز فرزند ارجمند ملکہ معظمہ اور ولیعہد ہند و انگلینڈ یونیورسٹی آکسفورڈ کے ایک طالب علم ہیں

اور جس زمانے میں کہ میں لندن میں تھا میں نے اپنی آنکھ سے حسن پاشا خدیو مصر کے فرزند کو دیکھا کہ یونیورسٹی آکسفورڈ میں تعلیم پاتے تھے۔ لباس شاہی اور تاج خسروی سے یہ والا قدر شاہزادے طالب علمی کے لباس کو اور چوکونیا سلیٹ ٹوپی کو جو اُس یونیورسٹی میں طالب علموں کے لیے مقرر ہے زیادہ معزز سمجھتے تھے۔"

ایک دوسرے موقع پر تعلیم کے اخراجات کی ضرورت اس طرح جتائی ہے "آہ کیا افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے عزیز بیٹے کی بسم اللہ میں ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہو اس خوشی میں کہ ہمارا بیٹا پڑھنا شروع کرنے کے لائق ہوا مگر اس جگہ کے بنانے اور قائم کرنے کی کچھ فکر نہیں کرتے جہاں وہ پڑھے اور تمہاری اس خوشی کو جو قبل از وقوع تم نے اس کو فرض کر لیا ہے، پورا کرے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بغیر بوئے ہم کھیتی کے کاٹنے کی توقع کرتے ہیں اور جس غلطی میں پڑے ہیں اُس کی درستی کی کچھ فکر نہیں کرتے۔"

ایک موقع پر قومی امداد کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ تمثیل بیان کی ہے "انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر کے بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا۔ پانو نے کہا کہ میں کیوں چلکر غذا بہم پہنچاؤں! ہاتھوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو منہ تک پہنچا دیں! آنکھوں نے کہا کہ ہم اُس میں کے بال مکھی کیوں دیکھیں! ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بسا یا اندا ہونا میں کیوں سونگھوں! منہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں! سب آپ آپ کو بیکار چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں توں گذر گئے۔ پھر تو پانو لڑکھڑانے لگے، ہاتھ کانپنے لگے، منہ ہلانے کی طاقت نہ رہی۔ آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا۔ تب تو سب گھبرائے کہ یہ کیا ہوا! اس وقت عقل کے پاس گئے اس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔ تم

نے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہم کو کیا مطلب ہے! حالانکہ وہ حقیقت میں تمہارا ہی کام تھا اور اس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ اسی طرح سمجھو کہ اگر ہر ایک ضلع کے مسلمان یہ خیال کریں کہ دوسرے ضلع کے کالج میں مدد کرنے سے ہم کو کیا فائدہ ہے تو نہایت بڑی غلطی اور حقیقت میں اپنا ہی نقصان ہے۔"

ایک اور جگہ گورنمنٹ مدراس نے جو تحقیقات وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کی تھی اس کا ذکر کرتے وقت انھوں نے کہا کہ "اس چٹھی میں ترچناپلی کے مسلمانوں کا یہ حال مندرج ہے کہ "خاص مانع ترقی تعلیم مسلمانانِ ترچناپلی اُن کا افلاس ہے جس میں بہت سے مسلمان مبتلا ہیں گو وہ مفلس ہیں مگر مغرور ہیں۔ جب میں نے (یعنی صاحب چٹھی نے) مسلمانوں کے لڑکوں کو بلا فیس اسکول میں داخل کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ کپڑے اُن کے پاس نہیں ہیں اور بغیر کپڑا پہنے وہ نہیں آسکتے۔ غریب سے غریب مسلمان ہرگز اپنے لڑکوں کو دیسے آدھے ننگے پن کی حالت میں باہر نہ آنے دے گا جیسے کہ بڑے دولت مند ہندو اپنے لڑکوں کو مدرسوں میں بھیج دیتے ہیں۔"

"اے عزیزو! اب اس سے زیادہ کونسی بدبختی اور بدنصیبی ہے جس کے مسلمانوں پر آنے کی تم راہ دیکھتے ہو؟ .... اگرچہ ہم اُن غریب محتاج بھائیوں کی غیرت پر فخر کرتے ہیں اور وہ جو اپنی عزت اور شرم کا لحاظ کرتے ہیں حد سے زیادہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ پاک خون جو مسلمانوں کی نسل میں ابراہیم خلیل اللہ سے چلا آتا ہے اُن میں بھی ہے، مگر ان کی مصیبت پر دل لرز جاتا ہے اور ہم کو اپنی زندگی تلخ معلوم ہوتی ہے اور تمام عیش و آرام خاک میں ملجاتا ہے اور کون تم میں سے ایسا ہے کہ ایسی دردناک حالت اپنی قوم کی سُننے اور اُس کا دل نہ بھر آوے؟ اے بھائیو! ان تمام واقعات سے میں آن

لوگوں کو جو اپنی اولاد کی اور اپنی قوم کی تربیت کی کچھ پروا نہیں کرتے، خبر دار کیے دیتا ہوں کہ دیکھو کیا ہُوا !! اور سمجھو کہ آیندہ کیا ہوگا !!

اسی طرح سر سید نے اپنی ابتدائی اسپیچوں میں طرح طرح سے قومی تعلیم کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ کہیں یورپ کی تمام ترقیات کی جڑ تعلیم کو قرار دے کر اُس کی ترغیب دی ہے، کہیں تمام ہندوستانیوں کو متفق ہو کر خود اپنی تعلیم کا بوجھ اٹھانے کی تاکید کی ہے، کہیں ہندوستان کے اُمرا کی فیاضی کا یورپ کے دولتمندوں کی فیاضی سے مقابلہ کر کے اُن کو حقیقی فیاضی کے مفہوم سے خبردار کیا ہے، کہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اسلاف کی علمی ترقیات کا ذکر کر کے اُن کو غیرت دلائی ہے اور جہل و بے علمی کی حالت میں سلف کے علم و فضل پر فخر کرنے کی مذمت کی ہے، کہیں علوم قدیمہ کا علوم جدیدہ سے مقابلہ کر کے علوم جدیدہ کی ضرورت ثابت کی ہے، غرض کہ جو کچھ زمانۂ حال کے سپیکر تعلیم کے متعلق عام مجمعوں میں بیان کرتے ہیں اُس میں شاید ہی کوئی بات ایسی ہوگی جس کی بنیاد سر سید نے اپنے مشن کے آغاز کی اسپیچوں میں نہ ڈالی ہو اور گو کہ اب وہ عام اسپیچوں میں معمولی باتیں معلوم ہوتی ہوں مگر سر سید کی ابتدائی اسپیچوں میں وہ عام ہندوستانیوں کے لیے بالکل نئی تھیں اور ایسی اہم اور ضروری تھیں کہ آج تک تمام سپیکر اُسی بنیاد پر عمارت چُنتے چلے جاتے ہیں۔

شکل و شمائل، اوضاع و عادات، اخلاق و خصائل اور مذہب

شکل و شمائل

سر سید کے چہرہ کی بناوٹ اور بدن کی ترکیب اور تمام ہیئات مجموعی ایسی واقع ہوئی تھی کہ صرف اُن کی صورت دیکھنے سے باطنی عظمت کا خیال پیدا ہوتا تھا جس نے کبھی اُن کو نہ دیکھا ہو وہ بھی بغیر کسی قسم کے تعارف کے جب پہلے ہی بار اُن کو دیکھتا ہو گا تو ضرور ایک گریٹ مین تصور کرتا ہو گا۔ یہ بات مشہور ہے کہ خود داری اور تمکنت اور کسی چیز کو دیکھ کر تعجب ظاہر نہ کرنا ، اور اپنے تئیں لیے دیے رہنا انگریزوں کی قومی خصلت ہے مگر ایک دوست کا بیان ہے کہ سر سید جب نینی تال گئے ہیں تو میں بھی وہاں موجود تھا جس وقت اُن کا جھمپان ہوٹل میں پہنچا اکثر مسافر انگریز جو ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے اپنے اپنے کمرے سے اُن کے دیکھنے کو باہر نکل آئے اور جب تک سر سید اپنے کمرے کے اندر نہیں گئے نہایت تعجب سے اُن کو برابر دیکھتے رہے۔

کرنل گریہم نے اُن کے چہرے کو شیر ببر سے مشابہ لکھا ہے۔ اس تشبیہ کو عموماً پسند اور تسلیم کیا گیا ہے۔ بمبئی گزٹ میں کرنل گریہم کی کتاب جس کے اول میں سر سید کی تصویر چھاپی گئی ہے۔ ریویو کرتے وقت یہ لکھا تھا کہ "ہم کتاب شروع کرنے سے پہلے سید احمد کی طرف ایک لطف انگیز دل کی کشش پاتے ہیں۔ تصویر کیا ہے! گویا ایک شیر جیسی پُر رعب و باہیبت صورت کا بہادر اور دلیر ہمارے سامنے کھڑا ہے ہم حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ اُس

قدیم جنگجوئی کے زمانہ میں اس شخص کا کیا پیشہ ہوتا جب کہ مسلمانوں کی بہادری نے منجملہ انسانی ضروریات کے قوم کی تعلیم کی ضرورت کا خیال اُن کے دل پیدا نہیں ہونے دیا تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ اُس کا جب بھی یہی پیشہ ہوتا جو اب تھا۔ وہی بہادری اور اولوالعزمی جو اگلے زمانے میں ملکوں کو فتح کراتی تھی یا لوٹ مار سکھاتی تھی وہی اب دلوں کو فتح کراتی ہے اور جہل و تعصب کو تاخت و تاراج کرتی ہے۔

سرسید کو جو صریح فوقیت اور امتیاز باعتبار جسمانی اور دماغی قابلیت کے اپنے عام ہمجنسوں میں تھا یہ ایک عمدہ شہادت اس بات کی ہے کہ جو پیوند یا ازدواج دو اجنبی خاندانوں میں متحقق ہوتا ہے اُس سے غیر معمولی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سرسید کے پردادا ہرات کے سادات میں سے تھے جو شاہجہاں یا عالمگیر کے عہد میں ہندوستان میں آئے تھے اور اُن کی ننھیال کے لوگ کشمیر سے بعنوان تجارت سلطنت مغلیہ کے اخیر زمانہ میں اس ملک میں وارد ہوئے۔ پس دونوں خاندانوں میں اوپر سے کوئی قرابت یا رشتہ نہ تھا۔ صرف دوستی اور ملاقات کے سبب جو سرسید کے دادا اور نانا میں تھی، اُن کے والدین کا ازدواج وقوع میں آیا تھا۔ اب خواہ اس کو حسنِ اتفاق سمجھو اور خواہ نواب دبیرالدولہ کی دانشمندی کا نتیجہ قرار دو کہ انھوں نے اپنی بیٹی کے لیے ایسا بر انتخاب کیا جس کے صلب سے ایسا عجیب و غریب شخص پیدا ہوا۔

حلیہ

سرسید کا حلیہ یہ تھا۔ رنگ سرخ و سفید پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھویں جدا جدا آنکھیں روشن نہ چھوٹی نہ بہت بڑی، ناک نسبتاً چہرے کی شان

کے مقابلہ میں کسی قدر چھوٹی، کان لمبے، گلے میں داہنی جانب رسُولی جو ہمیشہ داڑھی میں چھپی رہتی تھی۔ چہرہ کی ہیأتِ مجموعی باوجود عبوس اور پُر رعب ہونے کے دلکش جسم بہت فربہ، لمبا قد مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ نما، ہڈی چکلی، ہاتھ پانو اور تمام اعضا نہایت قوی اور زبردست اور متناسب، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من، عنفوانِ شباب میں رسول نہ تھی اور بدن بھی زیادہ فربہ نہ تھا، بڑھاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے۔

اگرچہ سرسید کا چہرہ خاموشی اور فکر کے وقت نہایت عبوس اور ڈراونا معلوم ہوتا تھا مگر بقول کرنل گراہم کے گفتگو کے وقت اُس سے مسرت اور زندہ دلی اور گرمجوشی ٹپکتی تھی، جس طرح اخلاق میں مطلق تصنع نہ تھا اس طرح بات چیت میں بالکل بناوٹ نہ تھی، زبان دلی کی تھی مگر لب و لہجہ دلی کا سا نہیں معلوم ہوتا تھا، محض سیدھے سادے طور پر عام فہم بول چال میں وہ ہر قسم کی باتیں کرتے تھے، زبان قینچی کی طرح جلدی نہیں چلتی تھی اور نہ زیادہ محاورے یا لغت زبان پر آتے تھے۔

جب کسی نئے آدمی سے پہلی ملاقات ہوتی تھی تو وہ اور لوگوں کی طرح بات چیت کرنے کی تقریبیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں نکالتے تھے۔ اگر دوسرا کوئی بات پوچھتا تو جواب دیدیتے ورنہ خاموش بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات اس برتاؤ سے ناواقف آدمی ان کو مغرور سمجھتے تھے مگر وہ کسی کی بدگمانی کے خیال سے اپنا نیچر نہیں بدلتے تھے۔

لہ سرسید کے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی جس کی نسبت ان کا بیان تھا کہ حضرت شاہ غلام صاحب کی ہمت اور توجہ سے بالکل اچھی ہوگئی تھی ۱۲۔

اوضاع و عادات

ولایت جانے سے پہلے اُن کا لباس ہندوستانی وضع کا رہا مگر جب ولایت کا ارادہ کیا تو مسٹر ہٹن نے جو اُن کے دوست تھے، انگلستان سے اُن کو لکھا کہ یہاں آؤ تو ترکی لباس پہنکر آنا۔ اگر یہاں ہندوستانی لباس میں آئے تو یہاں کے لوگ تماشا بنالیں گے۔ بہ ظاہر انھوں نے اسی وجہ سے ترکی لباس اختیار کیا تھا مگر درحقیقت، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، یہ تبدیل لباس کا ایک بہانہ تھا، وہ پہلے ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک قومی لباس کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کر چکے تھے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ترکی لباس سے بہتر کسی لباس کو نہیں سمجھا تھا۔

یورپین طریقہ پر بود و باش رکھنا، کوٹھی بنگلوں میں آبادی سے الگ رہنا، میز کرسی لگاکر کھانا کھانا انھوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی اختیار کر لیا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ طریقہ انگریزوں کے میل جول کا ایک ذریعہ تھا، بڑا فائدہ اُس سے یہ تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں رہکر کوئی بڑا کام ہرگز انجام نہ دے سکتے تھے۔

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے اُس کی رسموں اور طریقوں سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ اُن میں اصلاح کی ضرورت اُس کو کبھی محسوس نہیں ہوتی اور اگر بعض کو محسوس ہوتی تو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اُن کو چھوڑ دیں یا اُن میں کچھ تبدیلی کر سکیں۔ مگر سرسید کی طبیعت اس قاعدے سے مستثنےٰ تھی اور ایسی طبیعت والوں کی بدولت انسان وحشی چوپایوں کی حالت سے اس درجہ تک پہنچا ہے۔ غدر کے بعد جب سے کہ ان کا میل جول انگریزوں

کے ساتھ زیادہ ہُوا، وہ اپنے ہاں کے طریق خورد نوش کو ناپسند کرنے لگے اور اُس کو بتدریج بدلنا شروع کیا۔ چنانچہ اول اول وہ عرب کے طریقہ کے موافق فرش پر بیٹھ کر اور ایک چوکی پر جو زمین سے چند انچ اونچی ہوتی ہے، کھانا رکھ کر کھاتے تھے مگر ولایت سے واپس آنے کے بعد وہ میز کرسی پر کھانے لگے۔

مہمانداری

دوستوں اور مہمانوں سے ان کا دسترخوان بہت کم خالی ہوتا تھا جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا وہ کھانا کھاتے وقت بشاش نہیں معلوم ہوتے تھے اور جس دن زیادہ مہمان ہوتے ہیں دن ان کے گھر عید ہوتی تھی۔ اگرچہ مہمانوں کی خاطر و مدارات قدیم سے اُن کی جبلی خصلت تھی مگر جب سے علیگڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز بنا اس وقت سے اُن کا گھر مہمانسرا بن گیا تھا شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا کہ ان کے ہاں کوئی مہمان نہ ہو۔ رات کے کھانے پر ان کے ہاں اکثر پُر لطف صحبت ہوتی تھی۔ مذہبی، علمی، تاریخی اور سوشل ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ ہنسی اور چہل کی باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کھانوں میں زیادہ تعدد اور تلون نہیں ہوتا تھا مگر کھانا عموماً عمدہ ہوتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کھانا عمدہ نہیں ملتا تھا تو جیسا ملجاتا تھا خوشی سے بغیر ناک منہ چڑھائے سیر ہو کر کھا لیتے تھے۔ فصل کی ترکاریاں اور فواکہ خصوصاً آم اور خربوزے نہایت مرغوب تھے سنا ہے کہ پہلے خوراک زیادہ تھی مگر بڑھاپے میں بہت گھٹ گئی تھی البتہ بعد کھانا کھانے کے کوئی پاؤ پاؤ سیر دودھ دونوں وقت بلاناغہ پی لیتے تھے پان زردہ کھانے اور حقہ پینے کی بہت عادت تھی مگر ولایت جانے وقت پان کھانا یک قلم ترک کر دیا تھا اور بجائے حقہ کے سگریٹ پینے لگے تھے۔

مسکرات سے پرہیز

کسی قسم کی مسکرات کا تمام عمر میں انھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ مرنے سے نو دس برس پہلے ایک دفعہ وہ سخت بیمار پڑے تھے، ڈاکٹر نے کوئی ہلکی سی شراب اُن کے لیے تجویز کی، اُن کے ایک دوست نے اُن سے ڈاکٹر کی تجویز کا ذکر کیا، انھوں نے شراب پینے سے انکار کیا اور مومن کا یہ شعر پڑھا۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ "جب وہ ابھی سرسید، لندن میں تھے ایک دفعہ ڈیوک آف آرگائل کے ہاں ڈنر پہ بلانے گئے، جب شراب سامنے آئی تو انھوں نے کہا "میں نوح کی شراب نہیں پیتا صرف آدم کی شراب (یعنی پانی) پیتا ہوں۔

صحتِ جسمانی

اگرچہ آخر عمر میں سرسید بتقاضائے سن بیمار رہنے لگے تھے لیکن اس سے پہلے اُن کی صحت ہمیشہ نہایت عمدہ رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں صحیح المزاج ہونے کے سبب اُن کو دوا گھٹانی پینے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ اگر دوا ذرا بدمزہ ہوتی تو وہ اس پیرانہ سالی میں بھی بچوں کی طرح ناک منہ چڑھائے بغیر نہیں پیتے تھے۔ عفت و پرہیزگاری اور محنت اور کھانے پینے میں مناسب احتیاط ان سب باتوں نے اُن کے مزاج کو اور بھی زیادہ اعتدال پر رکھا۔ بینائی اخیر تک عمدہ رہی، اگرچہ عینک لگانے کی عادت ہوگئی تھی مگر دن بھر عبارت لکھنے پڑھنے کا کام بے تکلف مثل جوان آدمیوں کے کرتے تھے۔ البتہ نسیان

بڑھ گیا تھا، دانت بھی جھو جھرے ہو گئے تھے، چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت دشواری سے ہوتا تھا کسی جلسہ میں کھڑے ہو کر اب دو چار منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کر سکتے تھے، باوجود اس کے تصنیف اور تحریر کا کام جو بمنزلہ سنتِ ضروریہ کے ہو گیا تھا، اخیر دم تک برابر جاری رہا۔

میلے تماشوں سے نفرت

اگرچہ بچپن اور عنفوانِ شباب میں اُن کو میلے تماشوں کا بہت شوق تھا مگر جب سے بھائی کا انتقال ہوا تھا یہ شوق گویا بالکل جاتا رہا، صرف علمی تماشوں میں مثل سرکس یا تھیٹر وغیرہ کے کبھی کبھی شریک ہو جاتے تھے، باایں ہمہ تھیٹر کو ہندوستان کے حق میں نہایت مضر خیال کرتے تھے۔

ظرافت

ظرافت اور خوش طبعی اُن کی جبلت میں داخل تھی مگر جس طرح اُن کی اور باتوں میں بناوٹ نہ تھی اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی میں مطلق تصنع نہ تھا، تحریر میں، تقریر میں، بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی اُن کو سوجھ جاتی تھی، اگرچہ کیسی ہی شرم و حجاب کی بات ہو، اُن سے ضبط نہ ہو سکتی تھی۔ مگر ہر ایک امر کے بیان کرنے کا خدا نے ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کوئی بات تہذیب کی حد سے متجاوز نہ ہونے پاتی تھی۔ زیادہ تر اُن کو ظرافت اور شوخی اُن لوگوں کے مقابلہ میں سوجھتی تھی جو اُن کی تکفیر یا تضلیل کرتے تھے وہ اُن کو کافر یا مرتد کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے تھے اور یہ اس طرح پر اپنے دل کا بخار نکالتے تھے۔ یاروں سے بھی اُن کا دل بہت دکھا ہوا تھا اس لیے کبھی کبھی بالمشافہ اُن سے بھی نوک

چوک ہو جاتی تھی۔

ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے، کسی اسٹیشن پر دو انگریز اُن کی گاڑی میں آ بیٹھے ایک اُن میں سے پادری تھا۔ اس کو کسی طرح سے معلوم ہو گیا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے۔ سر سید سے کہا: " مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا، میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا" سر سید نے کہا " میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنی چاہتے ہیں"؟ اُس نے کہا " خدا کی" سر سید نے کمال سنجیدگی سے کہا " میری تو کبھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لیے میں اُن کو نہیں جانتا" پادری نے متعجب ہو کر کہا " ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے"؟ انھوں نے کہا " بھی پر کیا موقوف ہے، جس سے ملاقات نہ ہو اُس کو کوئی بھی نہیں جانتا" پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا کہ " آپ اُس کو جانتے ہیں"؟ پادری نے کہا " نہیں میں اُس سے کبھی نہیں ملا" سر سید نے کہا " پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اُس کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو، نہ مجھ کو اُس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اُس کو میں کیونکر جان سکتا ہوں" پادری یہ سُن کر خاموش ہو رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ یہ تو سخت کافر ہے۔ پھر سر سید سے اُس نے کوئی بات نہیں کی، اگر تقریر کا سلسلہ آگے چلتا تو اُس کو معلوم ہو جاتا کہ خود اُس کے عقیدے کے موافق خدا ایسا ہی ہونا چاہیے جس کے ساتھ ملنا جلنا کھانا پینا لین دین انسان کے مانند ہو سکے۔

ایک دفعہ دلی کے مشنری کالج اور علیگڑھ کالج کا میچ تھا اور دلی سے کالج کے دو پروفیسر جو پادری تھے، میچ کھیلنے کے لیے اپنے طلبہ کو ساتھ لے کر علیگڑھ آئے تھے۔ سر سید نے اُن کو ڈنر پر بلایا جبکہ مسٹر بک بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ کھانے کے بعد پادری صاحب سر سید سے مخاطب ہو کر بولے کہ

"بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے کالج میں مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے، کیونکہ سچا مذہب ہی ایسی چیز ہے جو انسانی میں نیکی پیدا کرتا ہے" پادری صاحب اسلام کو تو جس کی تعلیم علیگڑھ کالج میں ہوتی ہے، سچا مذہب کہہ ہی نہیں سکتے تھے، لامحالہ اُن کی مُراد عیسائی مذہب سے تھی اور عیسائی مذہب کی بدولت جس قدر دنیا میں خونریزی ہوتی ہے اُس کی شان کسی مذہب میں نہیں مل سکتی، سرسید نے پادری صاحب کی تقریر سُن کر کہا کہ، "دنیا میں مذہب سے زیادہ کوئی بدتر چیز اور تمام برائیاں اور جرائم کا مخزن نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر ظلم اور بے رحمیاں اور قتل اور خونریزیاں دنیا میں صرف مذہب کے سبب سے ہوئی ہیں وہ ایک طرف اور جو جرائم شیطان نے کرائے ہیں وہ ایک طرف، رکھے جائیں تو بھی مذہبی جرائم اور برائیوں کو غلبہ رہے گا" پادری صاحب یہ سن کر چپ ہو گئے اور مسٹر بک سے مکان پر آکر کہا کہ میں نے تو اس شخص کو بڑا تعصب لوجین سنا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ یہ بالکل غلط تھا۔

بعض اوقات سرسید کسی مسئلے کی نسبت اپنے عقیدہ کا اظہار ظرافت کے پیرایہ میں ایسے طور پر کر جاتے تھے کہ بظاہر ایک ہنسی کی بات معلوم ہوتی تھی مگر درحقیقت وہ اُن کی اصلی رائے اُس مسئلے کی نسبت ہوتی تھی۔ جس زمانہ میں وہ بنارس میں تھے اُن کا ایک آرٹیکل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جیسا کہ اہل سنت سمجھتے ہیں، حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک سید صاحب جو بنارس میں ملازم تھے، اس آرٹیکل کو پڑھ کر خوشی خوشی اُن سے ملنے کو آئے۔ پہلے کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوتی تھیں۔ سرسید سے اُس آرٹیکل کا ذکر کر کے کہنے لگے، "کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفہ اول کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی" سرسید نے کہا "حضرت

نہ ہوگی تو اُن کی نہ ہوگی۔ میرا کیا بگڑے گا" وہ یہ سن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کہ کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے "کیوں جناب! اُس اختلاف کے وقت جب کہ کچھ لوگ خلیفۂ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اُس وقت ہوتے تو کس کے لیے کوشش کرتے؟" سر سید نے کہا "حضرت! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لیے کوشش کرتا، مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو بسوے کامیاب ہوتا" یہ سنکر اُن کا جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن گھر کا رستہ لیا۔

بظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس پیرایہ میں انھوں نے اپنی اصلی رائے مسئلہ خلافت کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اُن کے نزدیک جیسا کہ انھوں نے اپنی تحریرات میں جابجا ظاہر کیا ہے، کوئی شخص خاتم النبیینؐ کے بعد من حیث النبوۃ ان کا جانشین نہیں ہو سکتا تھا اور اس لیے وہ کسی کی خلافت کے ماننے یا نہ ماننے کو ضروریات دین میں سے نہیں سمجھتے تھے بلکہ خلافت کو محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے اور اسی بنا پر جو کچھ خلفا نے اپنے اپنے عہد میں کیا اُس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھیراتے تھے، بلکہ خود انھیں کو اُس کا جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے تھے۔

سر سید کے لطیفے خاصکر اُن آرٹیکلوں میں پائے جاتے ہیں جن میں معترضین و مخالفین کا ذکر ہے یا اُن کی طرف خطاب ہے اور سب سے زیادہ اُن کے پرائیویٹ خطوں اور رقعوں میں نظر آتے ہیں جو وہ اپنے خالص اور بے تکلف دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

ایک دفعہ جب کہ راقم بھی علیگڈھ میں سر سید کے مکان پر ٹھیرا ہوا تھا، خان بہادر مولوی سید فرید الدین احمد سب آرڈنٹ جج کا رقعۂ دعوت سر سید

کے نام آیا۔ رقعہ کے خاتمہ پر انھوں نے اپنا نام اس طرح لکھا تھا "جانی فرید" (یعنی گنہگار فرید) سرسید نے جو اُس کا جواب لکھا اس کے عنوان پر وہی الفاظ جو مولوی صاحب نے اپنی نسبت لکھے تھے، لکھدیے یعنی "جانی فرید"

اس قسم کے ہزاروں چٹکلے سرسید کی پبلک اور پرائیویٹ تحریروں میں ملتے ہیں جن کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل رسالہ لطائف و نوادر کا مرتب ہو سکتا ہے۔ مگر اس شخص کی زندگی ایسے مہتم بالشان واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ انھیں کا سمیٹنا بیوگرافر کی طاقت سے باہر ہے چہ جائیکہ اُس کے لطائف و نوادر کو جمع کرنا اور اس شعر کا مصداق بننا۔

" سنجوں آلودہ دست و تیغ غازی مانده بے تحسیں
تو خواہی زیب اسپ و زینت بر گستواں بینی "

سرسید کی شوخیِ طبع جیسی جوانی اور کہولت کے زمانہ میں تھی ویسی ہی بڑھاپے میں اخیر عمر تک رہی۔ مرنے سے چار برس پہلے جبکہ انھوں نے تیسری بار تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اُس کے اشتہار کے ساتھ جو انھوں نے ایک چھوٹا سا آرٹیکل بطور تمہید کے لکھا تھا اُس کے آخر میں لکھتے ہیں "گو ہمارا دل کیسا ہی ٹوٹا ہوا ہو مگر امید ہے کہ اب کا تہذیب الاخلاق اگر پہلے سے اچھا نہ ہوگا تو بُرا بھی نہ ہوگا اور اگر وہ مکاتبات دلچسپ بھی تہذیب الاخلاق میں چھپنے لگے جو ہم میں اور نواب محسن الملک مولوی مہدی علی میں بعض مسائل کی نسبت ہونے والے ہیں اور جن سے قصۂ آدم یاد آ جاوے گا اور کبھی سید احمد کو حکم ملے گا کہ مہدی علی کو سجدہ کر اور کبھی مہدی علی کو حکم ہوگا کہ سید احمد کو سجدہ کرو۔ تب تو تہذیب الاخلاق نہایت ہی دلچسپ ہو جاوے گا اور خدا نہ کرے کہ اُن دونوں میں سے کوئی یہ کہے۔

مِنْ نَارٍ وَ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ "

مطالعہ

مطالعہ کی عادت ابتدا سے اُن کی رفیق رہی۔ جس زمانہ میں وہ فتحپور سیکری میں منصف تھے اُس وقت مولانا نور الحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے۔ سرسید کی اُن سے نہایت گہری دوستی تھی، مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے، اُن کے سمجھنے کے لیے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فتحپور سے آگرہ میں مولانا کے پاس آتے تھے۔ کئی برس تک بلا ناغہ اُن کا یہی دستور رہا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا رستے سے ایسا آشنا ہو گیا تھا کہ ایک بار آگرہ سے چھوٹ کر فتحپور اپنے تھان پر پہنچ گیا تھا۔

سرسید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اٹھانے کے لیے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے جیسا کہ مدرس اور طلبہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملہ اور ترکیب پر غائر نظر کرتے ہیں بلکہ اُن کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا، جو بات کتاب میں اُن کے کام کی ہوتی تھی اس پر پنسل سے نشان کر دیتے تھے۔ اور اگر کوئی مضمون کسی اخبار میں کام کا ہوتا تھا اُس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کے فائل میں جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا، چسپاں کر دیتے تھے۔ جو مہتم بالشان سوالات ملک میں دائر و سائر ہوتے تھے اگر اُن کے متعلق کوئی عمدہ مضمون کسی اخبار میں نظر پڑ جاتا تھا اُس کو زیادہ غور سے دیکھتے تھے اور ہر ایک سوال کے متعلق اپنی ایک مستقل رائے قائم کر لیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت سمجھتے تھے تو اُس پر چھوٹا یا بڑا آرٹیکل لکھ کر چھپنے کو بھیج دیتے تھے جو مضمون اُن کے خلاف اخباروں میں چھپتے تھے اُن کو بہت شوق اور توجہ سے دیکھتے تھے اور اکثر حاضرین کو بھی سناتے تھے۔ انگریزی اخباروں کو بعض

خبریں یا نوٹس یا کوئی ضروری آرٹیکل کسی انگریزی داں سے پڑھوا کر سُن لیتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی اُس کا ترجمہ کرا لیتے تھے۔

کتابیں اکثر اُن کے مطالعہ میں مذہبی دیکھی گئی ہیں، تصنیف کی حالت میں صرف بقدر ضرورت یا تو کتاب خود دیکھ لیتے تھے اور یا کوئی دوسرا شخص مقام مطلوب نکالکر اُن کو دکھا دیتا تھا اگر کوئی لطیف بات مضمون کتاب کے خلاف یا اُس کی موید یا اُس کے متعلق ذہن میں آجاتی اُسی وقت اُس پر کچھ لکھا اور اخبار میں چھپنے کو بھیجدیا۔

غدر کے بعد سے پریس ہمیشہ اُن کے ہاتھ تلے رہا اس لیے یہ عادت اُن کی طبیعت ثانی بن گئی تھی کہ مضمون لکھنے کے بعد جب تک کہ وہ شائع نہ ہو جاتا، اُن کو چین نہ پڑتا تھا۔ یہی حال کتاب کی تصنیف کا تھا۔ اودھر ایک پوائنٹ ختم ہوا اور ادھر چھپنے کے لیے بھیجا گیا۔ مسودہ پر بار بار نظر ڈالنا اور زیادہ کاٹ چھانٹ کرنا ان کا دستور نہ تھا، البتہ مسودہ صاف کرنے کے لیے وہ کاتب کو دیدیتے تھے اور جب صاف ہو جاتا تو کتابت کی تصحیح کے ارادہ سے اُس کو ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔

تصنیف کی حالت

تصنیف کی حالت میں جب کوئی مشکل مقام پیش آجاتا اور زیادہ غور کی ضرورت ہوتی تو وہ تنہا ہوتے یا مجمع میں۔ بالکل اُس میں مستغرق ہو جاتے تھے، چہرہ عبوس ہو جاتا تھا، ہنسی یا تبسم پاس نہ آتا تھا۔ لوگ آپس میں باتیں کرتے مگر اُن کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی کبھی ایسے موقع پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے اور جب تک طبیعت راہ نہ دیتی برابر اُسی خیال میں منہمک رہتے۔ جب عقدہ حل ہو جاتا

فوراً چہرہ پر بشارت آجاتی۔ اگر اُس وقت کوئی مخاطب صحیح پاس ہوتا تو بعض اوقات اپنا ساتحہ اُس کے روبرو بیان کرتے، اگر اور لوگ بھی اس کو پسند کرتے توخوش ہوتے اگر کوئی اعتراض کرتا تو اس پر بحث کرتے یا خاموش ہو جاتے مگر فوراً تسلیم کبھی نہ کرتے تھے۔

خطوں کا جواب دینا

خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے۔ جو خط کہ پانی پت سے علیگڑھ بھیجا جاتا ہے اگر وہاں پہنچتے ہی اُس کا جواب لکھا جائے تو تیسرے دن وہاں سے جواب آجاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے خط کا جواب کبھی چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو جبکہ اُن کا برتاؤ ہم لوگوں کے ساتھ یہ تھا تو دیکھنا چاہیے کہ اپنے خاص دوستوں کو معذوری کی حالت کے سوا وہ ہمیشہ پرائیوٹ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، البتہ مدرسہ وغیرہ کے متعلق جو خط لکھنے ہوتے تھے وہ اکثر ہیڈ سٹ لکھتا تھا اور وہ خود بتاتے جاتے تھے۔ لیکن جو فضول تحریریں لوگ ان کے پاس بھیجتے تھے اُن کا کچھ جواب نہ دیتے تھے جس خط کا جواب لکھ چکتے اُس کو فوراً چاک کر ڈالتے تھے کبھی انھوں نے کسی تحریر کو اس خیال سے کہ اُس کو الزام دینے یا شرمندہ کرنے کا موقع رہے، اپنے پاس دستاویز بنا کو نہیں رکھا۔ جب کسی خالص و مخلص دوست کی زیادہ بیماری کی خبر آتی تو جب تک صحت نہ ہوتی وہ برابر تار پر تار یا خط پر خط بھیجتے رہتے، جو خط کہ وہ اپنے بے تکلف اور خالص اور مخلص دوستوں کو لکھتے تھے اُن کا انداز تحریر فی الواقع ایسا دلکش اور دلنشین ہوتا تھا کہ اگر اُس کو جادو یا افسون یا سحر کا عمل کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ اب تک کسی نے ان کے خطوط جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی، اگرچہ

امید نہیں ہے کہ ان کا دسواں حصہ بھی اب فراہم ہو سکے لیکن جس قدر دستیاب ہوں ان کا جمع کرنا نہایت ضروری ہے، وہ ایک ایسا مجموعہ ہوگا جو غیروں کو اپنا بنانا اور وحشیوں کو رام کرنا سکھائے گا. وہ سچی دوستی اور سچی محبت کا نمونہ ہوگا، وہ آیندہ نسلوں کو یاد دلائے گا کہ ہمارے اسلاف کیسے بے ریا اور کیسے محبت والے ہوتے تھے؛ کس طرح دوستوں کا دل اپنی مٹھی میں رکھتے تھے! اور کیونکر انکے دلوں کا شکار ہوتے تھے!

جب وہ ولایت سے ہندوستان آنے کو ہیں انھوں نے مولوی مہدی علیخاں کو اپنے آنے کی اطلاع دی ہے اُس میں لکھتے ہیں کہ "چوتھی پانچویں کو الہ آباد پہنچ کر آپ کے دیدار فرحت آثار سے مشرف ہوں گا اور آپ کے قدموں کو مثل نعلین بوسہ دوں گا. اگرچہ آپ کے قدم میرے ناپاک لبوں سے ناپاک ہو جاویں گے مگر امید ہے کہ آپ مرحمت سے دھولیں گے، خنزیر خود ناپاک ہے مگر جس پاک چیز کو وہ مس کرے دھونے سے پھر پاک ہو سکتی ہے۔"

"افسوس میں نے غلطی کی جو اپنے تئیں خنزیر سے تشبیہ دی، وہ تو مجھ سے بہت اعلیٰ ہے خدا نے اس کو یاد کیا ہے، مجھے تو سوائے مہدی علی کے اور کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔"

اس کے بعد مولوی مہدی علی کی تحریرات جو اخبار میں کچھ سرسید کے موافق اور کچھ مخالف چھپی ہیں اُن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جو جو مقام مجھ کو اُس میں کھٹکتے ہیں (یعنی جو میرے خلاف ہیں) اُس سے میرا دل عجیب طرز پر خوش ہوتا ہے جیسے کوئی سوداگر یہ دیکھے کہ ایک نہایت بیش بہا وبے نظیر ہاتھی اُس کی اوگی میں آن پھنسے اور وہ یقین کرے کہ اب وہ نکلنے والا نہیں۔"

یہ ایک معمولی مثال ہے اُن محبت آمیز باتوں کی جو سرسید کی دوستانہ تحریروں میں عموماً دیکھی جاتی ہیں اور اس بات کی تصدیق سید مہدی علیخاں سلمہم اللہ خود کریں گے کہ وہ فی الواقع سید کی اوگی میں پھنسے تھے یا نہیں اور پھنسکر اُس میں سے نکلنے کا اُن کو موقع ملا یا نہیں!

محنت و جفاکشی

محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ قطع نظر اس کے کہ ابتدا سے اُن کو کام کرنے کی عادت رہی اُن کے قویٰ میں قطرۃً مشکلات کے برداشت کرنے اور کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیاقت اور استعداد رکھی گئی تھی اور ظاہراً اُن کی غیر معمولی ذہانت بھی اُن کی دائمی غور و فکر اور دماغی محنت کا نتیجہ تھا کیونکہ بچپن میں جیسا کہ خود سرسید کے بیان سے معلوم ہوا ہے، وہ باعتبار ذہانت و جودت کے اپنے ہمچشموں میں کچھ امتیاز نہ رکھتے تھے، مگر چونکہ انھوں نے اپنے تمام قوتوں سے جو خدا تعالیٰ نے اُن کے نفس میں ودیعت کیے تھے، پورا پورا کام لیا تھا اس لیے اُن کے ذہن اور حافظہ اور عقل سب کو جلا ہو گئی تھی کہتے ہیں کہ نیوٹن اسکول میں کچھ ذہین لڑکا نہیں معلوم ہوتا تھا، جب اُس سے بڑے بڑے کار نمایاں ظاہر ہوتے اور اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ تم نے اتنی نئی باتیں کیونکر نکالیں تو اس نے یہی جواب دیا کہ ہو جس استقلال کے ساتھ برابر غور کرتا رہا۔ محنت سے ایسے بڑے بڑے کام ظہور میں آئے ہیں کہ بعض حکما کو شبہ ہو گیا ہے کہ آیا ذہانت بغیر محنت کے فی نفسہ کوئی چیز ہے یا نہیں؟

بہر حال سرسید کے تمام قوائے عقلیہ کی جلا کرنے والی اور اُن کو ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی اُن کی دائمی محنت اور متصل غور و فکر اور استقلال تھا۔ سید میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بیان کرتے تھے کہ "جس زمانہ میں سید صاحب دلی سے رہتک بدل کر گئے ہیں میں بھی اُن کے ساتھ گیا تھا وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے جن کو دلی سے ہمراہ لے گئے تھے، سبق

پڑھتے تھے، بیس بیس بائیس بائیس صفحے شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے، میں بھی اُن کے ساتھ پڑھنے کے لیے گیا تھا مگر اس رفتار سے اُن کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلی چلا آیا۔ سبق کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے تھے، پھر کچہری جاتے اور شام تک کچہری کرتے۔ وہاں سے آکر شام کے کھانے اور نمازوں سے فارغ ہو کر سو رہتے، کوئی تین ساڑھے تین گھنٹے سوتے تھے، اس کے بعد ہمیشہ بلا ناغہ اُٹھ بیٹھتے اور صبح تک برابر مطالعہ کرتے تھے جب تک میں رہتک میں رہا برابر اُن کا یہی قاعدہ دیکھا۔"

یہ تو اُس زمانہ کا حال ہے جب سرسید کی عمر ۳۶ برس کی تھی، اس سے آٹھ نو برس بعد مرادآباد اور غازیپور میں بھی جبکہ وہ تبیین الکلام لکھتے تھے، اُن کی محنت کا حال، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اسی کے قریب قریب تھا۔ ولایت میں خطبات احمدیہ کے لکھنے میں انھوں نے ڈیڑھ برس برابر ایسی محنت شاقہ کی جس سے آخر کار اُن کے پانو میں ایک مرض پیدا ہو گیا جو اخیر دم تک زائل نہیں ہوا، اُن کے پانو اور پنڈلیاں سوج جاتی تھیں اور تلووں میں درد ہو جاتا تھا مہینے مہینے دو دو مہینے برابر یہ تکلیف رہتی تھی، چند روز کو افاقہ ہو جاتا تھا پھر وہی شکایت پیدا ہو جاتی تھی باوجود ان مشکلات کے انھوں نے خطبات احمدیہ کو ولایت ہی میں پورا کیا اور وہیں چھپوایا۔

جس زمانہ میں وہ سائنٹفک سوسائٹی کا مکان بنوا رہے تھے سخت گرمی کا موسم تھا، شام تک لو چلتی تھی، وہ کچہری سے آکر گھر کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ کر سیدھے سوسائٹی پہنچتے تھے اور ظہر و عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں پڑھتے تھے۔ اُن کے دوست محمد سعید خاں بیان کرتے تھے کہ اکثر مجھے بھی وہ ساتھ لیجاتے تھے، میرا گرمی اور لو کے مارے بُرا حال ہوتا تھا مگر وہ بے تکلف سارا دھوپ

اور لُو اور گرمی کا وقت وہیں راج مزدوروں میں بسر کرتے تھے۔

اخیر زمانہ میں جو کہ شیخوخت کا زمانہ تھا، اُن کی محنت جوانی اور کہولت کے زمانہ سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ وہ اُس پیادہ سیاح کی طرح جو سرد مہیر ملک میں سیاحت کے لیے داخل ہو، جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے، اسی قدر اُن کی چال زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ ان کا اس عارفانہ مقولے پر پورا پورا عمل تھا کہ " ضاعف فی الکبر همتك فان وقتك قد دنی وعما قلیل یتدعی " یعنی بڑھاپے میں اپنی ہمت دوچند کر کیونکہ تیرا وقت قریب آپہنچا ہے اور عنقریب تیری بلاوٗ ہونے والی ہے۔

وہ تقریباً ہمیشہ صبح کے چار بجے سے شام کے آٹھ بجے تک برابر جاگتے اور مختلف کاموں میں معروف رہتے تھے۔ دوپہر کو سخت بیماری کے سوا کبھی پلنگ پر جاکر نہ لیٹتے تھے۔ اگر کبھی رات کو نیند نہ آتی تو اور دن کو نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو بھی وہ اپنی نشستگاہ سے نہیں اٹھتے تھے۔ جو ایسا ہی نیند کا خمار ہوا تو وہیں کرسی یا تکیہ کے سہارے سے ذرا کمر سیدھی کر لیتے تھے۔ اگر اس میں کبھی آنکھ لگ گئی تو ذرا سی آہٹ سے فوراً کھل جاتی تھی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ چونکہ بڑھاپے اور زیادہ فربہی کے سبب وہ اپنے میں پھرتی اور چالاکی کی قابلیت نہیں دیکھتے تھے اس لیے جن کاموں میں پھرتی کی ضرورت ہوتی تھی اُن کے لیے بہت پہلے سے تیار ہو جاتے تھے۔ ریل پر وقت سے دو دو گھنٹے پہلے جا بیٹھتے تھے کسی ڈنر یا موت یا جلسہ یا دربار میں جانا ہوتا تو وقت معین سے بہت پہلے تیار ہو بیٹھتے تھے، کسی حاکم اعلیٰ کو ایڈریس دینی ہوتی تھی تو دس دس بارہ بارہ روز پہلے سب کام لیس کر رکھتے تھے، غرض کہ ہر ایک کام کی تیاری وہ اُس وقت سے شروع کرتے تھے جب کسی کو اُس کا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ جو اُن کا ایک لازمی مشغلہ تھا، مدرسہ کے متعلق تمام اہم اور ضروری کام یا تو خود اپنی ذات سے کرتے تھے یا اپنی نگرانی میں اپنے بیش دستوں سے لیتے تھے مثلاً مدرسہ کی سالانہ آمدنی اور خرچ کا بجٹ بنانا اور اُس کا خلاصہ گورنمنٹ میں بھیجنے کے لیے مرتب کرنا۔ سال تمام کی رپورٹ لکھنی، ہر دوسرے تیسرے مہینے اجنڈا تیار کرنا اور اُس کے تمام کاغذات چھپوا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنے اور اُن کو ووٹ بھیجنے کے لیے اکثر کئی کئی دفعہ تقاضے کے خط لکھنے پھر ہر ایک جلسہ کی روئداد لکھ کر اور چھپوا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنی، گورنمنٹ سے، سررشتہ تعلیم سے، طالب علموں کے مربیوں سے، بینک سے اور ٹرسٹیوں سے وقتاً فوقتاً کتابت کرنا، روزانہ آمدنی اور خرچ کو روزنامچہ میں درج کرنا عمارتوں کے نقشے تجویز کرنے اور اُن کے موافق ہر ایک عمارت کو اپنی نگرانی میں تیار کرانا، اُن کے لیے ہر قسم کا سامان اور مصالح اپنی رائے اور تجربہ سے منگوانا، ہر ایک عمارت کے لیے مناسب کتبہ یا تاریخ تجویز کرنی اور اُس کو اپنے اہتمام میں کندہ کرانا، تیار شدہ عمارتوں کی تابمقدور خبر رکھنی اور اُن کے نقصانات کا تدارک کرنا، کالج اور تعمیر کے اخراجات کے لیے چندہ جمع کرنے کی نت نئی تدبیریں سوچنی اور اُن تدبیروں کے موافق عمل درآمد کرنا اور اخبار اور خطوط کے ذریعہ سے چندہ کی تحریک کرنا اگر روپیہ بہم نہ پہنچے تو قرض سے مدرسہ کا کام چلانا، کالج یا بورڈنگ ہاوس کے انتظام کے متعلق جب کوئی شکایت گزرے تابمقدور اُس کے تدارک کی فکر کرنا اور جب کوئی مناسب یا ضروری تجویز منظور ہو جائے اُس کے پورا کرنے کے لیے ہر قسم کی تدبیر عمل میں لانا، اردو اخبارات جو اطراف و جوانب سے آتے تھے اُن سب پر ایک نظر ڈالنا اور بعض انگریزی اخباروں کو کسی اپنے ہم نشست سے پڑھوا کر سننا ہمیشہ قوم کے

اہم معاملات سے جو اخباروں میں درج ہوتے تھے، نوٹس لینا اور اپنے اخبار میں اُن پر بحث کرنا اور بعض ضروری کا ترجمہ انگریزی میں کراکر کبھی اپنے اخبار اور کبھی کسی معتبر انگریزی اخبار میں شائع کرانا، ہفتہ میں دربار اخبار کے پروفوں کا خود صحیح کرنا، اپنی یا دوستوں کی کتابیں جو فروخت کی غرض سے مدرسہ کے فائدہ کے لیے ہمیشہ چھپتی رہتی تھیں یا کانفرنس کی رپورٹیں اور لکچر یا کالج کا بجٹ یا رپورٹ سالانہ تمام یا ٹرسٹیوں کے اجلاس کی روئداد میں غرض کہ جو کچھ اُن کے اہتمام میں چھپتا تھا سب کی کاپیوں یا پروفوں کا اصل سے خود مقابلہ کرانا اور آپ اُن کی تصحیح کرنا اور اپنے سامنے اُن کے پیکٹ بنواکر مطبع میں بھیجنا، مدرسہ کی تجارتی کتابوں کے خود اشتہار چھپواکر اُن کو آپ فروخت کرنا اور اُن کا حساب کتاب رکھنا، کالج کے متعلق تمام حساب کتاب کے رجسٹروں بجٹوں، رپوٹوں اور روئدادوں وغیرہ کی اور کالج لائبریری کے متعلق اورنٹیل زبانوں کی کتابوں کی جلدیں بندھوا کر الماریوں میں اپنے سامنے احتیاط سے رکھوانا، یوروپین حاکم اور افسر اور ارکان سلطنت جو اکثر کالج کے ملاحظہ کو آتے رہتے تھے اُن کی مدارات اور استقبال و مشایعت کا خود انتظام کرنا، اُنکے دربار کیلئے ہال کو خاص اپنے اہتمام میں آراستہ کرنا، اُن کے واسطے ایڈریس تیار کرنا اور اُس کو انگریزی میں ترجمہ کرانا اور چھپوانا اور پھر ایڈریس اور اُس کا جواب اور تمام جلسہ کی کارروائی کو اخبار کے ذریعہ سے شائع کرنا، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر خواہ اُس کا اجلاس علیگڑھ میں ہو اور خواہ کسی دوسرے شہر میں، سب کام چھوڑ کر آٹھ دس روز تک برابر اُس کارروائی اور انتظام میں ہر وقت مصروف رہنا، یہ اور اسی قسم کے بیشمار چھوٹے بڑے کام یہ شخص اس ضعیفی کے زمانہ میں سرانجام کرتا تھا۔ اگر ان تمام کاموں سے قطع نظر کیجائے اور صرف چندہ جمع کرنے اور اس کی تدبیریں سوچنے ہی کے کام پر غور کیا جائے

تو یہی ایک ایسا کام تھا کہ اگر دوسرا شخص اسی کام کو اپنے ذمے لے لیتا تو پھر وہ اور کسی کام کا نہیں رہ سکتا تھا۔ تعمیرات کا کام بھی آسان کام نہ تھا جس کے لیے کم سے کم ایک لائق اور سیر رکھنے کی ضرورت تھی مگر سرسید نے یہ بوجھ بھی اپنے سر دھر لیا تھا یہاں تک کہ سات آٹھ لاکھ کی عمارت صرف اپنی تجویز اور اپنے اہتمام سے بنوا ڈالی۔

باوجود ان تمام بکھیڑوں کے وہ اپنی خاص طرز کی تصنیف کا نہایت کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ بھی انھیں مشغلوں کے ضمن میں طے کرتے تھے۔ دوستوں کے بے شمار خطوں کے جواب اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، مہمانوں کی حالت کے موافق اُن کی آسائش کا انتظام کرتے تھے۔ اُن کے لانے کے لیے مختلف اوقات میں ریلوے سٹیشن پر سواری بھیجتے تھے اور جب تک اُن کا قیام رہتا تھا ہر وقت اُن کا خیال رکھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ جو مستعدی اور ہمت اور ہر ایک بات کی خبرداری اور ہر ایک فرض کی نگہداشت اس شخص میں بڑھاپے میں دیکھی گئی ہے وہ کسی توانا اور تندرست نوجوان میں بھی نہیں پائی جاتی اور یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ ایک محض ناواقف شخص بھی صرف اس کے روزمرہ کے کام دیکھ کر اس قدر ضرور سمجھ سکتا تھا کہ اس شخص کی خلقت معمولی آدمیوں کی خلقت سے جداگانہ تھی۔ متنبی نے کیا خوب کہا ہے ؎

وَاِذَا کَانَتِ النُّفُوْسُ کِبَارًا — تَعِبَتْ فِیْ مُرَادِھَا الْاَجْسَامُ

(یعنی جب نفوسِ انسانی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں تو اعضائے انسانی اُن کے ارادے پورے کرتے کرتے تھک جاتے ہیں)۔

باوجود اس قدر مصروفیت اور کاموں کی کثرت کے اُن کی زندہ دلی نہایت تعجب خیز تھی۔ وہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا رنج اور افسردگی کو کبھی پاس نہ آنے دیتے تھے اور خانگی بکھیڑوں اور خرخشوں سے تا بمقدور الگ تھلگ رہتے

تھے۔ جس طرح اُن کے باپ گھر کے تعلقات سے آزاد تھے اسی طرح سرسید اپنے پرائیویٹ معاملات سے بہت ہی کم سروکار رکھتے تھے اور یہی اثر اُن کی اولاد میں پایا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ قومی کاموں کے متعلق کوئی کیسا ہی معقول عذر کرے اور مکروہات خانگی کے سبب کیسی ہی مجبوری بیان کرے وہ ہرگز نہ سنتے تھے اور جب تک سب کام چھوڑ کر اُن کی فرمائش پوری نہ کی جاتی تھی وہ کسی عذر کو قابل سماعت نہ سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ جب کام سے خالی ہوتے تھے ہنسی، دل لگی اور دوستوں کی صحبت سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے۔ بچوں سے، بوڑھوں سے، جوانوں سے، دوستوں سے، ملازموں سے انگریزوں سے اور ہندوستانیوں سے بشرطیکہ دل ملا ہوا ہو اور کسی طرح کی مغایرت نہ ہو، ہنسی اور چہل کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہی زندہ دلی تھی جو اُن سے ایسی سخت محنت کراتی تھی اور تکان اور ماندگی اور ملال وکلال کو کبھی پاس نہ آنے دیتی تھی۔ اگرچہ جس زمانہ میں ہم نے اُن کو دیکھا ہے اُن کی ہنسی اور چہل صرف باتوں میں رہ گئی تھی مگر جیسا کہ سنا گیا ہے ابتدا میں اُن کی شوخیاں صرف بات چیت ہی میں محدود نہ تھیں۔ کرنل گرہیم جو اُن کے قدیم دوست تھے لکھتے ہیں کہ "وہ اس قدر خوش طبعی اور تمسخر کرتا ہے جس قدر کہ کوئی آدمی کر سکتا ہے"۔ کبھی رات کے وقت ایک رسّی سے سانپ سانپ کہہ کر حاضرین کو ڈرا دینا، کبھی نہایت بھیانک اور ڈراونی آواز سے اونگھتوں کو چونکا دینا، کبھی کسی سوتے ہوئے کی چھاتی پر چڑھ کر اُس پر اپنا سارا بوجھ ڈال دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جن میں سے بعض بیان نہیں کی جاسکتیں اُن کے دوستوں سے سُنی گئی ہیں۔

بعض اوقات اُن کے ماتحت یا ملازم جن سے بے تکلفی تھی اُن کو ایسا جواب دیتے تھے جس سے انھیں شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ کبھی بُرا نہ مانتے

تھے بلکہ خوب قہقہے لگاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم نے اس امر کے متعلق ایک دلچسپ نقل بیان کی، وہ کہتے تھے کہ " حافظ عبدالرحمٰن جو ۲۵ برس سید صاحب کے رفیق رہے وہ رہتک میں بھی اُن کے ساتھ تھے اگرچہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلت تنخواہ کے سبب اُن کو اپنے پاس رکھتے تھے اُن سے اکثر ہنسی چُہل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حافظ جی اپنی ترقی کے لیے اکثر کہا کرتے مگر چونکہ ترقی کی گنجائش نہ تھی، سید صاحب ہنسی سے یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ تمھارا خط اچھا نہیں اور نہ کبھی اچھا ہو سکتا ہے کیونکہ تم بدصورت ہو اور بدصورت کبھی خوش نویس نہیں ہو سکتا۔ ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاءاللہ بہت وجیہ ہیں، آپ کا خط کیوں اچھا نہیں! سید صاحب نے کہا میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے اس واسطے میں بھی بدصورت ہو گیا ہوں۔ پس میرا خط کیونکر اچھا ہو سکتا ہے۔"

" ایک دن سید صاحب نے حافظ جی سے کہا بھلا صاحب! اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو مجھے کیا عہدہ دو! حافظ جی نے وہ تمام سلوک جو سید صاحب اُن کے کرتے تھے، بیان کیے کہ میں آپ کی بڑی خاطر کروں، دونوں وقت آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں، رات کو آپ کا پلنگ اپنے پلنگ کے برابر بچھواؤں اور خیال کروں اور خبر گیری کروں، سید صاحب نے کہا ان باتوں کو جانے دو، یہ بتاؤ کہ مجھے عہدہ کیا دو! حافظ جی نے ذرا روکھی صورت بنا کر کہا حضرت! میں مجبور ہوں چونکہ آپ کا خط اچھا نہیں اس لیے کوئی عہدہ نہ دے سکوں گا۔ سید صاحب اور ہم سب لوگ یہ گرم فقرہ سُن کر پھڑک گئے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔"

غرض کہ سر سید نے تابمقدور کبھی غم اور رنج کو پاس نہیں آنے دیا۔ شہر میں، بیرِ دستجات میں، آبادی میں، جنگل میں جہاں کہیں ہوتے انھوں نے اپنی خوشی

اور دل لگی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور مہیا کر لیا۔

وہ اپنی باتوں سے نہ صرف بڑوں کو بلکہ بچوں کو بھی تسخیر کر لیتے تھے، یہاں تک کہ جو وحشت بچوں کو بڑے بوڑھوں کی صحبت سے ہوتی تھیں وہ اُن میں باقی نہ رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے بھتیجے کو اپنے بیٹوں کو اور اخیر عمر میں پوتے کو اپنے سے ایسا مانوس رکھا کہ مائیں بھی بچوں کو اپنے ساتھ ایسا مانوس نہیں رکھ سکتیں۔ اُن کا برتاؤ ان سب کے ساتھ بالکل ایسا رہا جیسا یار دوستوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد آباد میں اُن کے بھتیجے کو کنکوے لڑانے کا شوق حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ سرسید چاہتے تھے کہ یہ وحشت جاتی رہے مگر اُس پر جبر کرنا گوارا نہ تھا۔ آخر لاچار ہو کر ایک دن کہا کہ بھئی آج تمہاری پتنگ بازی کی ہم بھی سیر دیکھیں گے۔ شام کو جب کہ پیچ پڑ رہا تھا اور دونوں طرف سے ڈھیل دی جا رہی تھی، آپ بھی وہاں پہنچے اور ہاتھ بڑھا کر چلتی ڈور کو تھام لیا اور جب پیچ کٹ گیا تو پکار پکار کے کئی دفعہ کہا "ہم ہارے ہم ہارے" یہ دیکھ کر فریقِ ثانی کا جوش کم ہو گیا دوسرے دن کوئی اُدھر سے پتنگ لڑانے کو نہ اُٹھا اور پتنگ بازی کا خاتمہ ہوا۔

سرسید کی ذہانت بھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اُن کی لگاتار محنت اور متصل دماغی ریاضت کا ایک نتیجہ تھا۔ ایک یوروپین مصنف نے لکھا ہے کہ "میں ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جو بڑے ذہین مشہور تھے لیکن آخر کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اصل میں بڑے محنتی تھے۔" سرسید کی ذہانت کی نسبت ایک انگریز نے سید محمود سے کہا کہ "تمہارے باپ کا دماغ کیا ہے گویا ٹائپ کے حرفوں کی الماری ہے، جس طرح اُس الماری میں جس حرف کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً مل جاتا ہے اسی طرح ہر سوال کا جواب اس کے دماغ میں ہر

وقت موجود رہتا ہے" فی الواقع سرسید کے اشتغال ذہنی کا یہی حال تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ ہر ایک ضروری سوال پر جو ملک میں دائر و سائر ہوتے تھے بجائے خود غور کر کے اُس کی نسبت ایک پختہ رائے قائم کر لیتے تھے اور اس لیے جب وہ سوال معرض بحث میں آتا تو اُن کو اُس کا جواب دینے میں زیادہ تامل کرنا نہیں پڑتا تھا اور یا یہ کہ دماغی ریاضت اور برابر غور و فکر کرنے کی عادت نے اُن میں یہ ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکثر سوالات کی نسبت اونے تامل سے ایک سنجیدہ اور معقول رائے ظاہر کر سکتے تھے۔

بہر حال یہ تمام نتیجے دائمی غور و فکر اور نور نظرت کے روشن رکھنے اور آپ اپنی تعلیم کرنے کے تھے۔ تقلید کی عادت خواہ امور مذہبی میں خواہ مسائل علمی میں اور خواہ معاملات دنیوی میں، انسان کو کبھی اپنے اوپر بھروسا اور اعتماد کرنے نہیں دیتی۔ وہ ہمیشہ بچوں کی طرح جو چلنے میں اوروں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں، ہر معاملہ میں دوسروں کا منہ تکتا رہتا ہے۔ سرسید کو زمانہ کی ضرورتوں نے اول مذہبی تقلید سے نجات دی جس سے اُن کو مذہبی مشکلات میں اپنی طبیعت پر زور ڈالنے اور اپنی رائے اور سمجھ پر تکیہ کرنے کی ضرورت اور عادت ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ عادت اُن کی طبیعت ثانی ہو گئی اور ہر قسم کے سوالات پر غور کرنا اور سوچنا اور اپنی مستقل رائے قائم کرنا اُن کا وتیرہ ہو گیا اور اس طرح اُن کے قوائے عقلیہ بتدریج جلا پاتے رہے۔

سرسید کی غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر جنیس کا سب سے بڑا ثبوت اُن کی مذہبی تحقیقات یا وہ تدبیریں ہیں جو اُن سے مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور اُس کی ترقی دینے میں ظاہر ہوئیں اور جن کا ذکر اس کتاب میں بقدر ضرورت اپنے اپنے موقع پر ہو چکا ہے، اور اگر کسی کو اُن کی عالی دماغی کی مجسم تصویر

دیکھنی ہو تو سید محمود کو دیکھ لینا کافی ہے جن کی نسبت مسٹر وائٹلی سٹوکس[1] لیگل ممبر لیجسلیٹو کونسل وائسرائے کشور ہند نے کونسل میں یہ الفاظ کہے تھے "نہایت نامور باپ کا نامور بیٹا" ہم یہاں صرف اُن کے بعض لطیف خیالات کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُن کی طبیعت میں ایک خاص مناسبت فنون لطیفہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ منجملہ اور بے شمار تدبیروں کے جو چندہ وصول کرنے کے لیے انھوں نے وقتاً فوقتاً اختیار کیں ایک تدبیر نواب مختار الملک مرحوم کی خدمت میں اس تصویر کا بھیجنا تھا جس میں مسلمانوں کی حالت کو ایک تباہ شدہ جہاز کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا اور مدرستہ العلوم کو ایک کشتی کی شکل میں دکھایا تھا جو جہاز والوں کو اُس تباہی سے نکالنے کے لیے جہاز کی طرف آ رہی تھی۔ اس تصویر کی مفصل کیفیت پہلے حصہ میں بیان ہو چکی ہے، یہاں صرف یہ جتانا ہے کہ سر سید کا ذہن کیونکر اس خیال کی طرف منتقل ہوا؟ انھیں دنوں میں یہاں

---

[1] یہ وہ مشہور اور نامور لیگل ممبر کونسل قانونی وائسرائے کشور ہند ہیں جو ۲۰ برس کونسل ہند میں اول سکرٹری اور پھر قانونی ممبر رہا۔ انگلو انڈین کوڈ ۱۸۸۳ء میں اُن کا یہ فقرہ درج ہے کہ "مجھکو استعمات سے زیادہ ذریعے ہائی کورٹ کے ججوں سے فیصلے ہوئے ہیں جو انڈین لا رپورٹ میں ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۶ء تک چھپے ہیں، یہ ایسے فیصلے ہیں جو اہل ہند کے رسوم و خیالات ہی پر روشنی نہیں ڈالتے بلکہ ہوا؟ اگر میرا یہ کہنا گستاخی نہ ہو اپنے لا محل استدلال اور علمیت کے لحاظ قابل تعریف ہیں۔ اور ان میں سے کسی فیصلہ کے پڑھنے سے بہ نسبت اُن فیصلوں کے زیادہ لطف اور زیادہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو موتوسامی ایار ہندو اور سید محمود مسلمان کے ہیں۔ جن قوموں میں ایسے مقنن پیدا ہوئے ہوں اُن کیلیے کوئی قانونی اصول ایسا باریک اور دقیق نہیں ہو سکتا جو اُن کو دشوار معلوم ہو اور کوئی طریقہ عمل درآمد قانونی ایسا پیچیدہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کے فہم سے باہر ہو ۱۲۔

مدرستہ العلوم پر ایک نظم لکھی گئی تھی جس میں ایک یہ شعر بھی تھا:

دور سے امید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے
ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے

ظاہرا سر سید کو اس تصویر کے بنوانے کا خیال اسی شعر کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا کیونکہ یہ نظم اس تصویر کے بھیجنے سے پہلے شائع ہو چکی تھی مگر شاعر کا خیال ایک عقیم اور غیر منتج خیال تھا جس میں اس سے زیادہ کوئی کرشمہ نہ تھا کہ ایک معقول شے (یعنی تعلیم) کو ایک محسوس چیز (یعنی سفینۂ نجات) کے ساتھ تشبیہ دی گئی تھی لیکن جو مضمون سر سید نے اس سے استنباط کیا اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے، نواب مختار الملک کے دل میں جن کو اُس وقت تک قومی معاملات سے چنداں دلچسپی نہ تھی، کالج کی محبت کا بیج بو یا گیا جو رفتہ رفتہ ایک گھنا اور سرسبز اور سایہ دار درخت بن گیا۔

اسی قسم کی دوسری مثال وہ بکس تھا جس میں سر جان اسٹریچی کو ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت کالج کمیٹی کی طرف سے ایڈریس دیا گیا تھا اور جس کو سر سید نے خاص اپنی تجویز سے بنوایا تھا۔ اس بکس پر ان جانوروں کی تصویریں کھدوائی گئی تھیں جن کے نام پر زمانۂ جاہلیت میں عرب کے نام رکھے جاتے تھے اور اس لیے عرب کے بہت سے قبیلے انھیں ناموں سے مشہور تھے، جیسے قرش یا قریش (وہیل مچھلی) ثعلب (لومڑی)، کلب (کتا)، جمل (اونٹ)، اسد (شیر)، ذئب (بھیڑیا)، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان سب تصویروں کے منہ سے بجائے سانس کے ایک ایک تار نکالا گیا تھا اور یہ سب تار ایک مقام پر جا کر منتہی ہوئے تھے جہاں انگریزی الفاظ میں یہ مطلب ادا کیا گیا تھا کہ "ہم سب قبیلے متفق اللفظ سر جان اسٹریچی کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتے ہیں" اور اس سے گویا تمام مسلمانوں

کی شکر گزاری کا اظہار مقصود تھا۔

اسی قبیل سے کھجور اور اونٹ کی تصویر ہے جو سب سے پہلے سرسید نے انگریزی خطبات احمدیہ کے ہر ایک خطبہ کے سرے پر ولایت میں چھپوائی تھی۔ اور جو عرب کی خصوصیات میں شمار ہونے کے سبب ایک علامت دین اسلام کی قرار دی گئی تھی۔ اس میں سے کھجور کی علامت ہم نے پچھلے دنوں میں ایک چینی کی تشتری پر بنی ہوئی دیکھی تھی جس سے خیال ہوتا تھا کہ شاید اسی کتاب کو دیکھ کر ولایت کے کسی کارخانہ دار نے یا مارک ان ظروف کے لیے اختیار کیا ہے جو ممالک عرب میں بھیجے جاتے ہیں۔ اور اسی قبیل کا وہ نشان ہے جس میں ہلال اور صلیب کو جو تاج قیصری میں بنی ہوئی ہے ایک جگہ جمع کر کے مدرسۃ العلوم کے کتبوں اور اس کے کتب خانہ کی کتابوں پر مثبت کیا گیا ہے اور جس سے اسلام اور کرسچینٹی کی مصالحت اور تاج قیصری کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار مقصود ہے

ایک اور مثال سرسید کے انتقال ذہنی کی سنہ نبوی کا بجائے سنہ ہجری کے قرار دینا اور تہذیب الاخلاق کا سال ماہ شوال سے شروع کرنا ہے۔ ظاہرا سرسید سے پہلے سنہ نبوی کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں گذرا۔ جس زمانہ میں کہ سرسید آئین اکبری کی تصحیح کرتے تھے اس میں ایک جگہ سنہ ہجری کی نسبت ابوالفضل کا یہ قول ان کی نظر سے گذرا تھا کہ "ازیں سنہ بوئے ناکامی مے آید" یعنی یہ سنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مہاجرین کی ان مصائب کو یاد دلاتا ہے جن کے سبب ان کو وطن مالوف چھوڑنا اور مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا پڑا۔ اس زمانہ میں سرسید نے ابوالفضل کے ان الفاظ سے بہت برا مانا تھا اور اس کے حاشیہ پر قائل کی نسبت لعنت یا اس کا کوئی مرادف لفظ لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ابوالفضل کے اسی بے ادب جملہ سے ان کے دل

میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تہذیب الاخلاق کا سال تاریخ بعثت سے شروع کیا جائے کیونکہ درحقیقت اسلام میں کوئی واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سراپا برکت کے برابر عظیم الشان نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ امید نہیں ہے کہ جو سنہ تیرہ سو برس تک مسلمانوں میں متداول رہا ہو اُس کی جگہ کوئی دوسرا سنہ قائم ہو سکے مگر اس نظر سے کہ سنہ نبوی تاریخ بعثت ختم المرسلین کو یاد دلاتا ہے اگر مسلمان کم سے کم ممبر اور اسماء الرجال کی کتابوں اور قومی میگزینوں وغیرہ میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ نبوی بھی لکھا کریں تو بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح سب سے پہلے سرسید ہی نے اُس غلطی کو محسوس کیا تھا جو سنہ فصلی اور سنہ عملی میں فرق نہ کرنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اور جیسا کہ ہم پہلے حصہ باب ۲ میں بیان کر چکے ہیں، تاریخ بجنور میں انھوں نے اُن مشکلات کو گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا جو اُس غلطی سے لازم آتی تھیں۔ اگرچہ وہ تاریخ ۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گئی تھی مگر ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء میں جو سرکلر گورنمنٹ نے اُس غلطی کے تدارک کے لیے جاری کیے اُن سے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اُسی تحقیقات کا نتیجہ تھا جو سرسید نے تاریخ بجنور میں درج کی تھی۔

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے اُن کے ذہن کی جودت اور بلند پروازی پائی جاتی ہے مگر یہاں بطور نمونہ کے اسی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اخلاق اور خصائل

سب سے زیادہ گراں وزن اور جامع الفاظ جو کسی کی تعریف میں لیے جا سکتے ہیں اس کے سوا خیال میں نہیں آتے کہ فلاں شخص اعلیٰ درجہ کا دل و دماغ رکھتا ہے۔ لیکن اکثر ان الفاظ کا استعمال اپنے محل پر نہیں ہوتا کیونکہ

لیاقت جو دماغ سے علاقہ رکھتی ہے اور نیکی جو دل سے علاقہ رکھتی ہے ، یہ دونوں اکثر ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ مگر سر سید میں جس طرح بعض دیگر متضاد لیاقتیں جمع تھیں اسی طرح اُس کو خدا تعالیٰ نے دل اور دماغ دونوں اعلیٰ درجہ کے عنایت کیے تھے ، یہاں تک کہ اُس کی نسبت یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس میں نیکی زیادہ ہے یا عقل۔ لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے اُس کی رایوں میں تو شاید خطا کی گنجائش ہو مگر اُس کے اخلاق رذائل سے بالکل پاک معلوم ہوتے تھے اسی لیے مسٹر بک نے اُس کے مرنے کے بعد اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ "گو اُس کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اس کے اخلاق اُن سے بھی بڑے تھے۔"

ایک حکیم کا قول ہے کہ "جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات میں منصف ہو، بات کا پکّا ہو، ماتحتوں پر مہربان ہو، محنتی ہو، صاحب استقلال ہو، اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مستعد ہو وہ شریف ہے۔" اس تعریف میں اگر فیاضی کی صفت اور بڑھادی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سر سید کے حق میں جامع و مانع ہوگی۔ جو اعتبار کہ یہ شخص محض اپنی اخلاقی طاقت سے ہزاروں غیر شخصوں کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جس قدر اس کے دوست اور ملنے والے تھے سب اُس کے مدّاح اور ثنا خواں تھے، سب اُس سے محبت رکھتے تھے، سب کو اس پر اعتبار تھا اور سب کو اس کا دنیا سے اٹھ جانا ایسا ہی شاق گزرا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبروں کو اپنے مربّی اور سرپرست کا مر جانا شاق گزرتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی شخص کے حسنِ اخلاق کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑی دلیل اُس کی اخلاقی عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اُس کو اپنے مقاصد میں

ہوئی کیونکہ لیاقتیں کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوں جب تک اُن کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے اخلاق نہ ہوں کچھ کام نہیں آسکتیں۔

اُس نے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کے پبلک لائف میں بسر کیے جن میں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گزرے کہ ایک زمانہ اُس کی عیب جوئی کی گھات میں رہا اور دوست اور دشمن سب کو اُس کے اونے ادنے کام دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے اور مدرسہ کی اعانت منقطع ہوجائے باوجود اس کے کسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اُس کے کیرکٹر پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اُس کے چال چلن میں کوئی رخنہ نکالتا سوائے اس کے کہ اُس کو کافر و ملحد و نیچری و کرسٹان کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا اور اُس پر وہ الزام لگائے گئے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہ تھا کسی سے کچھ بن نہ آیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔ رباعی

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ   کافر کہا واعظ نے انھیں اور گمراہ

جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت   لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اگرچہ انسان کے اخلاق کی تھاہ دریافت کرنی نہایت مشکل ہے مگر معاملات کی کسوٹی اور مخالفوں کی چھان بین ایسے دو معیار ہیں کہ سچ کو جھوٹ سے اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کیے بغیر نہیں رہتے اگر سرسید کی سچائی میں رائی برابر بھی فرق پایا جاتا تو مخالف اُس کو پربت بنا دیتے مگر چند صریح تہمتوں کے سوا اُس کا دامن اخیر دم تک ہر ایک داغ اور دھبے سے پاک رہا۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک نے ٹھیک لکھا تھا کہ "علم بالانساب اگرچہ علم مظنون ہے مگر اس شخص کے بارے میں تو اُس کے افعال اُس کے نسب کی تصدیق کرتے ہیں۔"

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ سرسید میں جہاں بہت سی

خوبیاں تھیں انھیں کے ساتھ کچھ کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں مگر جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے وہ اُن عیوب سے جو انسان کی خساست اور دناءت پر دلالت کرتے ہیں یقیناً پاک تھا۔ اُس کے اخلاق کا اُس کے ہمنشینوں اور جلیسوں پر اثر پڑتا تھا۔ اس کو دیکھ کر قومی خدمات کا جوش دلوں میں پیدا ہوتا تھا۔ اُس کی جفاکشی اور مستعدی اوروں کو جفاکش اور مستعد بناتی تھی، اس کی سچائی اور ہمت اور استقلال عمدہ ترین ناصح تھے جو اس کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ اپنے ہائی کیرکٹر سے قوم میں عمدہ اخلاق کا بیج بو گیا ہے۔

اگرچہ سرسید کی زندگی کے واقعات سے جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں، اُن کے اخلاق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے مگر یہاں ہم اُن خاص خصلتوں کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کو اُن کی کامیابی میں بہت بڑا دخل معلوم ہوتا ہے اور جو اُن کے تمام افعال و حرکات و سکنات میں ایسی نمایاں تھیں کہ اُن سے شاید ہی اُن کا کوئی دوست اور ملنے والا انکار کر سکے۔

راستبازی

اولاً راستبازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راستباز آدمی میں ہونے ضرور ہیں جیسے صدق مودت، حمیت، دلیری اور آزادی وغیرہ اس شخص کی خصوصیات میں سے تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو ضرور شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی" اس قول کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھ کر ہوتی تھی شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اُس نے محض اپنی

راستبازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اُس کے کہنے میں کبھی تامّل نہیں کیا جس بات پر دل سے یقین کر لیا اُس کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اس کے کہنے اور کرنے میں کسی کی مخالفت کی کچھ پروا نہیں کی۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہاں تک کہ اُن کی طبیعت اور جبلت کا اندازہ ہو سکتا تھا یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنے کانشنس کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔

وہ جب کوئی بات کسی اپنے دوست سے سچائی کے خلاف سرزد ہوتی دیکھتے تھے تو اُن کو نہایت رنج ہوتا تھا اور اکثر وہ اس کو متنبہ کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اُن کا ایک دوست جو اخبار کا اڈیٹر تھا، اس کے اخبار میں چند خط ایک عورت کے نام سے چھپے تھے۔ جب وہ پرچہ سرسید کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اس کو لکھا کہ "کیا آپ کو یقین دلی ہے کہ وہ خط درحقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں! اگر ایسا یقین نہیں ہے تو کیا یہ کانشنس کے برخلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہیں سمجھتے اُس کو بطور سچ کے ظاہر کرو! میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹول کر جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو آپ کا دل اس کو سچ جانتا ہے یا نہیں! اگر نہیں جانتا اور اس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمانداری کے کام کیا۔ آپ مجھکو معاف کیجیے گا، یہ سبب اس کے کہ آپ سے محبت ہے یہ کڑوی نصیحت کی ہے۔"

جب اُن کے اڈیٹر دوست نے اس نصیحت کا شکریہ لکھا تو اس کا جواب انھوں نے اس طرح لکھا ہے "میں اس خیال سے کہ آپ میری

کسی تحریر کا بُرا نہ مانیں گے جو میرے دل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجہ پر ہوں اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے، ایسی ہی پرائیوٹ خطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے۔"

اُن کے ایک نہایت عزیز اور خالص دوست کو ایک زمانہ میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا تھا جو نماز پڑھنے پر تعرض کرتا تھا اور اس امر کی اطلاع انھوں نے سرسید کو بھی کی تھی۔ اُن کو اسی باب میں سید صاحب لکھتے ہیں" بھائی ... کل میں سارے دن متردد رہا کیونکہ تمھارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں، ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں۔ اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا۔ نہایت کچر پنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو با تو پہلے ہی خود اپنی شامتِ اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر بلبلانا، اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت

ہی دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں، کہنا واہیات تھا تراق ساقی استعفا دے دیتا تھا صاف کہدیتا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے سے مر جاتے نہایت اچھا ہوتا والسلام"

سرسید نے ایک موقع پر دلی کے ایک نہایت مقدس عالم سے جو اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو رفع یدین کی تاکید کرتے تھے مگر خود کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، کہا کہ "حضرت نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ باوجود مقتدائے دین ہونے کے صرف طعن و ملامت کے خوف سے جس بات کو دل سے حق جانتے ہیں اس کے موافق کبھی عمل نہیں کرتے۔ ہم ہزاروں گناہ کرتے ہیں اور دنیا کے مکروہات میں پھنسے ہوئے ہیں، مگر جو بات حق معلوم ہوتی ہے اس کے کرنے میں ایک لمحہ توقف نہیں کرتے اور لوگوں کے طعن و ملامت سے نہیں ڈرتے" سرسید کے کہنے کا ان کو ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے اسی روز جامع مسجد میں جا کر علی الاعلان رفع یدین کیا، لیکن معلوم نہیں کہ وہ ہمیشہ اس پر قائم رہے یا نہیں۔

اس شخص نے اگر سچ پوچھیے تو اپنی آزادانہ تحریروں سے اردو لٹریچر میں سچائی اور آزادی کی بنیاد ڈال دی۔ اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کے کہنے میں کسی کی طعن و ملامت سے نہ ڈریں۔ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے پہلے جو لوگ عام رائے کے خلاف کوئی بات کسی اخبار میں لکھنی چاہتے تھے اس میں کبھی اپنا نام ظاہر نہ کرتے تھے۔ اس نے تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے کی یہ شرط قرار دی کہ جو لوگ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا اور اپنا نام پبلک پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے ان کا کوئی مضمون اس میں درج نہ ہوگا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ لوگوں کی جھجک نکلنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ ہر شخص اپنے نام سے کھُلم کھُلا اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا اور بڑے بڑے لائق اور ذی علم اور

دین دار لوگ صد ہا مضمون عام رائے کے برخلاف اپنے نام سے شائع کرنے لگے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرسید نے جو قرآن کی تفسیر میں اکثر آیات کے معنی جمہور کے خلاف بیان کیے ہیں اس پر اُن کو خود یقین نہیں ہے بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن پر سائنس کی رو سے کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ یہ حال سرسید کو بھی معلوم ہوا، انھوں نے نہایت جوش میں آ کر کہا کہ "اگر دین اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام کو ترک کر دیتا" وہ سید مہدی علیخاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں۔ اگر خدا مجھکو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقیناً مذہب کو چھوڑ دیتا"

اُس نے اپنی راستی اور صاف گوئی سے صرف اُن مسلمانوں ہی کو مخالف نہیں بنایا جو پرانے خیالات رکھتے تھے اور جن سے کسی طرح موافقت کی اُمید نہ تھی بلکہ جو بات اُس کو حق معلوم ہوئی اس کے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی اس بات میں میرے ساتھ اتفاق کرنے والا ہے یا نہیں نیشنل کانگرس کے خلاف لکچر دینے سے پہلے تمام تعلیم یافتہ ہندو بنگالہ سے کشمیر تک سرسید کو ملک کا سچا خیر خواہ جانتے تھے، اُن کی نہایت تعریف کرتے تھے، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ اُن کی قدر کرتے تھے۔ اخباروں میں اُن کی نسبت مدحیہ ارٹیکل چھاپتے تھے، اپنی قومی مجلسوں کی طرف سے اُن کے سامنے ایڈریس پیش کرتے تھے۔ پبلک اسپیچوں میں اُن کا ذکر خیر کرتے تھے، سرسید کو معلوم تھا کہ اگر کانگرس کے خلاف ایک حرف بھی کہا تو کم سے کم تعلیم یافتہ ہندو قاطبۃً مخالف ہو جائیں گے۔ مگر جب اُن کو پختہ یقین ہو گیا کہ کانگرس کی اکثر خواہشیں ناممکن الوقوع اور خاصکر مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور مسلمانوں

کہ اس میں شریک ہونا پولیٹکل خطرات کا باعث ہوگا، انھوں نے نہایت زور شور سے مسلمانوں کو اس کی شرکت سے روکا اور کانگریشین گروہ کی ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا۔ بنگالیوں نے ان کو خود غرض اور اینگلو انڈینز کا خوشامدی اور ٹائم سرور سب کچھ کہا، صدہا آرٹیکل بنگالی اخباروں میں ان کے برخلاف چھپ گئے، کے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب جو حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند نے ان کو عنایت فرمایا اس کو بنگالیوں نے کانگرس کی مخالفت کرنے کا صلہ قرار دیا، مسٹر ہیوم جو سرسید کے دوست تھے وہ ان سے سخت بدگمان ہو گئے، بعضے ایجوکیٹیڈ مسلمان بھی ان کی طرف سے کھٹک گئے، مگر سرسید نے کسی بات کی کچھ پروا نہیں اور جہاں تک ممکن تھا مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے نہیں دیا۔

سرسید کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گزرتی تھی کہ ان پر راستبازی کے خلاف کوئی الزام لگایا جائے کیونکہ یہ شخص فی الواقع راستبازی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا۔ جس زمانہ میں وہ ولایت میں تھے انھوں نے ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر جو اس وقت یہاں جاری تھا، ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا تھا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر بہت کچھ نکتہ چینی کی تھی، ازانجملہ ایک دیہاتی مدرسہ کی نسبت جس کا انھوں نے ہندوستان میں خود معائنہ کیا تھا، یہ لکھا کر مکان مدرسہ میں گائے بندھی ہوئی تھی اور مدرس اور لڑکے سب غیر حاضر تھے۔ وہ جب ہندوستان میں پہنچا تو سر ولیم میور جو اس وقت شمالی مغربی اضلاع میں لفٹنٹ گورنر تھے، ان کی نظر سے بھی گزرا، چند روز بعد انھوں نے ایک پبلک اسپیچ میں کہا کہ "میں نے ضلع میں دورہ کرتے ہوئے کافی طمانیت حاصل کی ہے کہ تعلیم کی حالت عمدہ ہے اور اس محنت اور کوشش کے نشان ظاہر ہیں جو سید احمد خاں کے نتائج کے مخالف ہے۔"

یہ اسپیچ مع اردو ترجمہ کے اخبار میں چھپ کر ولایت پہنچی اور سرسید کی بھی نظر سے گزری۔ ترجمہ کے الفاظ سے وہ یہ سمجھے کہ سر ولیم میور نے مجھ پر دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے۔ اُن کو نہایت رنج ہوا اور جب ہندوستان میں واپس آئے تو الٰہ آباد میں ہز آنر سے مل کر نہیں گئے سیدھے بنارس چلے گئے۔ ہز آنر کے پرائیوٹ سکرٹری کی چٹھی سرسید کے نام بنارس میں پہنچی جس میں لکھا تھا کہ "نواب لفٹنٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے ہیں اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں۔"

سرسید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷۔ نومبر کی تھی۔ سر ولیم نے نویں نومبر کو اُس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے:-

"مائی ڈیر سید احمد! آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھکو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقع بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا۔ میں اُن نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں اب بھی اختلاف رکھتا ہوں مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا۔"

ؔ سرسید نے اپنے پمفلٹ میں ایک دیہاتی مدرسہ کے معائنہ سے جہاں گانٹے بندھی ہوئی اور مدرس اور طلبہ غیر حاضر تھے۔ یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدارس کی۔ یہ حالت ہے مگر سر ولیم میور اس نتیجہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے نہ یہ کہ جس گانو کے مدرسہ کا انھوں نے پمفلٹ میں حوالہ دیا تھا اُن کا وہ بیان غلط تھا ۱۲

"مجھکو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھکو براہ راست کیوں نہ لکھا، آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھکو اور بھی رنج ہوتا ہے، گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ مجھ پر نہ کیا جس کی میں آپ سے امید کرتا تھا اور شاید امید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔"

"مسٹر برملی نے اردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لمحہ بھی کسی اپنے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو، استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ چونکہ اس معاملہ کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اس کے شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔"

"کیپٹن لفنگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجۂ بالا خط کتابت کے حوالہ سے لکھیں گے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہوں گا۔"

سرسید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اُٹھ گیا۔"

کرنل گریہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "سر ولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اُس کو پھاڑ ڈال دیا اور مجھکو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی۔"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے

بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رُتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سرسید تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہ پر صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ اُن کی دلجوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لیے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا جیسی کہ سر ولیم کی تحریر سرسید کے نام تھی، نہایت سبک اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گزرا۔ جب سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا مکان بن کر تیار ہُوا تو صاحب ممدوح کو اس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اُن کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علیگڑھ کی طرف سے ایام غدر کے متعلق کچھ شبہات تھے، اس لیے وہ افتتاح کی رسم میں ان کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے سرسید سے کہا کہ "اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ خاں شریک ہوں گے تو ہم نہیں آنے کے" سرسید نے کہا: "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اس کا پریسیڈنٹ بھی ہے اس کو شریک نہ کیا جائے"۔ انھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ آخر مسٹر بریلی نے جو علیگڑھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسید کے دوست تھے بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا اور اُن کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی۔ سرسید کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ ان کے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک صاف جانتے تھے۔

جن یورپین افسروں نے ابتدا میں مدرسۃ العلوم کی مخالفت کی تھی یا اُس کے لیے سرکاری زمین ملنے میں مزاحم ہوئے تھے۔ سرسید نے اُن سے پرائیوٹ طور پر ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اور کبھی اُن کے ساتھ ظاہر داری کا برتاؤ نہیں کیا، یہاں تک کہ ہم نے سنا ہے کہ جب حضور سر جان اسٹریچی ہندوستان سے ولایت کو جانے لگے اور کالج کمیٹی علیگڑھ کی طرف سے اُن کو ایڈریس دینا قرار پایا تو جو مسودہ ایڈریس کا انعقاد جلسہ سے پہلے سرسید نے لکھ کر جناب ممدوح کے ملاحظہ کے لیے بھیجا تھا اُس میں جہاں کالج کے محسنوں کا شکریہ لکھا تھا اُن افسروں کی شکایت بھی صراحۃً یا کنایۃً لکھی تھی جو اس میں خلل انداز ہوئے تھے۔ اگرچہ جناب ممدوح کے ایما سے آخر کار وہ شکایت آمیز الفاظ سرسید کو مسودہ میں سے نکالنے پڑے مگر سرسید نے ہز آنر سے صاف صاف کہہ دیا کہ جس طرح ہم اپنے محسنوں کا احسان نہیں بھول سکتے اسی طرح نامہربان افسروں کی شکایت ہمارے دل سے فراموش نہیں ہو سکتی۔

سرسید نے یورپین ڈریس جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، محض انگریزوں کی تقلید سے اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ زیادہ تر اس کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا قومی لباس اُن کی ہم وطن قوموں سے مختلف ہونا چاہیے، اور چونکہ مصر و قسطنطنیہ و ایران اور اکثر ممالک اسلامیہ میں مسلمان ٹرکش ڈریس یا اُس کے قریب قریب پہنتے ہیں اس لیے انھوں نے خود ترکی لباس اختیار کر کے اپنی قوم کے لیے ایک مثال قائم کی تھی۔ باوجود اس کے کہ اُن کو اس فیشن کے سبب اکثر مواقع پر سخت مشکلات پیش آئیں مگر انھوں نے جو وضع مسلمانوں کے لیے مناسب سمجھ کر اختیار کی تھی اُس سے کبھی سر مو تجاوز نہیں کیا۔ دلی میں دربار قیصری کے موقع پر جب کہ حضور نظام کو کالج کمیٹی کی طرف سے سپاس نامہ

دیا گیا۔ سر سید اُس کو خود صرف اس وجہ سے پیش نہ کر سکے کہ وہاں جوتا اتار کر جانا ضروری تھا۔ چنانچہ کمیٹی کے اور ممبروں نے سپاس نامہ پیش کیا اور سر سید اُن کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ بنارس کے کمشنر مسٹر پی کارنیکل سے وہ جوتا پہنکر آنے کی شرط پر ملے، حالانکہ کمشنر موصوف جوتا اُتروائے بغیر کسی ہندوستانی کو اپنے بنگلے میں نہ آنے دیتے تھے۔ مسٹر واٹس جب تک علیگڑھ میں کلکٹر رہے ہم نے سنا ہے کہ سر سید کبھی اُن سے نہیں ملے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سید احمد خاں جوتا اتار کر اُن کے کمرے میں جائیں، مگر انھوں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ نواب کلب علیخاں مرحوم رئیس رامپور کے ہاں صرف چندے کی غرض سے وہ اُس وقت گئے تھے جبکہ مدرسہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں تھا اور امداد کی نہایت اشد ضرورت تھی۔ نواب صاحب کے دربار کا قرینہ یہ تھا کہ وہ خود ایک پلنگڑی پر بیٹھے رہتے تھے اور جو شخص ملنے جاتا تھا اُس کو فرش پر دو زانو بیٹھنا پڑتا تھا ہم نے سنا ہے کہ سر سید نے جب تک کرسی پر بیٹھنے اور جوتا پہننے کی اجازت حاصل نہیں کر لی وہاں جانے کا ارادہ نہیں کیا۔

سر سید جیسے خود راستباز تھے اسی طرح راستبازوں کی دل سے قدر کرتے تھے جس زمانہ میں وہ مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اُس وقت خان بہادر منشی غلام نبی خاں مرحوم رئیس سہرند وہاں نوکری کے امیدوار تھے پھر چند روز بعد وہ نائب سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہو گئے تھے۔ اُس وقت حسن اتفاق سے رہتک میں چند لائق اور ذی علم اہلکار سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں موجود تھے جن کی سر سید کے ہاں آمد و رفت تھی۔ خان بہادر نے اُن سے یہ خواہش کی کہ مجھے سید صاحب سے ملوا دو، انھوں نے کہا بہت اچھا مگر وہ لامذہب ہیں۔ یہ فقہاء کی اصطلاح سے ناواقف تھے انھوں نے یہ سمجھا

(حاشیہ آگے صفحہ پر)

سید صاحب قید اسلام سے آزاد ہیں۔ ایک دن سید صاحب اور دیگر اہل کار ایک جگہ جمع تھے نماز کا وقت آگیا، سب نے سید صاحب کو امام بنایا، منشی غلام نبی خاں چونکہ نہایت کھرے اور سچے آدمی تھے اُن کو تعجب ہوا کہ ان لوگوں نے ایک لامذہب (یعنی غیر مسلم) کو کس طرح امامت پہ کھڑا کر دیا۔ جونہی سرسید نے نیت باندھی اُنھوں نے الگ چادر بچھا کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ سرسید نے نماز ہی میں یہ معلوم کر کے نیت توڑ دی اور منشی صاحب سے کہا کہ آپ نماز پڑھائیے۔ انھوں نے کہا میں امامت کی لیاقت نہیں رکھتا، لیکن آپ اپنا مذہب مجھے بتلائیں، اس وقت اگر میرا دل ٹھکیگا تو میں خود آپ کا مقتدی بنوں گا ورنہ مجھے معاف فرمائیے گا۔ سید صاحب نے کہا میں شافعی مذہب رکھتا ہوں۔ منشی صاحب نے کہا تو بسم اللہ میں آپ کے پیچھے بڑی خوشی سے نماز پڑھوں گا۔ آخر سرسید ہی نے نماز پڑھائی۔

یہ واقعہ منشی صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور کہتے تھے کہ " اس موقع پر میری یہ صفائی دیکھ کر سید صاحب مجھ پر حد سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے باوجودیکہ میں اُس وقت اُن کے ایک ادنے ماتحت اہل کار کی حیثیت رکھتا تھا جس روز میں اُن کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا وہ بلا تکلف میرے مکان پر تشریف لے آتے تھے۔ حالانکہ اُن کی عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہ تھی باوجود اس کے انھوں نے گنتری صاحب جنٹ مجسٹریٹ رہتک سے ایک

لہ مذہب کا لفظ جو آج کل دین کے معنوں میں بولا جاتا ہے فقہا کی اصطلاح میں اس کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ وہ ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک امام کے طریقہ کو مذہب کہتے ہیں اور اسی لیے وہ لامذہب اُس کو کہتے ہیں جو کسی خاص امام کے طریقہ کا پابند نہ ہو ۱۲۔

نہایت نازک موقع پر میری سفارش کی، دوسری دفعہ جو وہ ایک مہینے کے لیے رہتک بدل کر گئے تو مکان علیحدہ کرایہ کو نہیں لیا بلکہ صرف اس نظر سے کہ وہاں کے لوگوں کی نگاہ میں میری وقعت زیادہ ہو، میرے ہی غریب خانہ پر آکر اُترے اور مہینے بھر تک وہاں قیام کیا۔ پہلی دفعہ جب وہ علیحدہ مکان میں رہتے تھے ایک روز میں سخت بیمار ہوگیا تھا جس سے پیشاب اور پاخانہ بند ہوگیا۔ مجھے نوکر ہوئے چند روز گزرے تھے اور میری تنخواہ صرف تیس روپیہ ماہوار تھی اور ایک آدمی کے سوا کوئی نوکر نہ تھا غرض کہ عجیب بے کسی کی حالت تھی، صدرامینی کے ناظر نے جو میرے مکان کے قریب رہتا تھا، میرے حال کی اطلاع پاکر سید صاحب کو رات کے نو بجے جا خبر کی تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ سید صاحب یونانی حکیم کو ساتھ لیے چلے آتے ہیں اور ہوسپٹل اسسٹنٹ کو جلیخانہ سے لانے کے لیے آدمی بھیج کر آتے ہیں تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آگیا مگر حکیم کو دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر ان کے علاج سے فائدہ نہ ہو تو مجھے پھر اطلاع دی جائے اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ اتفاق یہ کہ حکیم صاحب کے علاج سے کچھ نفع نہ ہوا، سید صاحب نے ڈاکٹر کو پھر بلایا اور رات کے دو بجے اُس نے آکر جلاب دیا، یہاں تک کہ صبح کی نماز کے وقت جاکر مجھے اجابت ہوئی اور میری تکلیف بالکل رفع ہوگئی۔ سید صاحب تمام رات میرے غریب خانہ پر جاگتے رہے اور جب مجھے افاقہ ہو گیا تو صبح کی نماز پڑھ کر اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ جس شفقت اور بزرگانہ عنایت کے ساتھ انھوں نے میری تیمارداری میں وہ رات بسر کی اُس کو میں تمام عمر فراموش نہ کروں گا۔"

منشی صاحب کہتے تھے کہ "دلی میں مولوی امام بخش صہبائی نے سید صاحب سے پوچھا کہ تم نے غلام نبی میں کیا بات دیکھی جو اُس پر اس قدر مہربان ہو، سید صاحب

نے کہا، کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے کہ جیسا میں سڑی ہوں ایسا ہی وہ سڑا ہے[1]

جس زمانہ میں کہ سرسید انگلستان میں تھے اور اُن کی آزادانہ تحریریں جو ہندوستان میں آکر بذریعہ سوسائٹی اخبار کے شائع ہوتی تھیں ان پر چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑتی تھی اُن دنوں میں مولوی سید مہدی علی خاں اُن کو برابر ممانعت کے خط بھیجتے تھے کہ ایسی تحریریں یہاں نہ بھیجنی چاہئیں۔ ایک دفعہ انھوں نے گردن مروڑی مرغی کا ذکر نہایت صفائی اور آزادی سے لکھ بھیجا جس پر یہاں بہت لے دے ہوئی اور مولوی صاحب ممدوح نے اپنے خط میں اُس تحریر پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ اس کے جواب میں سرسید نے اُن کو ایک لطیف تحریر بھیجی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جن سے آپ کو افسوس ہوا اُس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں، ہاتھ جوڑ کر ہندوستانی طور پر نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں، افسوس کہ مجھے ایسے الفاظ لکھنے نہ آئے جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجیے، جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے، میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کروگے۔ بھائی! کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں بُرا کروں اور اُس کو اس لیے چھپاؤں کہ لوگ بُرا نہ کہیں، ہم کو اپنے

---

[1] چونکہ سچا آدمی مصلحت اندیش نہیں ہوتا اور اپنے کھرے پن سے لوگوں کو اپنا مخالف بنا لیتا ہے اس لیے انھوں نے آپ کو اور منشی صاحب کو سڑی یعنی دیوانہ قرار دیا ۱۲۔

خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے، ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے، نہ زمین پر چھوڑے، نہ رات کو الگ ہو، نہ دن کو الگ ہو، نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈر کرتا! میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں، نہ روایت شاذہ سے۔ والیِ مصر کے ساتھ بعض علمائے مصر بھی تھے، سب انگریزوں کے ساتھ غیر ذبح کیے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے۔ بہرحال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا شاید میں غلطی پر ہوں۔ صرف معافی چاہتا ہوں۔"

محبت و صداقت

دوسرے محبت اور الفت کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ تھا اور اسی لیے اُن کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بہ درجہ غایت پایا جاتا ہے وہ اپنے ایک دوست کو ایک دوسرے دوست کی نسبت جس سے کچھ شکر رنجی ہوگئی ہے، لکھتے ہیں "وہ دوستی و محبت کے معاملات و برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔ کسی پر وہ عاشق نہیں ہوئے، کسی سے انھوں نے دل نہیں لگایا، اُن کو مزا دوستی اور محبت کا مطلق معلوم نہیں۔ سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا، نہ وہ نہ خدا کی دوستی کا مزا جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ محبت کے لائق ہے۔"

ایک اور خط میں جو سید مہدی علی کا مضمون گردن مروڑی مرغی کے

برخلاف اخبار میں دیکھ کر اُن کو لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں "آپ نے جو کچھ میرے مُردار مرغی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا آپ یقین کیجیے کہ اُس نے عجیب مجھ کو دیا ہے، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی دولتِ عشقِ مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے یا نہیں؛ کیونکہ بغیر اُس کے آدمی میں اور مٹی میں کچھ فرق نہیں ہے۔"

کنبے کی محبت

انسان کی محبت سب سے پہلے اپنے کنبے کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے جو کہ ایک نیچرل تعلق ہے۔ کسی کا قول ہے کہ "جس کے دل میں اپنے کنبے کی محبت نہیں اُس کو کسی سے بھی محبت نہیں۔" سرسید کو ہمیشہ اپنے کنبے کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ بھائی کی موت کا صدمہ اُن کو بیس برس تک نہیں بھولا سُنا ہے کہ اُن کے عزیز اُن کے سامنے بھائی کا ذکر اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اُن کا داغ تازہ ہوجائے گا۔ بہت مدت کے بعد اُن کی بھتیجی کے منہ سے باپ کا کچھ ذکر نکل گیا تھا، سرسید کی حالت ایسی متغیر ہوگئی کہ گویا آج ہی بھائی کا انتقال ہوا ہے۔

بھائی کے مرنے کے بعد انھوں نے صغیرسن بھتیجے کو اس طرح پرورش کیا جیسے مائیں اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہیں۔ باوجودیکہ بھابی زندہ تھیں بھتیجے کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا، سفر و حضر میں، ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا، مدتوں اپنے ساتھ ایک پلنگ پر سُلایا اور ہر طرح سے اُس کی دل داری اور دلجوئی کی۔ غدر میں جب سارا کنبا دلی میں تھا اور آپ بجنور میں تھے اُس وقت بھی بھتیجا اُن کی جان کے ساتھ تھا۔

جب سرسید کی بی بی کا انتقال ہوا، اُس وقت اُن کی عمر کچھ اوپر چالیس برس

کی تھی اور تین صغیر سن بچے جن کی پرورش اور رکھ رکھاؤ اکیلے باپ سے ہونا سخت دشوار تھا، موجود تھے، ہر چند دوستوں نے سمجھایا کہ دوسری شادی کر لو تاکہ اپنی زندگی بھی آسایش سے گزرے اور بچوں کی پرورش میں بھی آسانی ہو، مگر محبت اور وفاداری نے ہرگز اجازت نہ دی۔ اُن کے ایک دوست کا بیان ہے کہ "میں اُن کو ہمیشہ دوسرے نکاح کی ترغیب دیا کرتا تھا، وہ ہنس کر ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ ایک دن وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے، میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا۔ انھوں نے دردناک لہجہ میں کہا کہ "محمود کی ماں[1] کہاں سے آوے گی؟" پھر میں نے یہ ذکر کرنا چھوڑ دیا۔"

جب وہ انگلستان گئے تو وطن سے بیٹی کی سخت بیماری کا تار پہنچا۔ انھوں نے فوراً وہاں سے تار دیا کہ اگر ہمارے پہنچنے تک اُس کے بچنے کی امید ہو تو ہم واپس ہندوستان آنے کو تیار ہیں مگر دوسرا تار اُس کے مرنے کا پہنچا جس سے اُن کو ایسا سخت صدمہ ہوا کہ جب تک ولایت میں رہے غمگین اور افسردہ خاطر رہے اور جب ولایت سے واپس آئے تو دلّی جانے کو ہرگز جی نہ چاہتا تھا، باوجودیکہ اُن دنوں میں دیوانی کی بڑی تعطیل تھی، صرف ایک دو روز دلّی میں ٹھیرے اور ساری تعطیل علیگڑھ، مرزا پور اور بنارس میں بسر کی۔

---

[1] سرسید کی بی بی جیسا کہ معتبر ذریعوں سے سنا گیا ہے، فی الواقع ایسی نیک سرشت اور لائق بیوی تھی جس کے بعد سرسید کا دوسرا نکاح کرنا بہ نسبت نہ کرنے کے زیادہ تعجب انگیز ہوتا۔ وہ بھی اسی خاندان کی نواسی تھی جس کے سرسید نواسے تھے اور اس لیے نیک دلی اور عالی حوصلگی دونوں میاں بیوی میں یکساں پائی جاتی تھی۔ سرسید کے بعض احباب کا بیان ہے کہ اگر کبھی سرسید کی غیبت میں اُن کے مکان پر جانا ہو گیا ہے تو ہماری ویسی ہی مدارات ہوئی جیسی اُن کی موجودگی میں ہوتی تھی۔ ہم کو بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سید صاحب خود مکان پر موجود ہیں ۱۲۔

اپنی والدہ کے ساتھ جیسی اُن کو وابستگی تھی ایسی بہت ہی کم سُنی گئی ہے اور جیسی کہ وہ جوانی میں ماں کی اطاعت کرتے تھے اور اُن کے غصہ اور خفگی کی برداشت کرتے تھے اس طرح بچے بھی اپنے ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھکو ماں کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہُوا جتنا کہ بھائی کے مرنے کا ہُوا تھا، کیونکہ غدر کے مصائب کا زمانہ تھا اور ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو میں پہلے مرجاؤں اور میرے بعد والدہ کی زندگی تلخی اور سختی میں گزرے۔ انھوں نے مرنے سے چند سال پہلے میرٹھ میں جہاں اُن کی والدہ مدفون ہیں، ایک پبلک اسپیچ میں اپنی ماں کا ذکر کیا۔ معاً اُن کا دل بھر آیا اور اس بڑھاپے میں اُن کو ماں کے ذکر پر روتا دیکھ کر لوگ متعجب ہو گئے بھائی کے نواسوں کی نہایت شفقت کے ساتھ انھوں نے سرپرستی کی اور اُن کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی اپنے خالہ زاد بھائی کے نواسوں کو انھوں نے بالکل اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا اور جب تک وہ انگلستان نہیں گئے اُن کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

وطن کی محبت

اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو عموماً الفت اور موانست ہوتی ہے خصوصاً ایسے وطن کے ساتھ جیسے کہ دلّی ہے جہاں پر ولیسی بھی آکر زمین پکڑ لیتے ہیں، مگر سرسید کی محبت اپنے وطن کے ساتھ عجیب طرح کی تھی، ایک زمانہ تو وہ تھا کہ اُن کو دلّی کی منصفی سے دوسری جگہ ترقی پر بھیجتے تھے اور وہ وہاں سے ہرگز نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو وہ زمانہ تھا کہ دلّی میں چند خاندان نام و نمود کے باقی تھے اور ہر قسم کے اہل کمال اور اہل ہنر زمانہ کی بساط کے موافق وہاں موجود تھے۔ قلعہ کا چراغ اگرچہ ٹمٹما رہا تھا مگر گل نہ ہُوا تھا، سرسید کو جو زندہ دل سوسائٹی

وہاں میسر تھی دوسری جگہ اس کے ملنے کی امید نہ تھی۔ مگر غدر کے بعد جب وہاں کے مسلمان بالکل مٹ گئے اور دلّی ایک قالب بے روح رہ گئی اب اُس حُبّ وطن کا یہ تقاضا ہوا کہ جن آنکھوں سے اُس کی بہار دیکھی تھی انھیں آنکھوں سے اُس کی خزاں کیونکر دیکھی جائے۔ گو بظاہر سرسید نے دلّی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی تھی مگر آدم کو بہشت چھوڑنے کا بھی اتنا ہی افسوس ہُوا ہوگا جتنا کہ سرسید کو دلّی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ اُن کے آرٹیکلوں میں یا اسپیچوں اور لکچروں میں یا پرائیوٹ خطوں میں جہاں کہیں دلّی کا ذکر آگیا ہے اُن کا دل اُمڈے بغیر نہیں رہا

وہ اپنی کتاب راہ سنت پر ریمارک کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ باتیں تو اِن صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں کجا وہ صحبتیں، کجا وہ مجلسیں، کہاں وہ آزردہ، کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علما و صلحا، صرف یاد ہی یاد ہے۔"

ایک اور آرٹیکل میں جہاں اُردو اخباروں کا ذکر کیا ہے وہ یوں لکھتے ہیں "اس اُجڑے شہر کے اخباروں کا بھی جس کا نام لیتے دل بھر آتا ہے، ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔۔۔۔ ہمارے وطن کے اخبار ہم سے اس لیے ناراض ہیں کہ مدرستہ العلوم دہلی میں کیوں نہ مقرر ہُوا! بھائی! کہاں ہے وہ دلّی اور کہاں ہیں وہ دلّی والے! جو نقش کہ مٹ گیا اُس کا اب کیا نام لینا ہے، مرثیہ پڑھا کرو اور دلّی والوں کو رویا کرو۔"

جس زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دلّی میں تجویز ہو رہا تھا اُنھوں نے اپنے ایک دوست کو یہ لکھا تھا کہ "آپ کی سب کوششیں اور تدبیریں اور خیالات بے سود ثابت ہوں گے، نہ دہلی میں کوئی انتظام کرنے والا ہے اور نہ دہلی اس لائق رہی ہے۔ وہاں کے مسلمانوں پر، مسلمانوں کے گھروں پر، مسلمانوں کے

گھروں پر، مسلمانوں کے محلوں پر اب تک نحوست برستی ہے، اُن کی طبیعت ان کے اخلاق، راہ و رسم، سوشل حالت ایسی تبدیل ہو گئی ہے کہ جب کبھی دلّی جاتا ہوں اور کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو اُس کی باتیں سن کر متعجب ہوتا ہوں کہ یہ لوگ کس ملک اور کس دیس کے رہنے والے ہیں! خدا نے دلی سے سب کچھ چھین لیا۔ ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔

سرسید کی طبیعت میں ایک خاص صفت تھی جو بڑے بڑے کاموں کا بوجھ اٹھانے والوں میں ہونی نہایت ضروری ہے۔ وہ دل بجھانے وال اور ہمت توڑنے وال تقریبوں سے ہمیشہ دور دور اور الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے اگر ایسا نہ کرتے تو جس قدر قومی اور ملکی اور مذہبی خدمات انھوں نے انجام دی ہیں اس کا عشر عشیر بھی اُن سے سرانجام نہ ہو سکتا، سید حامد مرحوم کے انتقال کا صدمہ اُن پر نہایت سخت ہوا تھا، دو وقت انھوں نے بالکل کھانا نہیں کھایا اور پندرہ بیس روز تک اُن کی حالت نہایت نازک رہی، مگر جس وقت بیٹے کا دم نکلا اور گھر میں کہرام مچا وہ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ کے مکان پر چلے گئے اور جب تک لوگ اُن کو دفن کر کے نہ آئے وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر جو اس روز سے علیگڑھ گئے ایک آدھ بار سے زیادہ پھر کبھی جا کر گھر کی صورت نہیں دیکھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے دلّی کا غم بھلانے کے لیے دلّی کی بود و باش ہی ہمیشہ کے لیے ترک کر دی تھی۔ اُن کے بعض ہموطن کہتے ہیں کہ اگر دلّی سے کچھ اُنس ہوتا تو وہ دلّی چھوڑ کر علیگڑھ میں مدرستہ العلوم قائم نہ کرتے، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ اگر بنی امیہ کو بغداد سے اُنس ہوتا تو وہ اُندلس میں جا کر اپنی سلطنت قائم نہ کرتے۔ دلّی جو سیکڑوں برس مسلمانوں کا دارالحکومت رہا اور اسی لیے پُرانے خیالات اور قومی و مذہبی تعصبات کا مرکز تھا وہاں سرسید کے منصوبوں

کا پورا ہونا بلا تشبیہ ایسا ہی مشکل تھا جیسا مکہ میں اسلام کا نشو و نما پانا۔

اگر غور کر کے دیکھا جائے تو سرسید کے دل میں قوم کی بھلائی کا خیال اور قومی ہمدردی کا جوش زیادہ تر دلّی ہی کی تباہی اور بربادی نے پیدا کیا، فتح دہلی کے بعد جس وقت وہ میرٹھ سے اپنی ماں اور خالہ کی خبر لینے کو دلّی میں پہنچے انھوں نے تمام شہر کو بالکل ویران پایا۔ یہاں تک کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے، پیاسوں کے لیے پانی کی ضرورت ہوئی تو ایک صراحی پانی کے لیے اُن کو خود قلعہ میں جانا پڑا، جس دوست یا عزیز کا حال دریافت کیا اُس کو مقتول سنا یا مفقود، جس قلعہ میں سلاطین کے عیش و عشرت کے سامان دیکھے تھے اُس کے در و دیوار سے اُن کو خون کی بو آتے دیکھی۔ اگرچہ اُس وقت ہزاروں ایسے بھی تھے جو مرگ انبوہ کو جشن سمجھتے تھے مگر سرسید جیسے ذکی الحس آدمی کے لیے یہ انقلاب ایک تازیانہ تھا، دلّی کا وہ سناٹا دیکھ کر ایک ایسی چوٹ اُن کے دل پر لگی جو رفتہ رفتہ زخم اور آخر کار ناسور بن گئی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا خیال بھی اگر سچ پوچھیے تو دلّی ہی کی حالت دیکھ کر اُن کے دل میں پیدا ہوا۔ غدر سے پہلے جیسے دلّی کے لوگ دنیا کے حالات سے بے خبر تھے ایسے شاید ہی کسی دوسری جگہ کے لوگ ہوں۔ سرسید کہتے تھے کہ "ایک دفعہ جو میں رہتک سے کسی تعطیل میں دلی آیا تو وہاں کے ایک معزز آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں گئے تھے؟ اور جب میں نے رہتک کا نام لیا تو انھوں نے تعجب سے کہا کہ کیا رہتک بھی انگریزوں کی عملداری میں ہے؟ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "دلی کے اکثر پڑھے لکھے آدمی ہر ایک مجسٹریٹ کو مٹکاف کہتے تھے کیونکہ پہلے مجسٹریٹ کا نام مٹکاف تھا۔"

دوستوں کے ساتھ برتاؤ

جو برتاؤ سرسید کا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانہ کے دوستوں سے بالکل نرالا تھا، جہاں تک اُن کا حال دیکھا گیا اُن کی خوشی بلکہ اُن کی زندگی کا مدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا، کام اور دوستوں کی ملاقات، اُن کو شاید ہی کبھی ایسی خوشی ہوتی ہو جیسی اپنے خالص و مخلص دوستوں سے مل کر ہوتی تھی وہ فی الواقع دوستوں کو زندگانی کا ایک عنصر سمجھتے تھے۔ اُن کا اس مقولہ پر پورا پورا عمل تھا کہ "اگر ساری دنیا قبضہ میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اور اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے۔" باوجودیکہ دن بھر میں اُن کا کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ کام سے خالی نہ ہوتا تھا اور ایسے شخص کو تنہائی زیادہ پسند ہونی چاہیے بایں ہمہ دوستوں سے کبھی اُن کا جی نہ اکتاتا تھا۔ ابتدائی ملاقات میں وہ بہت روکھے پھیکے معلوم ہوتے تھے، ناواقف آدمی اُن کو پہلی ہی بار دیکھ کر نہایت عبوس اور خشک مزاج سمجھتا تھا مگر جس قدر اُن سے زیادہ ربط بڑھتا جاتا تھا اسی قدر اس مقولہ کی تصدیق ہوتی جاتی تھی کہ "الرَّغْبَةُ الی الکَرِیمِ تُخَالِطُکَ وَتُقَرِّبُكَ مِنْهُ وَتَرْفَعُ وَتُبْعِدُ الْحِشْمَةَ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ"[1] کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ "میں اس کو (یعنی سرسید کو) ایک چوتھائی صدی سے جانتا ہوں، میرا اور اُن کا تعلق بمنزلہ ایک رشتہ دار کے ہے نہ کہ بطور ایک دوست کے، جتنی زیادہ اُن کی میری واقفیت بڑھتی گئی اسی قدر اُن کی قدر و منزلت میرے دل میں زیادہ ہوتی گئی۔"

سرسید اپنا دشمن تو شاید ہی کسی کو سمجھتے ہوں مگر جن کو وہ اپنا دوست جانتے تھے وہ بھی تعداد میں کچھ کم نہ تھے۔ قوم کی عام خیر خواہی نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کے

---

[1] یعنی کریم النفس آدمی کی طرف جس قدر جھکو گے اُس سے زیادہ میل جول بڑھے گا اور مغائرت دور ہوتی جائے گی۔ ۱۲

دل میں اُن کی جگہ کر دی تھی۔ انھیں میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کی دوستی یارانہ کے درجہ تک پہنچ گئی تھی، وہ اپنی اور اُن کی چیز میں کچھ فرق نہ سمجھتے تھے۔

سرسید کا گھر ان کا ہوٹل یا سرائے تھا اور اُن کا دل سرسید کی مٹھی میں تھا وہ جب اور جس قدر چاہتے اُن کے نام بغیر پوچھے چندہ لکھ دیتے تھے اور اُن کو طوعاً یا کرہاً قبول کرنا پڑتا تھا۔

دوستی کے متعلق ایک کتاب میں یہ حکایت لکھی ہے کہ "ایک روز امام محمد باقر نے اصحاب سے کہا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہے کہ دوست کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جس قدر نقدی کی ضرورت ہو اس میں سے نکال لے؛ سب نے عرض کیا " لا واللّٰہ یا ابن رسول اللّٰہ " آپ نے فرمایا "بس تو تم میں کوئی دوستی کے لائق نہیں ہے۔" مگر سرسید کا حال اپنے دوستوں کے ساتھ اور اُن کے دوستوں کا حال سرسید کے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا کہ ایک دوسرے کی جیب سے جو چاہتے نکال سکتے تھے۔

سرسید کے دوستوں میں سے اُن کے ایک نہایت عزیز دوست خرچ میں کبھی اعتدال اور میانہ روی سے تجاوز نہیں کرتے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سرسید نے اُن سے چندہ مانگا ہو اور اُنھوں نے انکار کیا ہو۔ وہ اپنی جبلی عادت کے موافق بطور ظرافت کے کہا کرتے ہیں کہ قومی ہمدردی تو ہم کو معلوم نہیں کس چیز کو کہتے ہیں ہاں مگر سید احمد خاں کی زبان میں ضرور جادو تھا کہ جہاں روپیہ دو روپیہ دینا مشکل معلوم ہوتا تھا وہاں اُن کے ایک اشارے پر آنکھ بند کر کے سیکڑوں پر جیا نے تھے۔

سرسید ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ اس طرح پر متواتر امداد کی درخواست کرنے سے شرم آتی ہے مگر ہمارے دوستوں کی فیاضی ہم کو شرمندہ نہیں ہونے

وہی۔ ہم نے بھی اس مقولہ پر عمل کرنا اختیار کر لیا ہے کہ "خاصۂ دوستانہ بردب ود بہ دشمناں مکوب" جس امر کی ضرورت ہوتی ہے دوستوں ہی سے سوال کرتے ہیں اور کچھ شرم نہیں کرتے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر دوستوں ہی سے نہ مانگیں تو کس سے مانگیں! لیکن اُن کا شکریہ ہم پر واجب ہے ایک دوست پر کالج کے کسی فنڈ کا چندہ کسی قدر باقی تھا، ہم نے اُن سے کہا کہ تھوڑا سا روپیہ رہ گیا ہے اس کو بیباق کر دو، انھوں نے کہا بیباقی کا تو آپ نام نہ لیجیے، جب تک زندگی ہے بیباقی تو نہ ہوگی، آج اس چندہ کی باقی ہے کل دوسرے چندہ کی، اسی طرح باقی دار مر جاؤں گا، پس بیباقی تو نہ ہوئی ہے نہ ہو گی۔ مگر جس قدر روپیہ چاہو لے لو۔"

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ "درحقیقت یہی حال ہے، کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لیے چندہ نہ مانگتے ہوں، مگر ہمارے دوست بھی ہمارے اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کریں۔

"گر مکرر زلبت بوسہ گرفتیم مرنج
سرخیِ لعلِ لبت ہیں کہ چہ زیبا بود دست"

انھیں دوستوں میں سے بعض کے ساتھ نہایت بے تکلفی تھی، وہ جو کچھ چاہتے تھے سرسید کو کہہ بیٹھتے تھے، اُن پر رد و قدح و اعتراض کرتے تھے، اُن کے مذہبی خیالات اور رایوں پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، ان سے ہر قسم کی ہنسی اور چہل کی باتیں ہوتی تھیں، وہ ہمیشہ سرسید کی جھڑکیاں کھاتے تھے اور خفگیاں سہتے تھے مگر نہ کبھی سرسید کو اُن سے ملال ہوتا تھا اور نہ اُن کی خفگی یا جھڑکی کا بُرا مانتے تھے۔ اُن کے حسب حال یہ شعر تھا

"تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب!
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد"

جب کسی دوست کی طرف سے کوئی ایسی بات ظہور میں آتی تھی جس سے مغائرت
کا خیال پیدا ہوتا ہو تو اُن کو یہ امر نہایت شاق گزرتا تھا۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم
کا بیان ہے کہ "میں رہتک سے میرٹھ جاتا تھا، جب دلّی پہنچا تو ایک دوست
کے مکان پر ٹھیرتا ہوا، وہاں میں نے سنا کہ سید صاحب بجنور سے آئے ہوئے
ہیں، میں اُن کی خدمت میں پہنچا، انھوں نے فوراً میرا اسباب فرودگاہ سے منگوا
لیا اور فرمایا کہ پانچ چار روز تم کو یہاں ٹھیرنا پڑے گا، پھر ہم تم یہاں سے ساتھ
چلیں گے، میں ٹھیر گیا، انھوں نے شہر کے مشاہیر سے مجھ کو ملوایا، اتفاق سے
محمد بخش خاں صدر الصدور میرٹھ بھی وہاں آئے ہوئے تھے، انھوں نے
سید صاحب کو لکھا کہ میرٹھ تک مجھے بھی اپنی گاڑی میں شریک کر لینا، سید
صاحب نے اُن کو لکھ بھیجا کہ میری گاڑی میں منشی غلام نبی شریک ہیں اس لیے
آپ کی گنجائش نہیں۔ مجھے شرکت کے لفظ سے یہ خیال گزرا کہ نصف کرایہ
گاڑی کا مجھے دینا پڑے گا، غرض کہ میں سید صاحب کے ساتھ دلّی سے میرٹھ
کو روانہ ہوا، راہ میں اپنی نالایقی سے میں نے نصف کرایہ سید صاحب کے سامنے
پیش کیا۔ انھوں نے نہایت غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا اور بہت
دیر تک خاموش بیٹھے رہے مجھے اپنی اس کمینہ حرکت سے ایسا انفعال ہوا کہ
بیان نہیں ہو سکتا، آخر مجھ کو معافی مانگنی پڑی اور پھر کرایہ کے باب میں اُن کے
سامنے دم نہیں مارا" اسی طرح انھوں نے ایک دوست کو کسی قدر روپیہ
کا چک بھیجا مگر اُس نے واپس کر دیا اور لکھا کہ میں یہ روپیہ نہ لوں گا اس کے لیے
مجھ سے بہتر مصرف موجود ہیں۔ سر سید نے اُس کا جواب لکھا کہ "آپ کا عنایت
نامہ پہنچا جس میں چک مرسلہ کا ذکر تھا اُس کو پڑھ کر میں تم پر نہایت خفا ہوا
جو محبت دیکھتی مجکو تم سے ہے وہ اس لائق نہ تھی کہ تم ایسے کلمات لکھتے جو

ایک غیر شخص کو لکھتے زیبا ہیں. خبردار اس قسم کے خیالات ہمارے ساتھ ہرگز مت کرو. اگر تم رقعۂ مرسلہ کو کام میں نہ لاؤ گے تو نہایت آزردگی ہوگی اور یقین ہوگا کہ تم یکجہتی نہیں سمجھتے. اب دوبارہ اس باب میں نہ لکھنا"

جس دوست کے ساتھ سرسید کی زیادہ خصوصیت ہوتی تھی وہی اکثر موردِ عتاب رہتا تھا مگر اُس عتاب کی قدر وہی خوب جانتے تھے جو اُس کے مورد ہوتے تھے. خان بہادر مولوی سید زین العابدین خاں جن پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضی رہتی تھی وہی آج سب سے زیادہ سرسید کو یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں اور دنیا میں کسی دوست یا عزیز کو ویسا غمخوار اور غمگسار نہیں پاتے. سرسید کا ایک خط ہاتھ لگا ہے جو انھوں نے علالت کی حالت میں اپنے پیشدست سے لکھوا کر خان بہادر کو رام پور بھیجا تھا، نہ اُس میں عُرفی شوق و آرزو کا اظہار ہے نہ جدائی کی معمولی شکایت ہے مگر اس کے ہر ہر لفظ سے محبت ٹپکی پڑتی ہے. لکھتے ہیں "مکرمی زین‌یار ابھی تمہارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھکو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا. زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اُس کو بُرا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں. حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہوگیا. صبح کو اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو[1] ے

---

[1] خان بہادر ہمیشہ بلا ناغہ صبح کے چار بجے سرسید کی کوٹھی پر آتے تھے اور گھنٹا آدھ گھنٹا وہاں ٹھہر کر پھر ہوا خوری کو جاتے تھے یہ اُس صبح کی ملاقات کی طرف اشارہ ہے ۱۲-

ع اسے کہ ہرگز فراموشت نکنم ، کا نقشہ ہوگیا ہے "

نواب محسن الملک نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر خیر کرتے وقت کہا کہ "میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں، میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی اس وقت سے آج تک ایک بات بھی اُن میں ایسی نہیں دیکھی جس کو بُرا کہہ سکوں۔ اس شخص کیسی سچی محبت اور وفاداری دنیا میں کہیں نہیں دیکھی البتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی سے اس قدر محبت ہو سکتی ہے اور نہ باپ سے جیسی کہ اس شخص کی محبت خدا نے ڈال دی ہے۔"

اسی محبت کی کشش تھی کہ محسن الملک نے حیدرآباد سے آکر وطن مالوف کی طرف رُخ نہیں کیا بلکہ علیگڑھ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور کبھی ایک دو دن سے زیادہ اٹاوہ میں جاکر قیام نہیں کیا، اور اگر حفظ صحت کا خیال اُن کو مجبور نہ کرتا تو غالباً وہ سرسید کی زندگی میں علیگڑھ کو چھوڑ کر کبھی بمبئی نہ جاتے۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے ؎

" درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پاے را "

سرسید کی خفگی اور غصہ میں جو کشش تھی وہ کسی کی مہربانی اور عنایت میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ سید مہدی علی کو ہمیشہ اُن کے عتاب آمیز خط جاتے تھے چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ " مہدی علی کو سوائے غصہ اور خفگی کے کبھی کچھ نہیں ملا باوجود اس کے سید مہدی علی کا معاملہ اُن کے ساتھ شمع و پروانہ کا سا تھا۔ الہ آباد کے جلسہ کانفرنس میں جس ذوق و شوق اور وجد کی حالت میں انھوں نے اپنا لکچر دیتے وقت تمام حاضرین کے سامنے سرسید سے خطاب کیا تھا وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگا خصوصاً

اس وقت کا سماں کبھی دل سے فراموش نہ ہوگا جب کہ انھوں نے سر سید سے مخاطب ہو کر یہ اشعار پڑھے تھے ؎

دلبران ماہ پیکر دیدہ ام در جمالت چیز دیگر دیدہ ام
ایں چہ نورست اینکہ تاباں از تو ہست ہفت کوکب نور افشاں از تو ہست
تو مکمل از کمال کیستی مظہر نور جمال کیستی

سر سید نے ایک آرٹیکل میں جو غالباً محبت پر لکھا ہے مسٹر پشلی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیے کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہیے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جائے تو اُس کے ضرر سے بچنے کی جگہ باقی رہے" اس قول کو نقل کر کے وہ خود لکھتے ہیں کہ "اس کا پہلا حصہ جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ہے وہ نہایت عمدہ ہے، مگر پچھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ برتنے کی ہے اُس میں سمجھ کی کچھ بھی بات نہیں بلکہ نری مکاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے، اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا، یہ سچ ہے کہ بعضے دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا انھیں کو دغا باز اور بُرا کہتی ہے، دوست پر بھروسا کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتے۔ ہاں البتہ دوستوں کے منتخب کرتے میں بڑی سمجھ چاہیے۔"

سر سید نے جو کچھ لکھا ہے یہ خاص اُن کے دلی خیالات تھے اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُن کا ہمیشہ اسی کے موافق عمل درآمد رہا۔ وہ بے شک زود آمیز اور زود پیوند نہ تھے بلکہ اس شعر کے حقیقی مصداق تھے ؎

"نہ عیب نیست کہ بیگانہ وار مے گذری کہ ہر کہ زود گسل نیست دیر پیوند ست"

مگر جب کسی سے دل مل جاتا تھا پھر خواہ وہ شخص ہندو ہو یا عیسائی یا یہودی یا مسلمان اُس سے کسی طرح کی مغایرت اور بیگانگی باقی نہ رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے پوتے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں بمقام علیگڑھ ایجوکیشنل کانفرنس نے جلسوں کے بعد تمام ممبروں اور وزیٹروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جس کے آخر کے چند فقرے یہاں نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا " اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لیے اسی کا گیت گایا جاتا ہے ورنہ اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے علانیہ دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمد محمود اور مسٹر راس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور اُن کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے۔ اپنا نام اُس مولود مسعود کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے اُن کا نام اُس کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اُس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔"

" دوسرا نمونہ راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ ایس۔ آئی کی طرف نہایت جوشِ محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا، ہمارا یہ ڈاڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے۔ اُن کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں اور سید راس مسعود دادا راجہ۔ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔"

سرسید جس کو دوست سمجھ لیتے تھے اُس کی طرف سے فی الواقع اُن کا دل ایسا صاف ہو جاتا تھا کہ اس کی نسبت بُرائی کا کبھی تصور بھی نہ آتا تھا۔ کسی کی شکایت یا سعادیت یا دراندازی اُن کو دوست سے جب تک کہ علانیہ اور متواتر اُس سے دوستی کے خلاف باتیں سرزد نہ ہوں، بدگمان نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ جب کسی کی نسبت اُن کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ دوست نہیں پھر اُس سے مطلق تعلق باقی نہ رہتا تھا۔ ظاہرداری کا لمنافی الحقیقۃ اس شخص کو نہ آتا تھا۔ اُن کے حال پر بعینہ یہ شعر منطبق ہوتا تھا ؎

مرغان دلم راکہ ایں مرغ وحشی　　زبامے کہ برخاست مشکل نشیند

وہ سید مہدی علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میں تو اُس شخص کو کافر و بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت خیال کرے کہ اُس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی یا کہی ہوگی۔ میں تو دوست کے گالی دینے اور بُرا کہنے کو بھی دوستی پر محمول کرتا ہوں اور درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے، مگر جب کہ حقیقت میں خلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر شیشۂ محبت جو نہایت نازک ہے کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دوستی اور محبت ایسی سخت چیز ہے کہ ہتھوڑوں اور ہزاروں صدموں سے نہیں ٹوٹتی، مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اُس سے نسبت نہیں۔ ایک ادنےٰ سی خلاف محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور جس قدر محبت زیادہ بڑھتی جاتی ہے اُس کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔"

سرسید کو کسی دوست نے لکھا کہ فلاں دوست سے بھی آپ چندہ طلب کریں۔ اُس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ "جو ملال اُن کی طرف سے میرے

دل میں ہُوا ہے وہ اب تک کم نہیں ہوا، پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اُس نگاہ سے جو اُس کے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان جو وہ کہے جو اُس کے دل میں نہیں ہے، ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔"

اُن کا قول تھا کہ دوستی کے آگے رشتہ و قرابت کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام کے خط میں مولوی زین العابدین خاں کی نسبت لکھتے ہیں "جس قدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر لکھا ہے درحقیقت وہ بہت کم ہے۔ اس کافر غارت کن ایمان کو جیسا کہ وہ ہے میں ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ہے رشتے ناتے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔"

اگرچہ سر سید ہر ایک معاملہ میں نہایت آزادانہ خیالات رکھتے تھے مگر دوستی کے معاملات میں بڑے کنسرویٹو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے خالص و مخلص دوستوں سے اُسی قسم کی توقعات رکھتے تھے جیسے اگلے زمانہ کے وضع دار اور باوفا دوستوں کے حالات سننے میں آئے ہیں قطع نظر پرائیویٹ باتوں کے پبلک معاملات میں بھی جو زیادہ مہتم بالشان ہوں، اُن کی یہ خواہش معلوم ہوتی تھی کہ دوست اُن کی رائے کے مؤید ہوں اور اگر کوئی دوست اُن کی رائے سے اختلاف کرتا تھا تو اُن کو حد سے زیادہ ملال ہوتا تھا۔

جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال ہُوا وہ اپنے ہر ایک دوست سے اس بات کے متوقع تھے کہ اُن کے کام میں دل سے مدد دیں۔ جن قدیم دوستوں نے توقع کے موافق تعلیمی معاملات میں اُن کو مدد نہیں دی اُن کے ساتھ وہ ربط و ضبط جو قدیم سے چلا آتا تھا قائم نہ رہا اور نئے دوست جو ان معاملات میں

اُن کے مددگار تھے اُن کو وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا سمجھتے تھے۔ خاں بہادر برکت علی خاں کی نسبت اُن کی اخیر دم تک یہ تمنا رہی کہ کالج میں ایک ممتاز مکان اُن کی یادگار میں تیار کرائیں۔ سردار محمد حیات خاں کو اپنا قوت بازو سمجھتے تھے۔ قاضی رضا حسین رئیس پٹنہ، خلیفہ سید محمود حسن خاں وزیر پٹیالہ، مولوی چراغ علی اور سید ظہور حسین کے مرنے کا اُن کو ایسا رنج ہوا تھا کہ اپنے کسی عزیز کے مرنے کا بھی کسی کو اس سے زیادہ صدمہ نہیں ہو سکتا۔ نواب انتصار جنگ سے اگرچہ وہ ٹرسٹی بل کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر آزردہ ہو گئے تھے مگر چونکہ مدرسہ کی امداد اُن کی برابر ایک آدھ کے سوا کسی نے نہیں کی اس لیے وہ ملال چند روز بعد بالکل جاتا رہا تھا اور ان کی ویسی ہی جگہ دل میں ہو گئی تھی جیسی قدیم سے چلی آتی تھی۔ نواب عماد الملک کو اُن کی نیکی اور راستبازی اور علم و فضل اور مدرستہ العلوم کی حقیقی خیر خواہ اور خیر اندیشی کی وجہ سے وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سید محمود کو اور اُن کی نسبت یہ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک نورِ مجسم ہے۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد کی نسبت ایک ناواقف آدمی نے اُن کے سامنے بطور شکایت کے کہا کہ باوجود اس قدر مقدور ہونے کے انھوں نے قومی تعلیم میں کچھ مدد نہیں دی۔ سرسید نے بدمزہ ہو کر اُن کے چندوں کی تفصیل بیان کی جو وہ ابتدا سے مدرسہ میں دیتے رہے ہیں اور جو مقبولیت اور رونق ان کے لکچروں سے ایجوکیشنل کانفرنس کو ہوئی اُس کا ذکر کر کے کہا کہ یہ شخص ہماری قوم کے لیے باعثِ فخر ہے اُس کی نسبت پھر ایسا لفظ زبان سے نہ نکالنا۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ جنھوں نے کالج کے چندوں کے سوا سوسائٹی کے مقاصد میں اپنے ترجموں سے بے نظیر امداد دی تھی۔ اور سید زین العابدین، سید تراب علی، سید مہدی علی، مولوی مشتاق حسین، راجہ

جے کشن داس، حاجی اسمٰعیل خاں اور مرزا عابد علی بیگ کو وہ مثل اپنے اعضا وجوارح کے سمجھتے تھے۔ الغرض یہ شخص دوستی و محبت کے باب میں اس عربی شعر کا حقیقی مصداق تھا۔

واذا رأیت صدیقه وشقیقه — لم تدر ایهما ذوو الارحام

(یعنی تو اس کے دوست اور سگے بھائی کو دیکھ کر یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ بھائی کونسا ہے اور دوست کونسا)

نوکروں کے ساتھ تعلق

اسی جبلی مہر و محبت کا مقتضا تھا کہ وہ اپنے رفیقوں اور نوکروں اور سگے بندھوں کو تا بمقدور عمر بھر اپنے ساتھ بناہنا چاہتے تھے جس شخص کے قدم اُن کے ہاں جم گئے۔ پھر نہ وہ اُسکو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ اُن سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ اول تو وہ کسی کی شکایت سنتے نہ تھے اور اگر کوئی کسی ملازم کی شکایت کرتا تھا تو اُس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ اُن کے ایک قدیم ملازم کی لوگوں نے اُن سے بارہا شکایت کی مگر وہ کسی طرح اُن کے دل سے نہ اترا۔ ہمیشہ اُن کا معتمد علیہ اور سفر و حضر میں اُن کے ہمراہ رہا اور آخر انھیں کی رفاقت میں مر گیا۔ اُس کے بعد چھوٹے بھائی کو وار و نگی ملی جس کی آوارگی اور بدچلنی حد سے گزر گئی تھی مگر وہ بھی اخیر دم تک اُن سے نہ چھوٹ سکا۔

حافظ عبدالرحمٰن مرحوم جو سید محمود کے بچپن کے اُستاد تھے، ۲۵ برس سرسید کے ساتھ رہے اور وہیں اُن کا خاتمہ ہوا۔ مرتے وقت انھوں نے سید محمود اور سرسید کو بلایا جب دونوں کو دیکھ لیا فوراً روح پرواز کر گئی۔ سرسید کو اُن کے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک اُن کے مرنے کا رنج والم رہا۔ منشی ذوالفقار جو اُن کے بیچ کا حساب کتاب لکھتا

تھا اُس کے مرنے کا بھی اُن کو کچھ کم صدمہ نہیں ہوا۔ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس شخص کا خمیر مہر و محبت سے بنا ہُوا تھا۔

فراخ حوصلگی

سیر چشمی اور فراخ حوصلگی بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ انھوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لیے کوئی جائیداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اُس کو یا اپنی ضروری آسایش اور سچی عزت اور نیکنامی کے ذرائع میں صرف کیا۔ یا کُنبے کی خبر گیری، مستحقوں کی امداد، اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اٹھایا۔ وہ ۳۷ برس سرکاری ملازمت میں رہے اور اس عرصہ میں سو روپیہ سے لے کر آٹھ سو روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے رہے۔ جب تک سید محمود ہائی کورٹ کے جج رہے ایک ہزار ماہوار باپ کو دیتے رہے۔ نوکری کے بعد اخیر دم تک چھ سو روپیہ ماہوار پنشن کی آمدنی رہی مگر کبھی ان کی آمدنی خرچ کو مکتفی نہیں ہوئی۔ اُن کے ایک معزز رشتہ دار کا بیان ہے کہ "جب دلی کی منصفی سے اُن کو ترقی کے ساتھ باہر بھیجنے لگے تو اُن کی والدہ نے جو اُن کی طبیعت اور خصلت سے خوب واقف تھیں، صرف اس خیال سے جانے نہیں دیا کہ جس قدر زیادہ آمدنی ہوگی اُسی قدر خرچ بڑھ جائے گا، پھر اپنا گھر چھوڑ کر باہر جانے سے کیا فائدہ۔"

ابتدا سے اُن کا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہر اُن کے دل میں اُٹھی اُس پر روپیہ صرف کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ وہ اپنے کھانے پہننے کے اخراجات میں تنگی کر سکتے تھے اور کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں انھوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا۔ جس کتاب کی اُن کو تلاش ہوئی اگر وہ بیس گُنی قیمت

پر بھی ملی تو اُس کو لیے بغیر نہیں چھوڑا۔ ریاضی کے متعلق آلات جمع کرنے کا اُن کا شوق ہوا صد ہا روپیہ اُس میں صرف کر ڈالا۔ کسی تصنیف کے لیے میٹریل جمع کرنے میں، کسی کتاب کے چھپوانے کے اہتمام میں، کسی سوسائٹی یا انجمن یا مدرسہ قائم کرنے میں وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت زیادہ زیادہ خرچ کرتے رہے۔ ساری عمر تصنیف تالیف میں گزری مگر کبھی حق تصنیف سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا اور کبھی کسی کتاب کی رجسٹری نہیں کرائی ان کی کتابیں اور مضامین جس کا جی چاہتا تھا چھاپ لیتا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی سے تعرض نہیں کیا۔

جب تک مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا نہیں ہُوا وہ ثواب کے معمولی کاموں میں بہت شوق سے شریک ہوتے تھے۔ محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ بجنور میں غدر سے پہلے تین مسجدوں کے بننے میں انھوں نے کافی مدد دی۔ موضع بینسو یہ جو بجنور اور دلّی کے رستے میں پڑتا تھا وہاں ایک سرائے تھی جس میں سرسید آنے جانے کھانا کھاتے کے لیے ٹھیرا کرتے تھے۔ اس سرائے میں بھٹیاروں نے ایک مسجد بنانی شروع کی تھی۔ اُس مسجد کی ابھی بنیادیں ہی بھری گئی تھیں کہ دو بھٹیاروں کو وہاں کے برہمنوں نے مار ڈالا اور اس لیے مسجد کی تعمیر بند ہوگئی۔ سرسید نے اُس کی تعمیر نا تمام دیکھ کر کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا اور کچھ دلّی سے اپنے رشتہ داروں مردوں اور عورتوں سے وصول کر کے اُس کو پورا کر دیا۔ پھر خاص بجنور میں بکر قصابوں نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی۔ اُس کے بنوانے میں بھی انھوں نے بہت مدد دی، مگر وہ ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ غدر ہوگیا۔ غدر کے بعد سرسید نے فوراً اس کی تعمیر جاری کرائی اور اس کو مکمل کرادیا۔ اسی طرح کاندھلہ میں ایک مسجد مولوی مظفر حسین مرحوم و مغفور بنوا رہے تھے، سرسید نے روپیہ بھیجا

چاہا، مولوی صاحب نے کہا کہ تمہاری تنخواہ کا روپیہ مسجد میں نہیں لگایا جا سکتا، سرسید نے رجسٹری کی آمدنی میں سے وہاں کئی سو روپیہ بھیجا" مگر جب وہ خیالات بدل گئے تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، سہارنپور کی جامع مسجد کے لیے جب اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ" میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے"

مستحقوں کی امداد اور دستگیری کرنے کی بھی اُن کی نسبت بے شمار مثالیں سننے میں آئی ہیں، خصوصاً غدر کے بعد جب کہ مسلمان شرفا کے صدہا خاندان تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ اُن کے دوست محمد سعید خاں کہتے تھے کہ" مراد آباد میں جو شکستہ حال اشراف صورت مسلمان اُن کے مکان کے برابر سے گزرتا اُس کو خود بلا لیتے تھے اور علیحدہ لے جا کر اس کا حال دریافت کرتے تھے اور ایسے طور پر اُس کے ساتھ سلوک کرتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو" اُن کے ایک معزز اور ثقہ دوست کی روایت ہے کہ" مدت تک غدر کے بعد اُن کا یہ حال رہا کہ اپنی تنخواہ میں سے صرف بقدر اخراجات ضروری لے کر باقی کل روپیہ دلّی میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتے تھے۔ بعض اشخاص غدر کے آفت رسیدہ لوگوں کے ساتھ سرسید کا یہ برتاؤ دیکھ کر بہ تصنع اپنے تئیں مفلوک اور مصیبت زدہ ظاہر کرتے تھے اور سرسید اُن کے اصل حال سے واقف ہونے کے بعد بھی اُن کے ساتھ اُسی طرح سلوک کرتے تھے۔

محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ" مراد آباد میں جب کہ نواب لفٹنٹ گورنر کا دربار ہونے والا تھا اور لوگ اطراف و جوانب سے دربار میں شامل ہونے کو آئے ہوئے تھے، ایک شخص بظاہر معقول اور سفید پوش سید صاحب

کے مکان پر آئے اور اُن کو الگ لیجا کر کہا کہ میں دربار میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا، مگر میرا آدمی اسباب لے کر بھاگ گیا اور میں بالکل بے سروسامان رہ گیا ہوں۔ سرسید نے اُن کو معقول خرچ دیا اور کھانا اپنے ساتھ کھلایا۔ جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ شخص اسی نواح کا رہنے والا ہے اور اسی طرح لوگوں کو جُل دے کر مانگ کھاتا ہے۔ تین چار روز بعد وہ پھر تشریف لائے اور کچھ اور طلب کیا۔ سید صاحب نے پھر کچھ خرچ دیا اور کھانا بھی ساتھ کھلایا۔ غرض کہ تین دفعہ دربار ہونے سے پہلے وہ اُن کے پاس آیا اور ہر دفعہ اُس کو کچھ دیا اور کھانا اسی طرح ساتھ کھلایا۔"

اُس زمانہ میں سرسید کو یہ خیال تھا کہ سینکڑوں شریف اور خاندانی افلاس میں مبتلا ہیں اور جس حیلے سے روٹی ملتی ہے حاصل کرتے ہیں۔ مگر جب سے انھوں نے مدرسۃ العلوم قائم کیا اُن کا حال بالکل اس کے برخلاف تھا۔ وہ سائل کو کبھی اپنے دروازے پر پھٹکنے نہ دیتے تھے اور بجائے اس کے کہ شخصی امداد کو کوئی کارِ خیر سمجھتے ہوں، اس کو ایک قسم کی معصیت جانتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کی امداد کرنا اُن کو ہمیشہ کے لیے دریوزہ گر بنانا ہے۔ اسی لیے اُن کی تمام فیاضی اور داد و دہش قوم کی تعلیم میں منحصر ہوگئی تھی جس درشتی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اس پہ ڈرو بک کرتے تھے اُس کو دیکھ کر ناواقف آدمی اُن کو سخت بداخلاق اور بدمزاج تصور کرتا تھا مگر وہ اُن کا غصہ اور ڈرو بک کرنا سراسر مصنوعی ہوتا تھا۔ اُن کا یہ قول تھا کہ لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے لیے بداخلاق بننا نہایت ضرور ہے۔

سرسید کی جوانمردی اور فیاضی صرف داد و دہش ہی میں محدود نہ تھی بلکہ اُن کی مثال ایک پھلدار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے اپنے سایہ

سے اور اپنی لکڑی سے غرض کہ ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ غدر کے بعد انھوں نے اکثر بے گناہ مسلمانوں کی جن کی نسبت حکام کو اشتباہ ہو گیا تھا، صفائی کرائی، بعض اشخاص جو فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ کے خوف سے باغیوں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، مگر درحقیقت بے گناہ تھے، اُن کو بطور خود وہاں سے بلا کر ان کی تحقیقات کرائی اور اُن کی بریت پر خود گواہی دے کر اُن کو بری کرا یا۔ مراد آباد کے مسلمانوں کو بعض ناخدا ترس ہندوستانیوں کے شر سے بچایا جو محض مذہبی تعصب کے سبب اُن کو پھانسیاں دلوانے پر کمربستہ تھے، بعض مسلمان جو سرکاری فوج کے ہاتھ سے دلی پر حملہ ہونے کے وقت بے قصور مارے گئے تھے اُن کے رساندہ وارثوں کی پنشنیں[1] مقرر کرائیں مولانا عالم علی مرحوم مراد آبادی کی صفائی کرانے میں جو کوشش سرسید نے کی وہ ہم پہلے کسی موقع پر بیان کر چکے ہیں۔ غرض کہ اس شخص نے مسلمانوں کو کیا من حیث القوم اور کیا من حیث الافراد فائدہ پہنچانے میں کبھی کمی نہیں کی۔

غریب پیشہ وروں اور مزدوروں کے ساتھ جو فیاضانہ برتاؤ اس شخص کا تھا اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور پر علیگڑھ میں مقیم ہوئے مزدوروں کی مزدوری اور گاڑیوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ

---

[1] مولانا صہبائی کے نواسے محمد حمید الدین کا ایک خط ہمارے سامنے تھا جو تغیر کے سرسید کے نام آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ "مولانا امام بخش صہبائی مرحوم جو اس عاجز کے نانا تھے ایام غدر میں اُن کے بے گناہ قتل ہونے پر عالی حضرت نے جناب نانی صاحبہ و دیگر رساندگان کا وظیفہ سرکار انگریزی سے مقرر کرا دیا تھا، جب تک نانی صاحبہ زندہ ہیں بدستور وظیفہ ملتا رہا۔ بندہ نے والدین سے سنا تھا کہ جو احسانات آنجناب کے اس خاندان کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بیان سے باہر ہیں۔"

ہو گیا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو اُن کی توقع اور حوصلہ سے بہت زیادہ دیتے تھے اور جب ان کہیں ان کا رہنا ہوا یہ لوگ اُن کے نہایت شکر گزار اور ثنا خواں رہے۔ ان کے ایک دوست کا بیان ہے "میں بنارس میں اُن سے ملنے گیا تھا، دریا پہ پہنچا تو شام ہو گئی تھی، اور کشتی کی آمد و رفت بند ہو گئی تھی۔ ہر چند ملاحوں سے کہا کہ کشتی لگا دو، مگر انھوں نے نہ مانا۔ لیکن جب اُن کو معلوم ہوا کہ یہ جج صاحب کے ہاں جانے والے ہیں فوراً کشتی لگادی اور مجھے پار اُتار دیا۔ کشتی سے اُتر کر میں نے ملاحوں کو کچھ دینا چاہا مگر انھوں نے کچھ نہ لیا اور یہ کہا کہ سرکار (یعنی سرسید) ہم کو بہت کچھ دیتے ہیں ہم اُن کے مہمان سے ہرگز کچھ نہ لیں گے" ایسا ہی ایک واقعہ ریل کے مزدوروں کا سنا ہے جو سرسید کے نام پہ بلا مزدوری کام کرتے تھے۔

سالم نام ایک یہودی صنعای یمن کا رہنے والا غازی پور میں سرسید کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لیے پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی سرسید نے پوچھا کہ کیا تنخواہ لو گے؟ اُس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے، سرسید نے کہا میں تم کو پچیس روپیہ مہینا دوں گا، مجھے عبرانی سکھاؤ۔ سرسید کے ایک دوست کہتے تھے کہ اس نے خوشی کے مارے بڑھ کر سرسید کی داڑھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اُس کو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ مسرف اور آوارہ مزاج تھا اس لیے اس کو بقدر ضرورت دیتے رہے اور اُس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اُس کا چڑھا ہوا تھا حساب کر کے اُس کے حوالے کر دیا۔

جس زمانہ میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دلّی میں پڑھتے تھے میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بھی اُن کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب

سید صاحب چند روز کے لیے قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے لگے تو انھوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہتک چلتے مولوی صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیونکر جا سکتا ہوں! ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھ سے پڑھتی ہے، ان کو کس پر چھوڑ کر جاؤں! انھوں نے کہا سب طلبہ کو بھی ساتھ لے چلیے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کھائیں گے کہاں سے! سید صاحب نے کہا آپ ان کے کھانے پینے کا فکر کیجیے نہیں، خدا رازق ہے، لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کر دوں گا اور اس سے میری آئندہ ترقی رُک جائے گی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے اُن کے ساتھ ہو لیے اور جب تک رہتک رہنا ہوا سب خرچ سید صاحب کے ذمہ رہا۔

سر سید کی اس قسم کی فراخ حوصلگی کی مثالیں بے شمار ہیں جن کی تفصیل کی اس کتاب میں گنجایش نہیں۔ اگرچہ یہ خصلت عام مسلمانوں کے حق میں اُن کی موجودہ حالت کے لحاظ سے نہایت خطرناک ہے، کیونکہ اب مسلمان بغیر کفایت شعاری کے صفحۂ ہستی پر قائم نہیں رہ سکتے، مگر سر سید کی حالت عام مسلمانوں سے بالکل مستثنیٰ تھی۔ ؎

درحق او مدح و درحق تو ذم   درحق او شہد و درحق تو سم

سر سید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو انھوں نے گزشتہ چالیس برس میں سرانجام دیں وہ کون کرتا؛ انھوں نے ایسے کاموں کے لیے جو ہندوستان میں اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی اُن کو بالکل عادت نہ تھی، دس بارہ لاکھ سے کم روپیہ وصول نہ کیا

ہوگا، اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسوں میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے، اگر وہ اپنے گھر کو دھانسرا نہ بناتے تو علیگڑھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا، اگر وہ ہزارہا روپیہ اپنے پاس سے صرف کر کے اطراف ہندوستان میں چندہ کے لیے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمّے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے تھے، کیونکر اپنا وقار قائم رکھ سکتے تھے، اگر وہ یورپین طریقہ پر ہائی لائف نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتے تھے۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد نے سچ کہا تھا کہ "سید احمد خاں کے ظاہر حال سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ اونچے درجہ کے انگریزوں کی طرح ماند و بود کرتے ہیں گورنروں کو مہمان رکھتے ہیں۔ اُن کے ہم نوالہ ہیں جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیے کہ سید کو چار و ناچار خیلیانوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور وہ بڑے بھاتک بغیر نبھ نہیں سکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو کوئی اعلیٰ درجہ کا انگریز یا اعلیٰ درجہ کا نیٹو ان کی طرف رُخ نہ کرے اور ایسی موٹی اسامیاں دام میں نہ آئیں تو چندہ کی بھاری بھاری رقمیں کن سے ہاتھ لگیں۔"

بہرحال اس باب میں سرسید کی ایک خاص حالت تھی، اگر کوئی دوسرا شخص بھی گھر بار لٹا کر قوم کو اسی طرح فائدہ پہنچا سکے تو وہ بلاشبہ قوم کا سرتاج ہے اور بے شک روپیہ صرف کرنے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا مسٹر سموئل اپنی کتاب سلف ہلپ میں لکھتے ہیں کہ "جو شخص اپنے روپیہ سے لوگوں کو نفع نہیں پہنچاتا وہ بہت ہی ذلیل آدمی ہے۔ جوانوں کو خیال رکھنا چاہیے

کہ جوانی کی کفایت شعاری کہیں بڑھاپے میں جاکر خست نہ بن جائے اور جو کام (یعنی کفایت شعاری) پہلے فرض اعظم تھا وہی گناہ عظیم نہ بن جائے۔"

اگرچہ سرسید کی زندگی برابر آسودگی کے ساتھ گزری اور اُن کی حیثیت ایک متوسط الحال شریف ہندوستانی کی حیثیت سے بہت زیادہ رہی مگر خدا تعالےٰ نے اُن کا حوصلہ بمقابلہ اُن کی حیثیت کے زیادہ فراخ اور وسیع و بلند پیدا کیا تھا اس لیے اُن کی آمدنی کبھی اُن کے اخراجات کو مکتفی نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ مقروض رہنا ایک لازمی سی بات ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو جو مقروض ہو گئے تھے، اس طرح لکھتے ہیں "قرضہ کی پریشانی بلاشبہ بہت رنج دہ ہے جس کے مزے سے میں خوب واقف ہوں، بہت کم مسلمان ہوں گے جو اس رنج میں مبتلا نہ ہوں۔ مگر میں تو اپنے دل کو اس طرح تسلی دے لیتا ہوں کہ مقروض ہونا بھی خدا کی رحمت ہے، میں اس حدیث پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ "صاحب المال کافر" جس پر حضرت ابوذر غفاریؓ کا یقین اور عمل تھا کافر کے لفظ سے کیا مراد ہے اس بحث کو چھوڑ دو، جو اس کی مراد ہو وہ ہو، لیکن ہم ابوذر تو بن نہیں سکتے مگر خدا کی رحمت ہے جو اس نے ہم کو مقروض رکھ کر کفر سے بچایا ہے۔ پس میرے دل کی تسلی کو تو یہ خیال کافی ہے۔" معلوم نہیں کہ سرسید کو اس حدیث کے یقین نے مال جمع کرنے سے باز رکھا تھا یا جب مال جمع نہ ہو سکا تب اس حدیث پر یقین ہوا؟ درحقیقت یہ اُن کا حسن بیان تھا جس سے مخاطب کو تسلی دینا مقصود تھا ورنہ روپیہ پیسے کی محبت سرے سے اُن کی سرشت ہی میں نہیں پیدا کی گئی تھی اور وہی اثر اُن کی اولاد میں موجود تھا کہ باوجود معقول آمدنی کے ہمیشہ مقروض اور تہیدست رہے۔

سرسید کے ایک دوست ایک زمانہ میں اُن کے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ جب مہینا ختم ہُوا میں تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر اُن کے دکھانے کو لے گیا، سرسید نے کہا "بس مجھے دکھانے کی کچھ ضرورت نہیں، یونہی چلنے دو، میں دیکھوں گا تو ناحق میرے دل کو صدمہ ہوگا" حق یہ ہے کہ جو شخص رات دن اوروں کی صلاح و فلاح کی فکر میں رہے گا وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیونکر متوجہ ہوسکتا ہے؛ ولیم پٹ جو اُن لوگوں میں سے تھا جنھوں نے انگلستان کو انگلستان بنایا ہے، اُس کی نسبت لارڈ مکالے نے لکھا ہے کہ "نہ اُس کے بیوی تھی نہ بچے، نہ محتاج رشتہ دار تھے اور نہ اسراف کی عادت تھی، باوجود اس کے جب وہ مرا تو ہوس اوف کامنس کو اس کا قرضہ ادا کرنے کے لیے چار لاکھ روپیہ منظور کرنا پڑا۔ اگر وہ ہفتہ میں پندرہ منٹ بھی انتظام خانگی کے لیے صرف کرتا تو ان تمام اخراجات کا معقول انتظام ہوجاتا۔ اُس کے نوکروں کی لوٹ نہایت حیرت انگیز تھی، ایک ہفتہ میں صرف گوشت کا بل ساڑھے بارہ من کا تھا اور اسی کے قریب مُرغ مچھلی اور چائے کا۔

اگرچہ سرسید بمقابلہ وزیرِ اعظم انگلستان کے ایک نہایت غریب اور کم حیثیت آدمی تھے مگر خانگی انتظام کے متعلق اُن کی بے اعتنائی نسبتہً ولیم پٹ سے کچھ کم نہ تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ ولیم پٹ کو یقین تھا کہ جس سلطنت کی بہتری کے لیے وہ اخیر دم تک کوشش کرتا رہا وہ اُس کا قرضہ ادا کرنے کی متکفل ہوگی مگر غریب سید کو چار لاکھ چھوڑ چار سو کا بھی ادا کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا اور اسی لیے جہاں تک ہم کو معلوم ہے جس طرح کہ اس نے وارثوں کے لیے کوئی جائداد نہیں چھوڑی اسی طرح قرضہ کا بوجھ کسی پر نہیں

ڈالا۔ اگر بالفرض کچھ قدر قلیل کسی کا دینا باقی رہ گیا ہوگا تو سید کی پولیٹیکل پنشن جو اُن کے بعد ایک نسل تک جاری رہنے والی ہے، اس قرضے کے لیے کافی سے بہت زیادہ ہے۔

ایک دوست نے سرسید کے ایک رشتہ دار کا یہ مقولہ بیان کیا کہ سید احمد خاں نے اگرچہ ناجائز طور پر کبھی ایک خرمہرہ نہیں لیا مگر اُن کی تنخواہ اور رجسٹری اور پولیٹیکل پنشن کی اس قدر آمدنی تھی کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتے اور فضول خرچ میں روپیہ برباد نہ کرتے تو آج اُن کی اولاد کے برابر دلی میں بہت ہی کم صاحب جائیداد نظر آتے۔ میں یہ سُن کر چپ ہو رہا اور سعدی شیرازی کا یہ شعر دل ہی دل میں پڑھتا رہا۔

اے کہ آگاہ حالت درویشاں را
تو چہ دانی کہ چہ سوداوسرست ایشاں را

انتقام کا خیال نہ ہونا

مخالفوں اور دشمنوں کی بُرائیوں کا تحمل کرنا اور کبھی اُن سے انتقام لینے کا ارادہ نہ کرنا یہ بھی سرسید کے اُن اوصاف میں سے تھا جو اُن کی ذات کے ساتھ مخصوص تھے۔ اس شخص کے صرف اقوال ہی سے نہیں بلکہ زیادہ تر اس کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ بُرائی کا بدلا لینا تو درکنار اس کو کسی کی بُرائی یاد بھی نہیں رہتی تھی۔ بلاشبہ محمڈن کالج کی بدخواہی یا جن اصول پر سرسید نے اس کو قائم کیا تھا اُن میں رخنہ ڈالنا اس کو حد سے زیادہ ناگوار گزرتا تھا مگر جن لوگوں کی بُرائیاں اس کی ذات تک محدود تھیں اور کالج تک اُن کا علانیہ طور پر کچھ اثر نہ پہنچتا تھا اُن کی نسبت قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی بُرائیاں

اُس کو محسوس بھی ہوتی تھیں یا نہیں؛

حکایات لقمان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ "ایک مچھر بیل کے سینگ پر آ بیٹھا اور یہ سمجھ کر کہ بیل پر میرا بوجھ پڑا ہوگا اُس سے کہا کہ اگر میرا بوجھ تجھ پر شاق گزرا ہو تو کہہ دے تاکہ میں اُڑ جاوں بیل نے کہا اے نادان مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تو مجھ پر بیٹھا بھی ہے یا نہیں چہ جائیکہ تیرے بیٹھنے سے مجھ کو کچھ تکلیف ہوئی ہو" بعینہ یہی حال لوگوں کی بُرائی کے مقابلہ میں اس شخص کے تحمل اور حوصلہ کا تھا۔

اُن کے ایک دوست راوی ہیں کہ "مراد آباد میں جبکہ سرسید وہاں صدرالصدور تھے محکمہ صاحب جج کے ایک ہندو کلرک کو سرسید سے کچھ رنجش تھی وہ اکثر گمنام عرضیاں ان کی شکایت کی اعلیٰ افسروں کو لکھتا رہتا تھا ایک بار جب کہ پولیس کا نیا انتظام ہوا تھا، اس ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ صدر اعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور اُن کے گھر میں اس کی لاش موجود ہے۔ فوراً تلاشی لی جائے۔ اُسی وقت پولیس کا عملہ اُن کے مکان پر چڑھ آیا۔ سرسید نے مکان میں پردہ کرا دیا اور تلاشی لی گئی۔ مگر چونکہ وہ محض اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سرسید کو اس کا نہایت رنج ہوا، مراد آباد کا کوتوال اس جرم میں کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی برخاست کیا گیا۔ سرسید اور اُن کے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہو گیا تھا کہ فلاں کلرک نے یہ عرضی لکھی تھی مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔ جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک نوکری سے علیحدہ ہو گیا تو ایک موقع پر جب کہ سرسید کے ایک معزز یورپین دوست کو کسی اعلیٰ عہدہ پر ترقی پا کر غالباً سنٹرل انڈیا کو جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھہرے تھے، اُن کو ایک لائق

انگریزی داں کی ضرورت ہوئی چونکہ سرسید اس کلرک کی انگریزی لیاقت سے واقف تھے انھوں نے اُسی کی سفارش کی اور اُس کے گھر سے بلوایا۔ چنانچہ وہ صاحب اُس کو دو سو روپیہ ماہوار کا نوکر رکھ کر لے گئے۔" جو صاحب اس حکایت کے ناقل ہیں یہ کہتے تھے کہ "مدت کے بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اُس نے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ بُرائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ مگر اُس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دو سو کا نوکر رکھوا کر بھیج دیا۔ اُس نے کہا کہ حقیقت میں سید احمد خاں ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پہ اُس کی جوتیوں کی خاک پڑ جائے اُس کی نجات ہو جائے۔"

جب رفیق ہند میں سرسید کے خلاف نہایت سخت آرٹیکل شائع ہونے لگے اور منشی سراج الدین اڈیٹر سرمور گزٹ نے اس کا جواب لکھنے پر قلم اٹھایا تو سرسید ان کو لکھتے ہیں "میں نے آپ کا اخبار مورخہ ۸ جنوری پڑھا بلاشبہ یہ آپ کی محبت کا جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے۔ ممنون اور احسان مند ہوں اور آپ کو اس تحریر کی نسبت جو اُس پرچہ میں ہے۔ بوجہ جوش محبت معذور سمجھتا ہوں۔ مگر جانے دو۔ جو جس کا دل چاہے کہے ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ اگر ہمارے بُرا کہنے سے اُن کا دل خوش ہوتا ہے خوش کر لینے دو۔ تم بھی اُس بُرا کہنے سے خوش ہو۔ کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں نے وہ خط جناب خان بہادر برکت علی خاں

لے یہ اس گمنام خط کی طرف اشارہ ہے جو لاہور کے جلسۂ کانفرنس واقع ۱۸۸۸ء میں جانے سے ایک دن پہلے سرسید کے نام علیگڑھ میں آیا تھا اور جس میں یہ سخت الفاظ لکھے تھے کہ "اگر تم لاہور میں آئے تو تمھاری داڑھی جوتے سے مونڈی جائے گی اور جو مال کل سرمایہ تمھارے دوست (یعنی خان بہادر) کا کیا گیا ہے اس سے بدتر تمھارا حال کیا جائے گا۔"

کے پاس بھیج دیا۔ اگر ان کا ذکر نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ بھیجتا...... تم میرے ساتھ محبت رکھتے ہو اور اس کا بھی تم کو یقین ہے کہ جو لوگ میری نسبت عیب لگاتے ہیں وہ مجھ میں نہیں ہیں، تو تمہارے خوش رہنے کے لیے اور مجھکو خدا کا شکر کرنے کے لیے کہ وہ عیب اُس شخص میں جس کو تم دوست رکھتے ہو نہیں ہے، کافی ہے۔ اس سے زیادہ کیا خوشی کی بات ہے۔ پس بُرا کہنے والوں کی بُری بات کا بھی نیک پہلو نکالو اور خوش رہو۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔"

جب منشی سراج الدین نے اس کا جواب لکھا تو پھر سرسید نے اُن کو اسی مضمون کے متعلق دوسرا خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھتے ہیں "ہم کو خدا نے دنیا میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں، بُرا کرنے والے کی بُرائی سے ہم کو کیا کام ہے؛ ہم کو اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیے، بُرائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ بُرا کہنے والے ہیں اُس کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیے۔ اگر وہ بُرائی ہم میں ہے اُس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے۔ اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ بُرائی ہم میں نہیں ہے۔ بُرا کہنے والے کی نسبت خیال ہی نہیں چاہیے کہ کون ہے؛ دنیا میں ہے بھی یا نہیں؛ پس یہی آرام و آسائش کا طریقہ ہے۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ دنیا میں آرام سے رہو یہی طریقہ اختیار کرو۔ میں یقین کرتا ہوں مگر افسوس کے ساتھ کہ...... صاحب کی طبیعت خدا نے ایسی بنائی ہے کہ اُن سے بھلائی یا سچائی کی توقع نہیں۔ کچھ بس کر و آواز ہی پہنچے گی، پس گلہ کیا ہے؛ کیا تم دنیا کے بچھوؤں سے گلہ کرتے ہو؛ اور کیا وہ کسی کی دشمنی سے ڈنک مارتے چلتے ہیں؛ پس اُن کے حال سے بحث مت کرو لوگوں کا جیسا دل چاہے ویسا اُن کے ساتھ برتاؤ کریں۔ اگر ہم سے معافی

چاہتے ہیں ہمارا اس نے کیا گناہ کیا؛ کیا میری داڑھی منڈ گئی؛ آپ آکر دیکھ لیں بدستور ہے بلکہ چند و چند بڑھ گئی ہوگی مجھے تمام عمر افسوس رہے گا کہ میں نے وہ خط کیوں برکت علی خاں صاحب کے پاس بھیج دیا؛ اگر خاں صاحب ممدوح کی نسبت اس میں ستوحش بات نہ لکھی ہوتی تو میں ہرگز نہ بھیجتا. خیر! جو ہوگیا اس پر افسوس سے کیا فائدہ ہے؛

"میرے نزدیک منشی..... کی کسی بات کے درپے ہونا نہیں چاہیے؛ خدا کی دنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہے، ہر ایک اپنا کام کرتا ہے، تم اپنا کام کرو، اگر جان لو کہ تمہارا کیا کام ہے؛ نیکی، بھلائی اور اپنے کام سے مطلب؛ دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں جس سے دل رُکا ہوا ہو اس سے مت ملو، کیونکہ اُس سے مل کر خوشی نہ ہوگی، یا منافقانہ طریقہ پر ظاہرداری کرنی پڑے گی، نہ ملنے میں بہ نسبت ملنے کے آرام ہے، اسی طرح اُن کی باتوں کی پروا نہ کرنے میں بالکل آرام ہے۔"

اگرچہ سرسید فطرۃً نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض اُن کی سرشت میں داخل تھا مگر اُن کی ابتدائی روک ٹوک اور حسنِ تربیت سے یہ تمام ملکات اُن کی طبیعت میں اور بھی زیادہ راسخ ہو گئے تھے. اُسی نیک اور عاقل ماں نے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے. بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بُروں کی بُرائی سے بالکل درگزر کی جائے اور اگر بدلا ہی لینے کا خیال ہو تو اُس بڑے اور زبردست انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے، اسی نے لڑکپن میں یہ سبق پڑھایا تھا کہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بُرائی کرنا خود آپ کو ویسا ہی بنانا ہے. اسی تعلیم و تلقین کا یہ نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اُس کے واجب

انتقال ہونے کے فوتے حریین میں جاکر لکھوائے، جنھوں نے اُس کو کافر و ملحد و کرشان اور دجال ٹھیرایا، جنھوں نے گمنام خطوں میں اُس کو گالیاں لکھ کر بھیجیں اور قتل کی دھمکیاں دیں، اُن کی نسبت اُس نے علی رؤس الاشہاد یہ کہا کہ " میں اپنے کسی بھائی سے کبھی بجنس سے نہ دنیا میں بدلا لینا چاہتا ہوں نہ قیامت میں؛ میں نہایت ناچیز ہوں مگر اُس رسولؐ کی ذریت میں ہوں جو رحمۃ للعالمین ہے میں اپنے دادا کی راہ پر چلوں گا اور تمام لوگوں کو جنھوں نے مجھکو بُرا کہا، جنھوں نے مجھ پر اتہام کیا یا آئندہ کہیں اور کریں سب کو معاف کروں گا۔"

فی الحقیقۃ اچھی ماں اولاد کے حق میں خدا کی رحمت ہے جو اُس میں عمدہ اخلاق کی بنیاد ڈالتی ہے اور بُرائیوں کا رخ نیکی کی طرف پھیر دیتی ہے۔ سر سید کے بچپن اور جوانی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت غیظ و غضب پر مجبول ہوئی تھی مگر ماں کے حسن تربیت نے گویا اُن کی ماہیت بالکل بدل دی تھی۔ اُن کے رشتہ داروں کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں نے بیٹے کو کبھی کسی ماماں یا نوکر پر بھی سختی یا بدزبانی نہیں کرنے دی اور اگر کبھی کوئی ایسی حرکت اُن سے صادر ہوگئی تو اُن کو ایسی سزا دی گئی جو عمر بھر فراموش نہ ہو۔ چنانچہ ایک بار جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ایک نوکر پر زیادتی کرنے کے جرم میں اُن کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اور کئی دن کے بعد جب انھوں نے نوکر سے تصور معاف کرالیا، تب گھر میں آنے کی اجازت ملی۔ اگرچہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے مگر جبلت نہیں بدل سکتی۔ لیکن عمدہ تربیت جس طرح گھوڑے کی توسنی اور سرکشی کو چالاکی سے بدل دیتی ہے اسی طرح انسان کے غیظ و غضب کو اولوالعزمی اور دلیری کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے اور وہی چیز جو پہلے درندوں کی خصلت

معلوم ہوتی تھی اب بڑے بڑے عظیم الشان ارادوں کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔ سرسید میں یہ انقلاب نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ اُن کا جبلی غیظ و غضب فی الواقع ہمجنسوں کی حمایت اور جوش ہمدردی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ اُن کو پرائیویٹ معاملات میں سوا اس کے کہ کبھی کبھی نوکروں پر دودھ کا سا اُبال آجاتا تھا۔ بہت ہی کم غصّے ہوتے دیکھا ہے جو کچھ اُن کا غصہ اور افسوس تھا وہ قوم کی غفلت یا نالائقی پر تھا۔ یا اُن کی تباہی و بربادی پر، یا قومی کاموں کی مخالفت اور مزاحمت پر یا قوم کے بے جا تعصبات اور اُن کی پولٹیکل بے وقعتی پر۔

ممکن ہے کہ بمقتضائے بشریت کسی کی طرف سے اُن کے دل میں کچھ رنج ہو مگر اُن کے ظاہر حال اور قول و فعل سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی اس شخص کو کسی کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا۔ جو لوگ اس کو لوگوں کے سامنے علانیہ گالیاں دیتے تھے اُن کا نام بھی وہ ہمیشہ ادب کے ساتھ لیتا تھا۔ اس کے دل کی صفائی کا سب سے بڑا گواہ اُس کا اخبار تھا جو پچیس برس جاری رہا مگر کبھی کسی کی مذمت یا بُرائی اس میں نہیں لکھی گئی۔ وہ جس طرح اپنے اخبار کو چھیڑ چھاڑ اور ہزل اور حرف گیری وکج بحثی سے پاک رکھتا تھا اسی طرح اپنے اخبار نویس دوستوں کو ان لغویات سے بچنے کی نصیحت کرتا تھا۔ وہ ایک اخبار کے اڈیٹر کو لکھتا ہے جس میں بطور پنچ اخباروں کے کسی کا ہزل آمیز خط چھپ گیا تھا "کیا آپ کا اخبار بھی مثل دیگر نالائق اخباروں کے نامہذب ہونے کو ہے؛ نہایت افسوس اور کمال درجہ افسوس ہے کہ مضمون مذاق نوشتہ ...... آپ کے اخبار ۳۰ اپریل میں چھپا ہے، آپ کا اخبار روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، لوگوں کا خیال اُس طرف رجوع تھا کیا اُس کا ارادہ ہے کہ اپنی تمام عزت و قدر کھو دے"

اسی ایڈیٹر کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں "میں دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ اپنے اخبار کو مہذب بنائیں، بدگو کے ساتھ گر بدگوئی کی تو دونوں برابر ہو جاتے ہیں، میری نسبت لوگ کیا کیا کچھ نہیں لکھتے ہیں؛ کیا مجھے لکھنا نہیں آتا؛ ہندوستانی ریاستیں ہندوستان میں غنیمت ہیں ہمیشہ اُنکے ساتھ دوستانہ برتاؤ چاہیئے"

ایک دفعہ منشی سراج الدین احمد اڈیٹر سرمور گزٹ نے اپنے اخبار میں ریاست بہاول پور کی شکایت لکھدی کہ وہاں سے علیگڑھ کالج کے لیے کچھ چندہ نہیں پہنچا۔ سرسید نے فوراً اُن کو متنبہ کیا اور لکھا کہ "سرکار بہاول پور نے دو دفعہ ہزار ہزار روپیہ کالج کے لیے اور چند روز ہوئے کہ ایک ہزار روپیہ واسطے تعمیر مسجد کے مرحمت کیا ہے۔ چونکہ اس کی اطلاع آپ کو ضروری تھی اس لیے فی الفور یہ مختصر نیاز نامہ روانہ کرتا ہوں۔"

الغرض اُس کے تمام جذبات اور تمام ہِمّتں ایک قومی ہمدردی کے جوش میں بالکل جذب ہو گئے تھے، اس کا غصہ تھا تو قوم کے لیے، شکایت تھی تو قوم کے لیے، حرص وطمع تھی تو قوم کے لیے اور خود غرضی تھی تو قوم کے لیے، اپنے لیے کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

خود غرضی کا الزام

سرسید پر اکثر خود غرضی کا الزام لگایا گیا ہے۔ بے شک خود غرضی کو اگر زیادہ وسیع معنوں میں لیا جائے تو ایک لحاظ سے اُن کو خود غرض کہا جا سکتا ہے۔ جو عظیم الشان کام انھوں نے قوم کی ترقی کے لیے اختیار کیا تھا اور جس کے بغیر وہ قوم کی حالت کا درست ہونا غیر ممکن سمجھتے تھے بلاشبہ اُن کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمان یک دل و یک جان ہو کر اپنی تمام ہمت

طاقت اور استطاعت اُس کام کے پورا کرنے میں صرف کر دیا اور جب تک اُس کو منتہائے ترقی تک نہ پہنچا لیں دوسرے کام کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں یہاں ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ اُن کی یہ خواہش ممکن الوقوع تھی یا نہیں؟ اور آیا فی الواقع جیسا کہ وہ سمجھتے تھے مسلمانوں کی بھلائی کا صرف یہی ایک رستہ تھا کہ سب مل کر اُن کے کام میں مدد کریں؛ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ اگر اسی کا نام خود غرضی ہے تو ہم کو اپنی قوم کی بہبودی کے لیے ایسے بہت سے خود غرضوں کی ضرورت ہے، اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں ایسے دس بیس بلکہ دو چار خود غرض بھی اور پیدا ہو جائیں تو ساری قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔ دنیا میں ایسے نیک آدمیوں کی کچھ کمی نہیں ہے جو ہر ایک کے کام میں مدد دینے اور ہر جگہ گاڑی میں کندھا لگانے کو موجود ہیں، لیکن ایسے افراد صدیوں اور قرنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں جو تمام دنیا کو اپنا معاون و مددگار بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اُن کو اپنے کام کی برائی کا ایسا یقین ہوتا ہے کہ اُس کو تمام دنیا کے کاموں سے مقدم جانتے ہیں اور چونکہ اور لوگ بھی جوں جوں اُن کے کام کی حقیقت کھلتی جاتی ہے، اس کو ویسا ہی یقین کرتے جاتے ہیں اس لیے اُن کے دل میں اپنے کام کی عظمت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

حُبّ جاہ کا الزام

بعض اصحاب یہ بھی فرماتے ہیں کہ سید احمد خاں نے جو کچھ قوم کی خیرخواہی کے پردہ میں کیا اُس سے محض اپنی ناموری اور شہرت اور گورنمنٹ میں اعزاز حاصل کرنا مقصود تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حسرت میں مرے جاتے ہیں کہ ہم کو بھی ویسی ہی ناموری اور اعزاز حاصل ہو جائے مگر چونکہ اس کا استحقاق نہیں رکھتے

اس لیے کبھی اپنی مراد کو نہیں پہنچتے۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت چاہنے سے عزت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عزت کے لائق کام کرنے سے عزت حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ قوم کی خیر خواہی کی آڑ میں اپنی شہرت اور اعزاز چاہتے ہیں، نہ اُن سے قوم کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود اُن کو شہرت اور عزت نصیب ہوتی ہے لیکن جو شخص سچے دل سے قوم کی بھلائی کے کام کرتا ہے عام اس سے کہ وہ اپنی شہرت و عزت کا خواہاں ہو یا نہ ہو، وہ قوم کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور خود بھی شہرت و عزت حاصل کرتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ " فَوِّضْ مَدْحَكَ وَذَمَّكَ اِلٰی اَفْعَالِكَ فَاِنَّهَا تَمْدَحُكَ بِصِدْقٍ اِنْ اَحْسَنْتَ وَتَذُمُّكَ بِحَقٍّ اِنْ اَسَأْتَ "[1]

جو لوگ سرسید کی نسبت ایسے پست خیالات رکھتے ہیں اُن کے جواب میں اُن سے زیادہ کہنا فضول ہے جو نواب عماد الملک نے سرسید کی دعوت کے جلسہ میں، جو نظام کلب حیدر آباد میں ۱۸۹۱ء میں منعقد ہوا تھا، کہا تھا کہ "کاش مسلمانوں میں سید احمد خاں کے سوا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لیے ایسے مفید کام کر کے دکھا دے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوتے ہیں"۔

اپنی رائے پر وثوق

منجملہ اور بڑے بڑے اوصاف کے ایک وصف جس کو سرسید کے تمام کارہائے نمایاں کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ اُن میں یہ تھا کہ اُن کو اپنی ہر ایک

---

[1] یعنی اپنی تعریف اور مذمت اپنے کاموں کو سونپ دو کیونکہ وہی تمہاری بھلائی کے سچے مداح اور تمہاری برائی کے سچے مذمت کرنے والے ہیں ۱۲۔

راے پر خواہ مذہبی مسائل سے متعلق ہو اور خواہ کسی اور معاملہ سے ہمیشہ ایسا وثوق معلوم ہوتا تھا کہ کسی دلیل یا برہان یا مخالف پارٹی کی مجارٹی سے اُس میں تزلزل آنے والا نہیں۔ اسی لیے اُن کو عموماً خود راے اور ہٹیلا کہا جاتا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اُن کی ہر ایک راے جس پر اُن کو اصرار ہوتا تھا ہمیشہ صائب اور غلطی کے پاک نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر اُن کو اپنی رایوں پر ایسا وثوق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا نہ ہوتا تو جو بڑے بڑے کام اُن سے بن آئے اُن میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ انھوں نے قوم کی بھلائی کے لیے جتنے کام اٹھائے وہ سب قوم کے خیالات سے بالاتر اور اُن کی سمجھ سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ ولایت میں جیسا کہ اُن کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے، وہ اپنے منصوبوں سے سید مہدی علی خاں کے سوا اپنے اور دوستوں کو بہت کم مطلع کرتے تھے کیونکہ کسی سے یہ امید نہ تھی کہ اُن کی راے سے اتفاق کرے گا اور اُن کی ہمت بندھائے گا۔ پھر جب ہندوستان میں آ کر انھوں نے اپنے منصوبے علی الاعلان پورے کرنے کا ارادہ کیا تو جیسا اُن کو خیال تھا، ہزاروں مخالف کھڑے ہو گئے اور جہاں تک ہو سکا اُن کے کاموں میں کھنڈت ڈالی۔ باوجود اس کے ہر ایک کام میں اُن کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ مخالفتیں روز بروز کم ہوتی گئیں اور آخر کار اُن کے کام نہایت عظمت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ اگر اُن کی رائیں متزلزل ہوتیں اور اُن کو اپنی تجویزوں اور منصوبوں پر کامل وثوق نہ ہوتا تو کیونکر ایسے کاموں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہو سکتی تھی جن کا سارا زمانہ مخالف ہو، اور کیونکر اُن کی کوششیں اس درجہ تک کامیاب ہو سکتی تھیں۔ پھر جس قدر اُن کی تجویزیں اور منصوبے پورے ہوتے گئے اور جس قدر لوگوں کی مخالفت بیجا اور ناواجب ثابت ہوتی گئی اسی قدر

اُن کو اپنی رایوں پر زیادہ وثوق ہوتا گیا اور اپنی ہر ایک رائے پر اُن کا اصرار روز بروز بڑھتا گیا۔ اب چاہو اس خصلت کو اُن کی خود رائی اور ہٹیلے پن کے ساتھ تعبیر کرو اور چاہو یہ سمجھو کہ دنیا میں جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں اور جن سے مخلوق کو عظیم الشان فائدے پہنچے ہیں وہ سب ایسے ہی قوی اور مضبوط دل والے تھے کہ جو ارادہ کرتے تھے اس پر ثابت قدم رہتے تھے اور جو منصوبہ باندھتے تھے اُس کو پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ اُن کی رائیں مستقل اور غیر متزلزل ہوتی تھیں، وہ اپنی غلط رایوں پر بھی ویسا ہی اصرار کرتے تھے جیسا صحیح رایوں پر، کیونکہ وہ اُنھیں رایوں کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے۔

باایں ہمہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ اُن کو اپنی رایوں پر تھا وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سُن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے! ہرچند کہ اُن کے دوست اُن تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔ کالج کے متعلق بھی اخیر زمانہ میں اُن سے بعض امور ایسے سرزد ہوئے جن کو لوگ تعجب سے دیکھتے تھے مگر درحقیقت ان میں سے کوئی بات بھی تعجب کے قابل نہ تھی۔ جو حیرت انگیز کامیابی باوجود سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے سرسید کو اپنے مقاصد میں ہوئی اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں جو کہ قوائے کے انحطاط اور فتور کا زمانہ تھا، اُن کو اپنی صائب رائے پر جتنا کہ چاہیے تھا اُس سے زیادہ اعتماد ہو جائے اور وہ اپنی عقل اور سمجھ کو خطا اور غلطی سے پاک سمجھنے لگیں اس کے سوا اخیر عمر کے صدمات نے بھی اُن کے دل و دماغ پر کچھ کم اثر نہیں کیا تھا۔ قطع نظر اس کے انسان کا

منتہائے کمال یہ ہے کہ اُس میں عیب کم اور خوبیاں زیادہ ہوں، نہ یہ کہ وہ عیبوں سے بالکل پاک ہو۔ پس سرسید میں باوجود بے شمار خوبیوں اور حیرت انگیز اوصاف کے اس قسم کی کمزوریوں کا پایا جانا بجائے اس کے کہ اُن کے اخلاقی نقص کی دلیل ہو، اُن کے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی فضیلت اور کاملیت پر دلالت کرتا ہے۔ گویا شاعر نے سرسید ہی کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

"شخص الانام الی کمالک فاستعذ　　من ان تراعینھم بعیب واحد"

(یعنی تیرے کمالات دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں سو اُن کی نظر بد سے بچنے کے لیے کسی عیب کی پناہ لے۔)

مذہب

سرسید کی مذہبی خدمات و اصلاحات اور مذہبی تحقیقات کے متعلق جو کچھ اُن کی تصنیفات سے ثابت ہوا، بقدر ضرورت بیان ہو چکا ہے یہاں ہم اُنکے وہ مذہبی خیالات دکھانے چاہتے ہیں جو اُنھوں نے اپنے پرائیوٹ خطوں میں یا کسی پبلک تقریر میں ظاہر کیے ہیں اور جن سے ان کے دل کی اصلی کیفیت اور اصلی واردات منکشف ہوتے ہیں، کیونکہ تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بعد غور و خوض کے تمام پہلو اور جوانب دیکھ کر لکھا جاتا ہے۔ اور جہاں تک مصنف کے امکان میں ہوتا ہے وہ اپنی تصنیف کو کم سے کم اُن لوگوں کی نکتہ چینی سے بچانے میں ضرور کوشش کرتا ہے جن کو وہ اپنے نزدیک مخاطب صحیح جانتا ہے۔ برخلاف اس کے پرائیوٹ خطوط جو وہ اپنے محرم اور ہمراز دوستوں کو لکھتا ہے اور پبلک تقریریں جن میں سوچنے اور غور کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے اُن سے اُس کے دل

کی ننگی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اُس کے دلی خیالات روزِ روشن کی طرح سب پر ظاہر ہو سکتے ہیں پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مذہبی خیالات جو کُھلے ڈُھلے طور پر انھوں نے اپنے رازدار دوستوں کو لکھے ہیں یا کسی پبلک جلسہ میں بے ساختہ اور بداہتہً ظاہر کیے ہیں یا جو ایسے ہی کسی اور طریق سے ہم تک پہنچے ہیں اس عنوان میں کسی قدر ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں۔

حقیت اسلام کا یقین

جہاں تک کہ سرسید کے اقوال اور افعال اور خیالات سے استدلال ہو سکتا ہے اُن کو دینِ اسلام کی حقیت پر ایسا یقین معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات اور مذہبی عقائد مسلمانوں کے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور عقائد کے تابع نہ تھے مگر اُن کا ایک عقیدہ بھی شاید ایسا نہ نکلے گا جو اصولاً کسی نہ کسی اسلامی فرقہ کے عقیدہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اُن کو اہلِ سنت کی قدیم اصطلاح کے موافق زیادہ سے زیادہ مبتدع کہا جا سکتا ہے جیسا کہ اکثر اکابرِ اسلام کو کہا گیا ہے۔ لیکن اُن کی نسبت کافر یا ملحد یا نیچری یعنی نیچرلسٹ کہنا اُسی قسم کا بہتان ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر مذہب میں محققوں اور مصلحوں پر کیا گیا ہے۔

انھوں نے جو لکچر ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا اُس میں اپنے عقائد صاف صاف بیان کیے تھے۔ اس لیے اول ہم اُس لکچر کے چند مقامات اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ لیکن ہر ایک عقیدے کے ساتھ جو کچھ انھوں نے بطور دلیل کے بیان کیا ہے اُس کو اُن کے لکچر میں دیکھنا چاہیے۔

اول انھوں نے کہا کہ "میں ایک جاہل آدمی ہوں نہ مولوی ہوں نہ مفتی

نہ قاضی اور نہ واعظ، نہ میری یہ خواہش ہے کہ کوئی شخص گودہ یراکیسا ہی دوست ہو، وہ میرے خیالات کی پیروی کرے۔ سب رسولوں کے سوا کسی شخص کا اب منصب نہیں سمجھتا کہ ان باتوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جن کو مذہب کہتے ہیں، وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسول خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کا ازلی مذہب خدا ابدالآباد تک قائم رکھے اور ضرور قائم رکھے گا کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے، ختم ہو گیا۔"

توحید

پھر کہا کہ "وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جا سکتا ہے وہ خدا کی توحید ہے۔ جو شخص خدا کو برحق جانتا ہے اور اس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ یہی رکن اول اور رکن اعظم اسلام کا ہے اور باقی ارکان اس کے تحت میں اور اس کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کسی خاص دوا کی معجون ہو اور اسی کے ساتھ اس کے اجزا بھی ملے ہوئے ہوں۔ خدا کو واحد مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین کرنا۔ اسلام ہے اور جو اس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔"

پھر کہا کہ "خدا پر اور خدا کی وحدانیت پر اس وقت یقین ہو سکتا ہے جب اس کی ذات اور صفات پر جو حقیقت میں متحد ہیں اور اسی کے استحقاق عبادت پر جو اس کو لازم ہے، پورا پورا یقین ہو، اس کی ذات کا یقین تو اس کے موجود بالذات ازلی و ابدی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے پر یقین ہوتا ہے۔ اس کی صفات کا یقین اس کے مانند صفات کا کسی دوسرے میں نہ ہونے

پر یقین کرنا ہے۔ تمام صفتیں جو خدا سے منسوب کی جاتی ہیں، عالم، رحیم، حی اور مثل ان کے اور جو اُن کا مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے اور جن میں اوروں کا اشتراک بھی بوجہ متصور ہوتا ہے اُس مفہوم سے اور اُس اشتراک سے بھی خدا کی صفات کو مُبّرا اور منزہ ماننا اس کی صفات پر یقین ہونا ہے اس کے استحقاق عبادت پر یقین یہ ہے کہ کوئی شے سوا خدا کے مستحق عبادت نہیں جو شخص کہ اس طرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے .....

رسالت

ہاں ایسے شخص کی نسبت جو صرف خدائے واحد کو مانتا ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں..... محمدی ہونے کے لیے ضرور ہے کہ ہم اس شخص پر بھی جس نے ہم کو توحید کی نعمت دی..... جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا اور اس کی صفات کو پہچانا یقین کریں۔ خود عقل ہی ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جس سے ہم کو ہدایت ہوئی کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے ہادی ہونے پر یقین نہ کریں اسلام جس کو میں نے ایسے استحکام سے سچا بنایا اس کی ہدایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ پس اس کی تصدیق بالفرض دوسرا رکن اسلام کا ہے جو پہلے رکن سے منفک نہیں ہو سکتا۔"

"اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہے جو شخص خدا کو مانتا ہے اور وحدہٗ لاشریک جانتا ہے اور اس پہ یقین رکھتا ہے اور کسی نبی کی تصدیق نہیں کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تصدیق نہیں کرتا اس کی نسبت یہ کہنا کہ محمدی نہیں یا مرادف معنی سے کر یہ کہنا کہ وہ مسلمان نہیں، بالکل صحیح ہے مگر اس کو کافر بمعنی مشرک کہنا یا موحد نہ کہنا اسلام کے اصول کی رو سے درست

نہیں..... موحدین محض کے مخلد فی النار ہونے یا نہ ہونے پر قدیم سے علما میں بحث چلی آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مخلد فی النار ہوں گے، کوئی کہتا ہے کہ بعد عذاب کے نجات پاویں گے۔ اس بحث کو انھیں عالموں کے لیے چھوڑ دو اور ہم کو اپنے حبیب کے اس قول پر رہنے دو کہ "علیٰ رغم انف ابی ذر" [1]"

فرائض منصوصہ

پھر کہا کہ "وحدانیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور چیزیں بھی اسلام کے ساتھ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔ ان فرائض کے ادا نہ کرنے والے کو ہم گنہگار اور ان کے منکر کی نسبت وہی کہیں گے جو رسالت کے منکر کی نسبت کہا ہے کہ وہ محمدی نہیں یا بمعنی مرادف مسلمان نہیں۔ اس کے مخلد فی النار ہونے یا نہ ہونے کی وہی بحث پیش آ جاتی ہے جو ابھی موحد محض کی نسبت میں نے بیان کی۔"

شرک فی النبوۃ

پھر کہا کہ "شرک کی بحث جو کہ اسلام کا پورا دشمن ہے اور جس کے ساتھ اسلام جمع ہی نہیں ہو سکتا، بہت بڑی ہے، مگر میں اس وقت ایک شمہ اس کا

---

[1] یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے ابوذر غفاری سے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرت نے ابوذر سے فرمایا "مامن عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذلک الا دخل الجنۃ" انھوں نے یہ سن کر دو بارہ از راہ تعجب یہ الفاظ عرض کیے کہ "وان زنی وان سرق"، اور آپ نے فرمایا کہ "وان زنی وان سرق" اور تیسری دفعہ اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ "علیٰ رغم انف ابی ذر" ۱۲

بیان کروں گا۔ جس طرح خدا کو اپنی ذات و صفات میں وحدت ہے اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے قرار دینے میں وحدت ہے اور کسی کو اس میں شرکت نہیں پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اسی کی تابعداری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو میں شرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں۔ خدا نے یہود و نصاریٰ دونوں کو اسی بات پر ملزم ٹھیرا کر فرمایا "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ"۔ پس اس طرح کی پیروی اربابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہ تک پہنچا دیتی ہے۔

ائمۂ مجتہدین

میری اس تقریر سے آپ یہ تصور نہ کریں کہ میں ائمۂ مجتہدین کے برخلاف رائے رکھتا ہوں۔ نہیں، میں اُن کو اُمت کا سرتاج اور اُن کے اجتہادوں اور اختلافوں کو باعث رحمت سمجھتا ہوں۔

مقلدین

یہ بھی آپ خیال نہ کریں کہ میں اُن کے پیرو مقلدین کو بُرا کہتا ہوں یا تقلید کو بُرا جانتا ہوں مگر اس قدر ضرور سمجھتا ہوں کہ مقلدین کے بعض افعال اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ انھوں نے اپنی غلطی سے نہ کہ اُن کی تقلید سے اُن کو اربابًا من دون اللہ تک پہنچا دیا ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ تقلید کے برخلاف ہیں اور عدم تقلید کے مسئلہ کی پیروی کرتے ہیں اور اُس کے اجرا میں کوشش کرنی چاہتے ہیں اُن کی بھی میں عزت کرتا ہوں۔

غیر مقلدین

میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کا مقصود ایک ہے اور دونوں خدا اور رسول کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں فرقوں کے سبب باہم رنج و عداوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ شیطان کے وسوسے ہیں جو گروہ اسلام کو متفرق کرنے اور قوت کو ضعیف کرنے کی فکر میں ہے۔ حقیقت میں اسلام لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اور اس پر دل سے یقین رکھنا اور سب کلمہ گویاں کو بھائی سمجھنا ہے۔ باہمی اختلاف کی وجہ سے اسلام کے مجمع کو متفرق کرنا اصول اسلام کے برخلاف ہے اور اس برکت کی ناشکری ہے جو خدا نے دی ہے اور جس کو فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔"

نبوت پر استدلال

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مندرجۂ ذیل تقریر کی "ایک ایسے شخص نے جو ریتیلے کنکریلے ملک میں پیدا ہوا، جو چھوٹی عمر میں یتیم ہوگیا، جس نے نہ کسی دار العلم میں تعلیم پائی نہ سقراط اور بقراط اور افلاطون کے مسائل کو سنا نہ کسی اُستاد کے سامنے تعلیم کو بیٹھا، نہ حکما اور فلاسفروں اور پولیٹکل و نیچرل سائنس کے عالموں کی صحبت اٹھائی، بلکہ چالیس برس اپنی زندگی کے ناتربیت یافتہ اور بداخلاق اونٹ چرانے والوں میں بسر کیے، چالیس برس تک بجز ایسی قوم کے جو بت پرستی اور باہمی جنگ و جدال میں مبتلا تھی اور چوری اور زناکاری پر عورت و مرد کو فخر تھا اور کسی کو نہیں دیکھا، وہ دفعتہً اپنی تمام قوم کے برخلاف اٹھا، چاروں طرف سے وہ بت پرستی میں گھرا ہوا تھا مگر اس نے کہا تو یہ کہا کہ لا الٰہ الا اللہ

اس نے صرف یہ کہا ہی نہیں بلکہ تمام قوم سے بھی جو سیکڑوں برس سے لات و منات و عزّے کو پوجتی آتی تھی۔ یہی کہوا دیا، اُن تمام بداخلاقیوں اور تمام بورسل عادتوں کو تمام قوم سے چھڑوا دیا۔ بتوں کو زمین پر گروایا، اُن کو تڑوایا اور خدا کے نام اور خدا کی پرستش کو تمام عرب کے جزیرہ تمامیں بلند کیا۔ وہ جزیرہ جو بابراہیم اور اسمٰعیل کے بعد سے ہزاروں ناپاکیوں سے ناپاک ہوگیا تھا پھر اُس کو اُس کی اصلی پاکی اور دین ابراہیم کی بزرگی تک پہنچا دیا۔ چالیس برس بعد کس نے یہ نور اُس کے دل میں ڈالا؛ جس نے نہ صرف جزیرۂ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو روشن کر دیا۔"

"اس نے لا الہ الا اللہ کی تعلیم کے بعد جو احکام دین کے اور اخلاق کے لوگوں کو بتائے کیا کوئی فلاسفر اس سے زیادہ بتا سکتا تھا جو اس اُمّی نے بتائے صرف بتائے ہی نہیں بلکہ اپنے پاک دل، اپنی پاک زبان کے اثر سے لوگوں کے دلوں میں بٹھلا دیئے۔ یہ کام وہ تھا جو نہ کسی فلاسفر سے ہوسکتا تھا نہ کسی سلطان مقتدر سے۔

پھر کیا چیز اُس بچہ میں تھی جس نے جزیرۂ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو خدائی کا کرشمہ دکھلا دیا؟ کوئی سخت سے سخت دہریہ اور لامذہب بھی اگر ایسے شخص کو معاذ اللہ نبی نہ مانے گا تو اس کو یہ ماننا تو ضرور پڑے گا کہ اگر بعد خدا کے کوئی دوسرا شخص بزرگ ہے تو یہی ہے۔ روحی فداک یا رسول اللہ۔ پس جو شخص نبوت کی حقیقت کو سمجھے گا تو امکان سے خارج ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق نہ کرے۔"

اعجاز قرآن

پھر قرآن کے معجز ہونے پر مندرجۂ ذیل تقریر کی "قرآن مجید جو تیرہ

سو برس سے معجز یقین کیا جاتا ہے میں بھی معجز مانتا ہوں مگر ہمارے قدما نے صرف ایک ادری دلیل اُس کے معجز ہونے کی قرار دی تھی۔ یعنی فصاحت اور کلام کی عمدگی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ آج تک کسی بشر سے نہ کسی فصیح و بلیغ سے اُس کی ایک یا دس آیتوں کے برابر بھی ویسا فصیح کلام نہیں کہا گیا۔ باوجودیکہ اُن سے بطور مقابلہ کے کہا گیا کہ اگر کہہ سکتے ہو تو کہہ لاؤ۔ بلاشبہ میں بھی قرآن مجید کو ایسا ہی فصیح و بلیغ تسلیم کرتا ہوں...... لیکن یہ دلیل...... ایسی نہیں ہے جو غیر معتقد لوگوں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہو اور اُن کے دل کو تسلی دے سکتی ہو۔ میں ایک اور دلیل رکھتا ہوں جس کو میں اس دلیل سے زیادہ مضبوط سمجھتا ہوں۔ وہ دلیل کیا ہے ؟ وہ ہدایتیں انسان کے لیے ہیں جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی اور ہدایت اس کے مثل بے شک نہیں ہو سکتی۔ میں اس کو بھی معجزہ بلکہ اصلی معجزہ قرآن مجید کا سمجھتا ہوں۔"

وہ قرآن مجید اُس زمانہ میں نازل ہوا جو جاہلوں اور ناواقفوں اور ناتربیت یافتہ لوگوں کا زمانہ تھا، وہ اس زمانے کے جاہل لوگوں کی ہدایت کے لیے بھی تھا اور اُن اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ہدایت کے لیے بھی تھا جو اُس وقت کی دنیا میں تھے اور جو آئندہ دنیا میں ہونے والے تھے، ضرور تھا کہ اُس کی ہدایتیں اس طرح پر بیان کی جائیں کہ اُس سے ایک صحرائی اونٹ چرانے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سقراط اور بقراط دونوں برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآن مجید ہی صرف ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے اور جس سے مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کو یکساں ہدایت ہوتی ہے۔ ایک جاہل بدو، ایک مقدس مولوی اُس کے لفظی معنوں سے جیسی ہدایت پاتا ہے ایسا ہی ایک فلاسفر انھیں الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے۔

اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفہ سے خلاف نہیں پاتا۔ کسی زبان میں، فرنچ، لیٹن عربی فارسی، سنسکرت وغیرہ میں کوئی ایسی کتاب لکھ دو یا اگلے زمانے کی لکھی ہوئی بتا دو جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین فلسفہ اور حکمت کے بھرے ہوئے ہوں اور پھر نہایت دلکش اور سہل الفاظ میں اور پھر اُس سے جاہل اور عالم عامی اور فلسفی سب کو یکساں فائدہ حاصل ہو اور سب کے دل پر یکساں اثر ڈالے نہایت ناممکن ہے۔ مگر قرآن مجید ہی ہے جس میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور یہی اس کا اصلی اور سچا اور واقعی معجزہ ہے۔ اس کے مسائل جیسے اُس زمانہ میں سچے تھے جب کہ زمین ساکن مانی جاتی تھی ویسے ہی اب بھی سچے اور قابل تسکین ہیں جبکہ سورج ساکن اور زمین گھومتی مانی جاتی ہے۔ اور یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانے میں سچی مانی جاتی ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو، جیسے یونانی حکمت اب غلط ثابت ہوئی ہے، اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ویسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔"

فرائض منصوصہ

پھر نماز روزہ وغیرہ کی نسبت اس طرح بیان کیا "غیر مشتبہ منصوص مسائل جیسے نماز روزہ حج اور زکوٰۃ ہیں اور جو خدا تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرض بتائے ہیں، اُن کو میں بھی اسی طرح فرض سمجھتا ہوں جیسے ایک جاہل مسلمان یقین کرتا ہے۔ لیکن جب اُن پر مخالف کا حملہ ہوتا ہے تو ان کی لمیت اور اصلیت بتانی ضرور پڑتی ہے، اگر یہ بحث پیش ہو کہ ہاتھ منہ دھونے کو

(یعنی وضو کو) عبادت سے جس کا تعلق دل سے ہے، کیا تعلق سبب ہے! حدث کے بعد بے محل منہ میں کلی کرنے سے کیا تعلق ہے! نماز کو جو ایک روحانی فعل ہے اٹھنے بیٹھنے سر نیچا اور سرین اونچے کرنے سے کیا علاقہ ہے؛ تو یہ مجبوری ہم کو اس کی اصلیت اور نماز کے ارکان کی لمیت پر بحث کرنی ہوگی اور سمجھانا پڑے گا کہ وضو کیوں فرض کیا گیا ہے! اور نماز کے ارکان کیوں قرار پائے ہیں۔"

دین اسلام

پھر دین اسلام کی نسبت اس طرح بیان کیا، "میرا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام ایک مکمل اور آخری مذہب ہے۔ مجھ کو خدا کے اس قول پر یقین کامل ہے کہ "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا" مگر جب مفسرین (خدا ان پر رحمت کرے) اس تکمیل کے یہ معنی بتائیں کہ خدا نے فلاں جانور کو حلال اور فلاں جانور کو حرام بتا کر دین کو کامل کر دیا ہے تو میں ان سے مخالفت کرتا ہوں گو کہ وہ فخر الدین رازی ہوں، یا ملا علی نیشا پوری ہوں۔ یا ان سے بڑھ کر اور کوئی۔ اور ان بزرگوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ جناب اگر یہی معنی تکمیل دین کے ہیں تو سلام! میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر غلط ہے۔ دین اسلام خدا کی توحید کے کامل طور پر بتانے سے، اس کے ہر ایک فروع و اصول کو روشن کر دینے سے مکمل ہوا ہے یہی تکمیل دین کی ہے اور اسی تکمیل کے سبب وہ آخری دین ہے اور اسی تکمیل کے سبب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی بغیر تبدیل کے قائم رہے گا۔"

حمایت اسلام کی وجہ

پھر لکچر کے اختتام پر یہ الفاظ کہے کہ "جو تائید اسلام کی میں نے اپنی نسبت میں اختیار کی ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور خواہ نخواہ مجھ کو اسلام کی تائید کرنی چاہیے۔ میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا۔ جو شخص جس مذہب میں پیدا ہوا ہے خاموشی سے اُس میں چلے جانا دوسری بات ہے اور اُس کی تائید پر مستعد ہونا دوسری بات ہے۔ پچھلی بات اس شخص کو زیبا نہیں ہے جس نے پورا یقین اُس پر خود نہ کر لیا ہو۔ میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور کی ہے اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس بات کا یقین ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے اور میں اس دلی یقین پر اُس کی تائید کرتا ہوں نہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں۔"

یہاں تک سرسید کی اس تقریر کا خلاصہ تھا جس میں انھوں نے بمقام لاہور اسلام کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ اب ہم اُن کے بعض پرائیویٹ خطوط سے چند مقالات التقاط کرتے ہیں جو انھوں نے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوں میں کچھ تو وہ ہیں جو ہم کو منشی سراج الدین احمد کے مسودات میں دستیاب ہوئے ہیں اور کچھ ہم نے اور ذریعوں سے بہم پہنچائے ہیں۔

حقیت اسلام کا یقین

اگرچہ سرسید عام لوگوں کے کافر و ملحد کہنے سے کچھ ناراض نہ ہوتے

تھے مگر جو لوگ اُن کے حالات سے بخوبی واقف تھے اگر وہ اُن کی نسبت ایسا خیال بھی کرتے تھے تو ان کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ جب وہ ہندوستان سے ولایت جانے کو تھے ایک خط حکیم غلام نجف خاں مرحوم نے جن کے ساتھ ان کی اور ان کے بڑے بھائی کی دوستی اخوت کے درجہ تک پہنچ گئی تھی ان کے پاس بھیجا تھا جس میں غالباً اس قسم کی کوئی بات ہوگی کہ ولایت جاکر مذہب کو نہ چھوڑ دینا یا عیسائی نہ بن جانا۔ انھوں نے ولایت پہنچ کر اس کا یہ جواب بھیجا:

"حامد نے آپ کا عنایت نامہ مجھے دیا تھا میں نے خیال کیا تھا کہ جب میں ولایت سے پھر کر آؤں گا اور آپ سے انشاء اللہ تعالےٰ ملوں گا اسی وقت جواب دوں گا۔ حقیقت میں وہ عنایت نامہ محبت آمیز ہنسی کی بات تھی، نہ جواب لکھنے کے لائق۔ اگرچہ میں یقینی سمجھتا تھا کہ آپ کے خیالات وہی قدیم پرانے دقیانوسی ہندوستانیوں کے سے ہیں، حال کے زمانے کی جو باتیں ہیں نہ وہ ذہن میں آتی ہیں اور نہ پسند ہوتی ہیں، مگر خاص جس امر کی نسبت آپ نے مجھے لکھا اس کا نہایت تعجب ہے اس لیے کہ میری نسبت اس قسم کے خیالات کی البتہ جاہل ناواقف آدمی کو گنجائش ہو سکتی ہے یا دشمن و حاسد جو کچھ چاہیں خیال کر سکتے ہیں، مگر آپ کو اس قسم کا خیال کیوں ہوا؟ شاید بمقتضائے محبت ایسا خیال ہوا ہو اس لیے کہ دوست کو ہمیشہ برے برے خیالات گزرتے ہیں جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں اس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی داڑھی والوں کو اور ہزار ہزار دانہ کی تسبیح والوں کو اور جو مکہ و مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشدی کا جبّہ و دستارے کر آتے ہیں اُن کو بھی نہیں ہے۔ والسلام"

تقلید کی مخالفت

ایک خط میں سید مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں۔ "میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا، اور میں خود تحقیقاتِ حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔ فرض کرو کہ تقلید چھوڑتے میں کسی مسئلہ یا عقیدہ میں غلطی میں پڑوں چنداں نقصان نہیں۔ مسلمان تو رہوں گا..... جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے وہ کوئی معمّا اور بدر چاچ کا شعر نہیں جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسین معمائی درکار ہوں۔ خدا فرماتا ہے۔" ھوالذی بعث فی الامّیین رسولاً منھم ذرا مہربانی سے قرآن کھول کر ملاحظہ فرمایئے اُس میں یہی لفظ ہیں یا بجائے اُن کے یہ الفاظ ہیں۔ "ھوالذی بعث فی الغنسفیین رسولاً"۔

تقلید کی مخالفت

ایک اور خط میں لکھتے ہیں، " بھائی جان سنو! اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنے مکنوناتِ ضمیر کو مخفی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید[1] نہ چھوڑیں گے اور خاص اُس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر

---

[1] یہاں تقلید سے مراد ہر امر میں سلف کی پیروی کرنا ہے نہ کہ تقلید مصطلح فقہا ۱۲۔

کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پروا نہیں کرتا، ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے ائمہ کبار تو درکنار مولوی جھٹو کی بھی تقلید کافی ہے لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کہہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں چاہتا ہوں کہ بدلائل و مباحثہ مجھ کو قائل کرو یا جائے کہ میری یہ رائے صحیح ہے یا غلط! اور میں دشمن اسلام ہوں یا مثل ابوبکرؓ اور عمرؓ کے دوست اسلام ہوں! آیا میں جو اسلام کو ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ سے زیادہ درست رکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ ابو حنیفہ اور شافعی تو درکنار، ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی بالفرض اگر کچھ غلطی کریں تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں ہو سکتا، اور میرا یہ اعتقاد کہ اگر تمام عالم کافر ہو جائے یا تمام عالم فرشتہ ہو جائے تو خدا کی خدائی میں کچھ زیادتی یا نقصان نہیں ہوتا، اسی طرح اسلام کے مسائل کا حال ہے کہ اگر تمام مجتہدین صواب پر ہوں یا خطا پر اصل اسلام کی جو روشنی ہے اس میں کچھ نقص نہیں ہے۔ پس یہ اعتقاد میرا صحیح ہے یا غلط؟"

پھر اسی خط میں لکھتے ہیں "لوگوں نے جو اخباروں میں مجھ کو بُرا بھلا لکھا اس سے آپ کو غصہ آ گیا، معلوم نہیں کہ آپ نے آرٹیکل میں کیا لکھا ہو گا! مگر مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے، میں تو ہدفِ تیرہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میرے دلسوزی کی قدر کریں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ شخصِ اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ دسہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علما کو مثل یہود و نصاریٰ

کے ارباباً من دون اللہ سمجھ لیا ہے خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچانے آمین! اور میرے دوستوں کو اور مولوی مہدی علی میرے پیارے دوست کو سب سے پہلے آمین ثم آمین ثم آمین "

تعصب

ایک اور خط میں لکھتے ہیں " تعصب خود بر خلاف شریعت ہے، ہندوستان کے مسلمان اس میں گرفتار ہیں، خدا کی نامہربانی اُن کی طرف رجوع ہے .... پھر اس کا علاج کیا ہے! خدا کے ساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں جو کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اور ہر روز چھپتی ہیں اور بکتی ہیں اُن میں جو حالات مسلمانوں کے لکھے جاتے ہیں اُن کو دیکھ کر مر جاتے کو دل چاہتا ہے۔ بہت سی باتیں اُن میں بلاشبہ صحیح ہیں اور درحقیقت ہم نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے اسلام کو بدنامی ہے ...... میرے صرف ایک لفظ لکھنے سے کہ "میدان ہیں " نالائقوں کو اس قدر طیش کھانے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے اور انگریزی اخباروں اور تاریخوں میں جو روا صاف چھپ رہے ہیں اُن سے کسی کمبخت کو غیرت نہیں آتی "

اسلام کی حمایت

ایک اور خط میں خطبات احمدیہ کے بعض مضامین کے متعلق لکھتے ہیں "افسوس صد افسوس ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو ایسی لغو اور مہمل کہانیوں میں ڈال دیا ہے اور جب کوئی چاہتا ہے کہ اس کی تحقیقات اور اُس پر غور کیا جائے تو اُس کو کافر، لامذہب، مرتد، عیسائی، حرام خور مری مرغی کھانے والا بتاتے ہیں "

"آیہ یاتی من بعدی اسمہ احمد کا نہایت عمدہ بیان مسٹر گنز نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور بخوبی بجنسہ اس آیت کا موجود ہونا انجیل یوحنا میں ثابت کیا ہے اور وہ وہی مشہور لفظ فارقلیط کا ہے مگر جس طرح پر کہ اس کو مسٹر گنز نے ثابت کیا ہے اس کو پڑھ کر مسلمان متعصب مولویوں کو غیرت کرنی چاہیے کہ جو کام اُن کے کرنے کا تھا اُس کو ایک غیر مذہب کے منصب شخص نے کیا ہے میں نے اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا، بعینہٖ مسٹر گنز کی تحریر نقل کر دی ہے۔"

"مگر ایک اور عمدہ بات میں نے یہ ثابت کی ہے کہ نام آنحضرت کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم توریت میں موجود ہے۔ چنانچہ عبری توریت میں وہ لفظ اور نشان شمائل آنحضرت کے بجنسہ نکالے ہیں مگر افسوس کہ اس پر بھی میں کافر ہوں اور یاران بادفروش وعظ گو مسلمان!! کیا انھوں نے خدا کو بھی اپنا ہی سا نابینا یقین کیا ہے! ..... میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر لوگ مجھ کو بُرا کہتے ہیں اگر خدا مجھے اُس پر صبر کامل عطا کرے تو میرے لیے ایک نہایت عمدہ زادِ راہ دوسری دنیا کے لیے ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے ایسا کس کا نصیب جس کو نہایت عمدہ زادِ راہ وہاں کے لیے ہاتھ آوے۔"

طیور منخنقہ اہل کتاب

ایک اور خط میں درباب طیور منخنقہ اہل کتاب کے لکھتے ہیں "جو کچھ غصہ آپ کو مجھ پر درباب گردن مروڑی ہوئی مرغی کے ہے وہ میری گردن پر، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علمائے ترکستان (یعنی ٹرکی) نے بلا کسی تامل کے اس کو جائز کیا ہے، تمام ترک جن کی خاک پا ہونے کی بھی ہم کو لیاقت نہیں ہے۔ سب بے تامل کھاتے ہیں۔ ایک بہت بڑے دیندار عالم نے جو ترکستان (یعنی ٹرکی) سے

آیا تھا اور ایسا سخت مذہب میں تھا کہ باوجود میرے اصرار کے فوٹو گراف کی تصویر کھچوانے سے انکار کیا، دربابِ گردن مروڑی مرغی کے مجھ سے کہا کہ "ھذا قصور النصاریٰ لاباس لنا فی کلہ قد احل اللہ لنا طعام اھل الکتاب" علاوہ اس کے جو شخص احتیاطاً اس کا مرتکب نہ ہو نہایت عمدہ بات ہے، مگر اس کو مسئلہ شرعی ٹھیرانا اور اس کے مرتکبین کو آکل حرام قرار دینا نہایت مضر اور اسلام کے پانو پر بدست خود تیشہ زدن ہے۔ اس فقرے کے معنی آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے انشاء اللہ تعالےٰ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہو کر اس کی تفسیر عرض کروں گا۔"

ایک شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ جو شخص منکر خدا ہو وہ بھی جیسے کہ بعض لوگ کہتے ہیں، مہذب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں سرسید لکھتے ہیں "سوائے توحید ذات باری تعالےٰ کے ماننے کے تہذیب نفس انسانی اور شایستگی حاصل نہیں ہو سکتی۔"

فضول مذہبی بحثوں سے اجتناب

سرسید مذہبی مسائل میں اُس میدان سے جس کو انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لیے لازم پکڑ لیا تھا، سرمو تجاوز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کوئی نبوت بلکہ خدائی کا بھی دعوے کرتا تو اُن کو اس کا رد لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا وہ اکثر معترضین کے حملوں یا اعتراضوں کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو فضول بحثوں سے جن سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہ ہو، ہمیشہ رد کتے رہتے تھے اور کبھی کسی ایسے مسئلہ سے تعرض نہ کرتے تھے جو اُن کے دائرہ کی حدود سے باہر ہو۔

ایک شخص نے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی نسبت جن کو صاحب الہام

اور مثیل مسیح ہونے کا دعوے ہے۔ ایک طول طویل خط سرسید کو لکھا۔ اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں۔" مخدومی ہر شخص یہاں تک کہ شہد کی مکھی بھی الہام کا دعویٰ کر سکتی ہے مگر اس کا نتیجہ کیا! اور کسی کو کسی کے الہام سے کیا فائدہ اور نقصان پہنچ سکتا ہے! ناداں ہیں وہ جو اُن سے جھگڑا کرتے ہیں۔ والسلام۔"

ایک اور شخص نے مرزا صاحب کے خیالات کی مخالفت میں کچھ لکھنے کا ارادہ سرسید سے ظاہر کیا اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں "آپ جو رسالہ نسبت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی لکھنا چاہتے ہیں کیا آپ کو بھی کچھ مالیخولیا ہو گیا ہے؟ اس لغو حرکت سے کچھ فائدہ نہیں اور مجھ کو ہرگز اس قدر فرصت نہیں ہے کہ نسبت حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے جو محض غلط روایات پر مبنی ہے، کچھ لکھوں۔"

منشی سراج الدین نے اُن سے دریافت کیا کہ گھر میں تصویر رکھنی کیسی ہے! اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "ان چیزوں کو موجودہ حالت میں بحث میں لانا مسلمانوں کی ترقی میں ہرج ڈالنا اور اُن کو متوحش اور زیادہ متنفر کرنا ہے۔ یہ امور نہایت جزئیات ہیں جن کی بحث سے ترقی تعلیم اور ترقی تہذیب میں ہرج پڑے گا، پس اس کو ہرگز بحث میں نہیں لانا چاہیے۔ پہلے امور معظم اور اصول کو راسخ کرنا چاہیے۔ تصاویر و تماثیل کے جائز و ناجائز ہونے کے دلائل موجود نہیں، اس کی نسبت فیصلہ کرنا اور ناجوازی و جواز کی وجہ بتانا نہایت دقیق اصول پر مبنی ہے۔ تصاویر کا رواج خود بخود ہوتا جاتا ہے۔ پس جو بیل کہ چل رہا ہے اُس کو آر مارنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔"

کسی نے سرسید کو بذریعہ تحریر کے اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب نے آپ کی مصنفہ کتابوں کو اپنے ایک شاگرد سے جو رئیس اعظم ہے چھین کر

آگ میں جلا دیا۔ سرسید اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "اُس کو یعنی مولوی کو اس عمل سے کیا فائدہ ہوا! اگر وہ ہمارے مطبع سے بہت سی کتابیں خرید کر جلاتا تو مطبع کو بھی فائدہ ہوتا اور اس کا بھی دل ٹھنڈا ہوتا"

مستورات کے پردہ کی نسبت اُن کی رائے تعلیم یافتہ جوانوں کے بالکل برخلاف تھی۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُن کی عورتیں منہ کھولے بے حجاب بازاروں میں پھریں۔ ایک دفعہ شاید مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنے اخبار میں اُن کی نسبت لکھ دیا تھا کہ وہ پردے کے مخالف ہیں۔ اس پر منشی سراج الدین نے اُن سے اس باب میں اُن کی رائے دریافت کی۔ سرسید اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتخصیص ہندوستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا۔ مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہنچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں، فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ کے منہ کو بھی پردے میں داخل کیا ہے۔ مولوی شرر نے میری نسبت غلط لکھ دیا ہے۔ شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہوگا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردہ میں داخل نہیں ہیں، اُن کو چاہیے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں"

ایک دفعہ کسی شخص نے مسئلۂ متعہ پر بحث کرتے ہوئے اخبار میں سرسید کی نسبت یہ لکھ دیا کہ اُن کی رائے ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ نے متعہ کیا ہے۔ انھوں نے فوراً اخبار نویس کو لکھا کہ "میرا ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ یا ائمۂ اطہار میں سے کسی ایک نے بھی متعہ کیا ہے"

سرسید سے جیسا کہ ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں۔ اکثر لوگ اُن مسائل

مذہبی کی نسبت رائے پوچھتے تھے جن پر آج کل نئے خیالات کے لوگوں کی توجہ مبذول ہے اور سرسید سب کام چھوڑ کر ایسے سوالات کا جواب فوراً لکھتے تھے۔

وبا سے بھاگنا

کسی نے اُن سے پوچھا کہ جہاں وبا ہو وہاں سے دوسری جگہ چلا جانا جائز ہے یا نہیں؛ اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "جس شہر میں وبا ہو وہاں سے چلا جانا وبا سے بچنے کو مع اس اعتقاد کے کہ اگر خدا نے اس فعل سے ہمارا وبا سے بچنا مقدر کیا ہے تو بچیں گے اور مقدر نہیں کیا تو باوجود چلے جانے کے نہیں بچیں گے خلاف شرع و احکام رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے۔ مذہب اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر کام کے لیے جو اسباب ہوں اُن اسباب کو فاعل حقیقی نہ سمجھے بلکہ فاعل حقیقی خدا کو سمجھے جو علۃ العلل تمام افعال و واقعات کا ہے...... جس طرح کہ آدمی امراض میں دوا کرتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ دوا مرض کے لیے مفید ہے مگر اس کے ساتھ ہی یقین کرتا ہے کہ اگر خدا نے صحت مقدر کی ہے تو صحت ہوگی، اسی طرح جہاں وبا ہے وہاں سے چلا جانا مثل دوا ہے۔ اگر خدا نے بچنا مقدر کیا ہے تو اس دوائے فعل سے فائدہ ہوگا، نہیں تو نہیں۔ بخاری میں جو حدیثیں ہیں اُن کا بھی یہی مطلب ہے۔ ایک حدیث میں ہے "فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا" مگر اس حدیث کے الفاظ پورے نہیں، اس کے بعد جو حدیثیں ہیں اُن کے الفاظ پورے ہیں "فلا تخرجوا فرارا منہ" جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھ کر چلا جانا کہ ہم اُس سے بھاگ کر بچ جاویں گے، ممنوع ہے، کیونکہ اگر اللہ نے مقدر نہیں کیا (یعنی بچنا) تو بھاگ کر نہیں بچ سکتے۔"

"جہاں وبا ہے وہاں داخل ہونا اور وبا کے مقام سے چلا جانا دونوں کی

یکساں حالت ہے...... اگر اسباب کی طرف توجہ ممنوع ہو تو جہاں وبا ہے وہاں جانے کا امتناع غلط ہو جاتا ہے اسی دلیل سے جس دلیل سے کہ ایسے مقام سے چلا جانا ممنوع ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام کو جا رہے تھے اور معلوم ہوا کہ وہاں وبا ہے تو صحابہ سے صلاح کی اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ مت جاؤ! اس وقت ابو عبیدہ نے کہا "اَفِرَاراً من قدر اللّٰہ" اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے کہا "نعم نفرّ من قدر اللّٰہ الی قدر اللّٰہ" پس اس جواب سے ٹھیک مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور یہی جواب اُس شخص کی جانب سے ہوتا ہے جو اس مقام سے جہاں وبا ہے، چلا جائے اور کوئی شخص اس کو کہے کہ افراراً من قدر اللّٰہ تو اُس کا جواب یہی ہو گا۔ نَعَم نَفِرُّ من قَدَرِ اللّٰہ الی قدر اللّٰہ پس جب اُن تمام حدیثوں اور اُن کے الفاظ و مقاصد پر غور کرو تو یہی مطلب و حکم پایا جاتا ہے میں نے بطور خلاصہ کے اول لکھ دیا ہے۔ یہ بات کہ جو عزیز و اقربا جن کی تیمار داری اُس کے ذمہ ہے اور وہ مبتلا ہوں اور وہ شخص جو وبا کے ڈر سے اُن کو چھوڑ جاوے، یہ ایک دوسرا گناہ ہے، تمام بحث سے اس کو تعلق نہیں۔ اُس شخص کی نسبت وہ حدیث ہے جو بخاری "اجر الصابر فی الطاعون" میں مذکور ہے۔"

اسلام کا ادب

اسلام اور شعائر اسلام کا ادب، قرآن مجید کا ادب اور خدا اور رسول کے نام کی تعظیم سرسید کے دل میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے صوفی خوش اعتقاد سے کچھ کم نہ تھی، بلکہ بعض موقعوں پر اس سے بھی کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں چند شہادتیں بطور نمونہ کے ذکر کی جاتی ہیں۔

بمبئی کے ایک شخص نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اُردو تحریروں میں علامات

وتفت وسی مقرر کرنے چاہیں جو قرآن مجید میں لکھے جاتے ہیں۔ سرسید نے ان کو لکھا "ہم نہیں پسند کرتے کہ جو علامتیں مدت سے قرآن مجید کی تحریر میں مخصوص ہوگئی ہیں وہ اردو تحریر میں مروج کی جائیں اور آیت و مطلق وغیرہ جو خاص اصطلاحات قرآن مجید کی ہیں اور سخن ہر رووں پر لوں جائیں۔ گو شرعاً و عقلاً اس میں کچھ قباحت نہ ہو۔ لا تعظیماً للقرآن المجید ایسا کرنا ہم پسند نہیں کرتے۔"

خطوں پر جو اکثر لوگ بسم اللہ الرحمن الرحیم یا حامداً مصلیاً لکھ دیا کرتے ہیں اس کی نسبت وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی بات بنالیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خداپرستی اور نہایت ہی اتقا اور کشیت سنت پر چلنے کا کام ہے حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اس کے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے اس قسم کے برتاؤ سے اسلام کی برکت و منزلت ان کے دل میں نہیں رہی۔ بعوض اس کے کہ اسلام کی باتوں سے ان کے دل میں نیکی خضوع اور خشوع پیدا ہو سکتی اور قساوت پیدا ہوتی ہے۔ حدیث نبوی کا بھی جس میں خدا کے نام سے کام شروع کرنے کا حکم ہے۔ یہی منشا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے الفاظ یہ ہیں "کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ بِبِسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَبْتَرُ" اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو امر ذی بال یعنی عظمت اور شان والا نہ ہو وہ اس حکم سے مستثنےٰ ہے۔"

ایک صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کانفرنس کے جلسوں میں تحسین کے موقع پر بجائے تالی بجانے کے سبحان اللہ یا مرحبا یا جزاک اللہ کہا جایا کرے اور اجلاس کے موقع پر ایک منبر رکھا جایا کرے جس پر کھڑے ہو کر لوگ اسپیچ کیا کریں۔ سرسید نے اس سے سخت ناراضی ظاہر کی

اور کہا" ایسے جلسوں میں جیسے کہ ہمارے جلسے دنیوی اغراض کے لیے ہوتے ہیں
ان الفاظ کو استعمال کرنا جو شعائر اللہ میں سے ہیں ان کی ہتک حرمت کرنا ہے
اور لاتحلوا شعائر اللہ میں داخل ہے. کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ ہم ایک
عاشقانہ شعر پڑھیں اور نئے ناب کی خوبی کسی شعر میں باندھیں، یا ایک معشوق
کے ہجر و وصل اور اُس کے خط و خال اور عشوہ و ناز توبہ شکن کو دلچسپ نظم
میں ادا کریں، اور سننے والے اس کی تحسین میں اُن کلمات کو استعمال کریں جو خاص
رب واحد معبود و غیور نے اپنی عبادت میں استعمال کرنے کے لیے بطور
شعائر اللہ مقرر کیے ہیں. افسوس کہ جس وقت ہمارے دوست ہم کو نصیحت
کرتے ہیں، اس وقت اُن کو ان الفاظ کی عظمت کا اور ہمارے کاموں کی
خست کا خیال نہیں رہتا اور چاہتے ہیں کہ ہم اپنے خسیس اور ذلیل کاموں میں
خدا کی عظمت اور اس کے شعائر کی حرمت کو بھول جاویں اور انھیں ذلیل دنیاوی
کاموں میں شعائر اللہ کو گڈمڈ کر کے اُس کی عظمت کو لوگوں کے دلوں سے کھودیں
کیا ہم کو زیبا ہے؟ کہ اپنے لغو اور ذلیل دنیاوی کاموں میں اُس منبر کی جس پر رسول
خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (بابی انت وامی یا رسول اللہ) کھڑے ہوکر وعظ فرمایا.
قرآن مجید لوگوں کو سنایا، خطبات روحانی ارشاد فرمائے، صحابہ اور ائمہ علیہم
السلام نے اُس سنت کو اختیار کیا اور اب ہماری مسجدوں کے لیے مخصوص ہے
جس پر وہی سنت ادا کی جاتی ہے، نقل بنا کر کھڑے ہوں ...... یہی خیالات
ہیں جن کے سبب سے لوگ ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن سے ہمارا دل تو
کانپ جاتا ہے. ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبہ) منشور محمدی رکھا
جاتا ہے کیوں اس کا دل پھٹ نہ گیا اور کیوں اس کا قلم ٹوٹ نہ گیا جو اُس نے
ان لفظوں کو لکھا، ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام اسلام رکھا جاتا ہے وہ

نہیں سمجھتا کہ کس مقدس نام کو کس جگہ استعمال کرتا ہے۔ اور اسلام کی عظمت کو دل سے بھلاتا ہے۔ ایک اخبار نکلتا ہے اور مخبر صادق (ہائے افسوس کس دل سے) اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ کوئی اخبار الصدیق کے نام سے مشہور ہے۔"

ایک دفعہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ کانفرنس کے چندہ کی آمدنی جمع رکھنے کو دریا اور کسی غرض کے لیے ایک شخص امین قوم مقرر ہونا چاہیے۔ سرسید نے یہ مضمون سن کر اور آبدیدہ ہو کر دردناک آواز سے کہا کہ " امین قوم تو صرف ایک شخص تھا سو گزر گیا اب کوئی امین قوم نہیں ہو سکتا، ہاں اس عہدہ کا نام امانت دار قوم ہو سکتا ہے،" چونکہ آنحضرت ابتدائے عمر سے عرب میں امین کے لقب سے مشہور تھے اس لیے اس لقب کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر ہونا انھوں نے گوارا نہیں کیا۔

ایک شخص نے سرسید سے استفسار کیا تھا کہ اگر نماز میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جاوے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں اس کے جواب میں انھوں نے یہ لکھ بھیجا " محذومی نماز میں قرآن مجید بہ لفظہ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی"

ایک اور شخص نے ان سے دریافت کیا تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ جو آپ نے اپنی تفسیر میں کیا ہے، اگر قرآن سے علیحدہ چھاپ لیا جاوے تو آپ اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا " اول تو یہ تبلاؤ کہ ایسے مردود ترجمہ کو خریدے گا کون؟ دوسرے یہ کہ جو ترجمہ تفسیر کے ساتھ کیا گیا ہے وہ نہایت سرسری طور پر ہوا ہے اگر صرف ترجمہ چھاپا جاوے تو نظر ثانی کا محتاج ہے اس کا اہتمام اس طرح پر کہ صرف اردو بغیر متن قرآن کے چھاپا ہو ہرگز پسند نہیں ہے، نہ میں اس کی اجازت اپنی زندگی میں دوں گا۔ میں اس کو نہایت عظیم گناہ سمجھتا ہوں، لیکن اگر مع متن قرآن مجید چھاپا جاوے تو میں نظر ثانی کرنے کی محنت گوارا کروں گا والسلام۔"

تفسیر قرآن لکھنے کی غایت

قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے سرسید کا مقصد جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کے مضامین عام طور پر تمام اہل اسلام کی نظر سے گزریں، چنانچہ ایک دفعہ ایک مولوی نہایت معقول اور ذی استعداد ان کے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کی تفسیر دیکھنے کا مشتاق ہوں، اگر آپ مستعار دیں تو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے ان سے کہا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا صلعم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہوگا؟ انھوں نے کہا "الحمدللہ" پھر کہا کہ آپ حشر و نشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر اور جو کچھ قرآن میں قیامت کی نسبت بیان ہوا ہے سب پر یقین رکھتے ہوں گے؟ انھوں نے کہا "الحمدللہ" سرسید نے کہا بس تو میری تفسیر آپ کے لیے نہیں ہے، وہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو مذکورۂ بالا عقائد پر سچا یقین نہیں رکھتے یا ان پر معترض یا ان میں متردد ہیں۔

سرسید نے ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا کہ "اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آوے اس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں، سردست عام لوگوں میں اس کا شایع ہونا اچھا نہیں۔"

نبی کی محبت

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق اور غایت درجہ کی ارادت اور سچی محبت معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جس حدیث کا مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالتِ شان کے منافی ہو میرے نزدیک وہ یقینی موضوع و مفتری ہے اگرچہ تمام محدثین کا اس کی صحت پر اتفاق ہو۔ بعض روایتوں پر جن کے ذریعے سے مخالفوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کرنے کا موقع ملا ہے، وہ بعض اوقات نہایت غیظ و غضب میں آ کر یہ کہہ اُٹھتے تھے کہ اگر اس کا راوی میری حکومت میں یہ روایت کرتا تو میں اس پر مفتری کی حد جاری کرتا۔

منشی سراج الدین نواب انتصار جنگ سے روایت کرتے ہیں کہ "سید صاحب کے کفر کا فتویٰ جو مولوی امداد العلی نے علما کے پاس مہر و دستخط کے لیے بھیجا تھا جب وہ مولوی سراج الدین احمد مرحوم سنبھلی کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کو پڑھ کر یہ کہا کہ "میں ایسے شخص کی نسبت کفر کے فتوے پر کیونکر دستخط کر سکتا ہوں جس کو میں نے اپنی آنکھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر چشم پُر آب اور زار زار روتے دیکھا ہے"۔

سرسید نے اپنی تفسیر میں ایک موقع پر اپنے چند فارسی اشعار لکھے ہیں جن میں سے دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے اُن کے دل کا لگاؤ جو آنحضرت صلعم کے ساتھ تھا ظاہر ہوتا ہے۔ ؎

خدا وارم، دلِ بریاں ز عشقِ مصطفےٰ دارم — ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم — ہمہ گفتارِ معشوق ست قرآنے کہ من دارم

جس زمانے میں کہ وہ سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کا جواب لکھنے کی تیاری کر رہے تھے انھوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں یہ الفاظ لکھے تھے "مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔ مارا ہمیں نعمۂ شاہنشاہی اس ست۔"

اسباب دنیوی سے بے تعلقی

سرسید کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے کوشش کرتے تھے، اُمرا سے ملتے تھے، حاکمان وقت سے میل جول رکھتے تھے اور خود دنیاداروں جیسی زندگی بسر کرتے تھے، کہا جا سکتا تھا کہ وہ دنیادار ہیں لیکن ان کی حالت پر نظر کرنے سے بمشکل اُن کو عرفی معنوں میں دنیا دار کہہ سکتے تھے۔ ایک بزرگ کا حال جو بظاہر تعلقات میں گھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر دل کو کسی چیز سے تعلق نہ تھا، لکھا ہے کہ وہ اپنے اصطبل کے گھوڑے دیکھ رہے تھے کسی نے طنز کے طور پر کہا کہ جس دل میں خدا ہو اُس میں گھوڑے نہیں سما سکتے۔ انھوں نے کہا "ایں میخہا در گل زدہ ام نہ در دل" سرسید کا حال دیکھ کر اس مقولہ کی بخوبی تصدیق ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایسے لوگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو باوجود کثرت تعلقات کے ہر ایک تعلق سے آزاد ہیں اور جن کی نسبت کہا گیا ہے

پاک ہیں آلائشوں سے، بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیان سب سے الگ

۔ سینکڑوں پھندوں میں یہاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل اُن کا تو وہاں سب سے الگ

یہ شخص اپنے فرائض کے سوا جن کو وہ اپنے اوپر لازم سمجھتا تھا، درحقیقت کسی چیز سے تعلق نہ رکھتا تھا، باوجود قطعی مایوسی کے جو اس کو مسلمانوں کی طرف سے تھی اور جس کو وہ اکثر پرائیوٹ صحبتوں میں نہایت افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا تھا، اس کی کوششیں اخیر دم تک برابر جاری رہیں حالانکہ اس کو یقین تھا کہ مسلمانوں پر مردنی چھا گئی ہے اور قومی زندگی کی رمق ان میں باقی نہیں رہی باوجود اس کے وہ دن رات اُن کی ترقی کی تدبیروں میں مصروف تھا اور جن کاموں کو وہ بے سود محض سمجھتا تھا اُن میں اُس کی سرگرمی و دلچسپی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر ایک کام میں اُس کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ یہ اسی کی ہمت اور اُسی کا حوصلہ تھا جو اُس کی ذات پر ختم ہو گیا۔

وہ اپنے نہایت عزیز اور خالص دوست اور مددگار نیاز محمد خاں رئیس جالندھر کو اُن کے تعزیتی تار کے جواب میں لکھتے ہیں "آپ کا تار ہمدردی کا پہنچا۔ جو دلی محبت اور عنایت آپ کی مجھ ناچیز پر ہے اُس کا میں صرف شکر گزار ہی نہیں ہوں بلکہ میں بھی اُس کو نہایت محبت و قدر سے دیکھتا ہوں اگرچہ سید حامد مرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے لیکن خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف ہو، کیونکہ وقت موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے، پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کر۔ والسلام۔"

وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھا جو لوگوں کو دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور خود مال و دولت جمع کرتے ہیں بلکہ وہ وہ شخص تھا جو ایک امید موہوم پر کہ شاید قوم دنیوی ذلت سے نکلے، اپنا دھن تن من سب قوم پر قربان کر گیا۔ اُس نے اپنے بڑے قرض کے ادا کرنے کی جلدی میں جس کے لیے ولایت کا سفر اختیار کیا تھا اپنی ہزاروں روپیہ کی جائیداد اور اثاث البیت اور ہزاروں روپیہ کی کتابیں ٹکے دھڑے کے بھاؤ فروخت کر دیں اور اس کے دل پر ذرا میل نہ آیا اس نے غدر کے بعد لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تعلقہ لینے سے ایسی بے پروائی کے ساتھ انکار کر دیا کہ کوئی دو چار بیگہ زمین کے لینے سے بھی اس طرح انکار نہیں کر سکتا، وہ اکثر ایسی تنگی کی حالت میں کہ گھر میں خرچ کرنے کو ایک پیسا نہ ہوتا تھا اپنی ساری تنخواہ خزانہ سے منگوا کر مدرسہ کی ضرورتوں میں اٹھا دیتا تھا اور جب تک مدرسہ کا روپیہ وصول نہ ہوتا آپ قرض دام کر کے گزارہ کرتا تھا، جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو بقول مسٹر آرنلڈ کے نہ اُس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔ اور جب وہ مرا تو اُس کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک پیسا

گھر میں نہ نکلا۔ کیا اس سے زیادہ کوئی زاہد کوئی صوفی کوئی درویش دنیا سے بے تعلق ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہم کو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں کوئی ایسا کافر مل سکتا ہے؟ فَلِلّٰہِ دَرُّ مَنْ قَالَ۔

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

اگرچہ سرسید کی تمام زندگی دنیا داروں کی زندگی میں بسر ہوئی مگر اس میں شک نہیں کہ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کا رنگ جو ابتدائے عمر میں ان پر چڑھ گیا تھا وہ نفس واپسیں تک بدستور چڑھا رہا۔ اُن کے بعض خوابوں سے جو ضمیمۂ کتاب میں نقل کیے گئے ہیں ان کی طبیعت کو ایک خاص تعلق طریقۂ نقشبندیہ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ نیز انھوں نے اپنی اکثر تحریروں میں مشائخ نقشبندیہ کا ذکر ایسے طور پر کیا ہے جس سے اُس تعلق کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ خصوصاً شاہ غلام علی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے چہرہ سے ایک رقت آمیز بشاشت ظاہر ہوتی تھی۔ باوجودیکہ مدت سے یہ کوچہ چھوٹ گیا تھا وہ مرنے سے چند سال پہلے زیادہ تر اسی ارادہ سے دلی گئے کہ شاہ صاحب کے مزار پر حاضر ہوں۔ اور ہمیشہ حضرت مجدد کے مزار پر جانے کے لیے سرہند جانے کا قصد رکھتے تھے۔ ایک خط میں سردار محمد حیات خاں صاحب کو لکھتے ہیں "مائی ڈیر حیات! آپ کا عنایت نامہ پہنچا...... بعد برسات پٹیالہ جانا ہوگا۔ آپ کی ملازمت کو بھی جی چاہتا ہے اور سرہند میں حضرت مجدد کے مزار کی زیارت کا ارادہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ ملتان تک آنا ہو جائے۔ ملتان میں کن کن بزرگوں کی زیارت ہے، اُن سے اجازت لے لیجیے اور یہ بھی دریافت فرمائیے کہ کیا عنایت ہوگا"

تصورِ شیخ کے مسئلہ کے متعلق جس پر طریقۂ نقشبندیہ میں سالک کی

ترقی کا دار و مدار ہے جو خیالات سرسید نے ۱۸۵۱ء میں اپنے رسالۂ سوسوسہ یفیقہ میں ظاہر کیے تھے وہی خیالات وہ اس کی نسبت اخیر دم تک رکھتے تھے مگر جس طرح وہ اور باتوں میں کسی کے مقلد نہ تھے اسی طرح تصوف میں بھی اُن کے خیالات بالکل آزاد تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے بے تعلق رہنا اور جو قوتیں خدا تعالےٰ نے انسان میں ودیعت کی ہیں اُن کو اپنے اپنے موقع پر بغیر افراط و تفریط کے استعمال کرنا تمام تصوف کا خلاصہ ہے یہی اُن کا قول تھا اور اسی کے موافق اُن کا عمل تھا۔

وہ ایک دوست کو اُس کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "سب سے بڑا کام انسان کے لیے دنیا میں یہ ہے کہ دنیا کو برتے اور دل کو اُس سے تعلق نہ ہو۔ مولانا روم فرماتے ہیں "چیست دنیا از خدا غافل بدن" مگر میرے نزدیک اس میں کسی قدر غلطی ہے۔ خدا سے غافل ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے خود خدا ایسا ہمارے پیچھے پڑا ہے کہ اگر ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑ سکتا اسی طرح ہم بھی خدا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ اگر خدا خود چاہے تو ہم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بھلا دیکھیں تو خدا ہم کو اپنے بندے اور اپنے مخلوق ہونے سے خارج تو کر دے، خدا کی قدرت سے خارج ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پس از خدا غافل بُدن چہ معنی دارد؛ دنیا ہمارے برتنے کے لیے ہے ہم خوب چین سے اُس کو برتیں مگر دل کو اُس سے تعلق نہ ہو بس یہی سب سے بڑا کام ہے اور یہی تعلق کفر ہے جس کی نسبت رسول مقبول نے فرمایا "صاحب المال کافر"۔

ایک اور دوست کو جن کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے، اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "آپ کا عنایت نامہ دردانگیز پہنچا جو رنج آپ کو ہے وہ بلاشبہ ہمدردی کے لائق ہے لیکن امر لاعلاج کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسان اسی میں غلطاں و پیچاں رہے اور سب کاموں کو جن کے لیے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے چھوڑ بیٹھے۔ رضا بقضا جو اہل اللہ کا مقولہ ہے نہایت عمدہ اور فلسفیانہ ہے، حتی المقدور انسان کو اُس پر عمل کرنا چاہیے .... میری دانست میں آپ کو اتباع والدہ صاحبہ جن کا حق جمیع امور پر مقدم ہے لازم ہے، آپ اُن کی صلاح کو مان لیں اور شادی کر لیں۔ امید ہے کہ آپ کی حالت موجودہ اور آیندہ درست ہو جائے گی۔ ایک بیوی کی وفات کے بعد دوسری بیوی کرنی کسی طرح اخلاق کے برخلاف نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہؓ کبریٰ سے نہایت محبت تھی، اُن کے بعد آپ نے نکاح فرمایا، کون شخص ہے جو کانشنس یا اخلاق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے تئیں قرار دے سکتا ہے! تمام حالات و مشکلات جو آپ نے لکھی تھیں وہ سب واردات حالیہ ہیں جو کبھی قائم نہیں رہتیں، انسان کو چاہیے کہ ان واردات حالیہ کو دل سے علیحدہ کر کے سوچے کہ اُس کو کیا کرنا چاہیے، میری سمجھ میں والدہ صاحبہ کی اطاعت اور اُن کو رنج کی حالت میں نہ رکھنا تمام اخلاق اور عبادتوں اور کانشنس کے جذبوں سے افضل ہے۔ والسلام"

بے تعصبی

سرسید کی مذہبی زندگی میں دو ایسی متضاد خاصیتیں پائی جاتی تھیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت ہی کم جمع ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حمیت اُن میں کوٹ کوٹ

کر بھری تھی باوجود اس کے مذہبی تعصبات سے وہ بالکل پاک تھے جس بے تعصبی سے انھوں نے فصل خصومات کا کام انجام دیا اور جس طرح کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بحیثیت ایک جج ہونے کے یکساں اور بے طرف دارانہ رہا اس کو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ہر قوم اور ہر فرقہ کے لوگوں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال اُن کے برتاؤ کا دوستی و ملاقات اور سوشل معاملات میں تھا اور یہی رنگ اُن مذہبی جھگڑوں کے متعلق تھا جو سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد اور ہندو مسلمانوں میں بیشتر پیش آتے تھے اور پیش آتے ہیں۔ اُن کے نہایت گاڑھے دوست جن کی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچ گئی تھی ہر مذہب اور ہر طریقے کے لوگوں میں موجود تھے جن کے ساتھ اخیر دم تک اُن کی یک جہتی و یک رنگی کا یکساں حال رہا۔ گائے کی قربانی پر جو ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہے اس کی نسبت وہ صاف صاف کہتے تھے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔ اسی طرح وہ شیعوں کی نسبت اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں "بہت سے شیعہ ہیں جن سے ہم سے نہایت دوستی ہے، وہ اپنے گھر میں ہمارے بزرگوں پر تبرا کیا کرتے ہیں، کیا کریں، ہمارا کیا نقصان ہے۔"

ایک سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہو کر ایک گائے قربانی کے لیے خرید لی۔ عین بقرعید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سن کر وہ از خود رفتہ ہو گئے۔ فوراً سوار ہونے کے لیے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگا دی یہاں تک کہ وہ گائے طالب علموں سے

چھین کر اُس کے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آیندہ کے لیے قطعی ممانعت کر دی کہ کالج کے احاطہ میں کبھی کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔

سرسید نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے اُن سے اس باب میں اُن کے اصلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا "میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں، اُن میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو، مگر اس اختلاف طبایع کی وجہ سے اُس دسترخوان پر بیٹھنے والوں والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اس پر مجبور ہے۔ اس لیے کہ جس چیز کا یقین اس کے جی میں ہے اُسی کو وہ اختیار کریگا وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ اچھا ہے تو اس کے لیے اور بُرا ہے تو اُس کے لیے۔ لیکن آپس کی محبت میں جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے۔ اُس سے کچھ نقصان نہیں آسکتا۔"

یہی وجہ تھی کہ سرسید ہمیشہ پبلک جلسوں میں جہاں ہندو مسلمان جمع ہوتے تھے دونوں قوموں کو اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی نصیحت کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے اپنی اسپیچ میں کہا "ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر پر پڑتا ہے، ایک آب و ہوا

میں دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں، پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔"

پھر آگے چل کر انھوں نے کہا کہ قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو ان میں بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔"

ایک اور موقع پر اسی باب میں انھوں نے مندرجۂ ذیل تقریر کی "میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ ان کا (یعنی ہندو مسلمانوں کا) مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے، لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ وہ ہندو، یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔"

ایک اور اسپیچ میں ان کے یہ الفاظ تھے "اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے، ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا جمنا کا

پانی ہم دونوں پیتے ہیں، ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں، مرتے ہیں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے، ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوگئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئیں، مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کرلیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اُردو پیدا کرلی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔"

"اے میرے دوستو! میں نے بار ہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلھن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دُلھن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کردیں گے تو وہ کانڑی بن جاوے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اُس دلھن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا۔"

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے انھوں نے جتنے رفاہ عام کے کام کیے ان میں تمام ہندو مسلمانوں کو شریک کیا۔ سوسائٹی کے اخبار میں جو ۳۵ برس اُن کے ہاتھ تلے رہا کبھی بھول کر بھی کوئی آرٹیکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی لو آتی ہو، کبھی گورنمنٹ سے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ مسلمانوں کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے سرکاری ملازمت میں بہت کم ہے۔ کبھی کسی ہند عہدہ دار کی ترقی پر اعتراض یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ برخلاف اس کے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا کریں ہمیشہ ہندو لیڈروں اور ریفارمروں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ

اپنے اخبار میں اور پبلک اسپیچوں میں کیا اور ہمیشہ اُن کے مرنے پر حد سے زیادہ رنج اور افسوس ظاہر کیا۔ یہی حال اُن کی بے تعصبی کا اسلامی فرقوں کے ساتھ تھا اور یہی حال عیسائیوں کے ساتھ۔

اسلامی حمیت

باوجود اس کے اسلامی حمیت جیسی اس شخص میں پائی جاتی تھی نہ وہ مولویوں اور واعظوں میں دیکھی گئی نہ صوفیوں اور درویشوں میں۔ جب کوئی بیجا حملہ اسلام یا مسلمانوں پر غیر مذہب والوں کی طرف سے ہوا اُس نے فوراً اُس کی مدافعت کی نہ اس معاملہ میں اُس کو اپنی صلح کل کی پالسی کا پاس و لحاظ تھا اور نہ اس بات کی کچھ پروا تھی کہ فریق ثانی کس رتبہ اور درجہ کا آدمی ہے۔ حالانکہ وہ ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ اتحاد و اتفاق قائم رکھنا چاہتا تھا مگر جب اُس نے دیکھا کہ ہندو اردو زبان اور فارسی خط کو صرف اس وجہ سے مٹانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہے تو اُس نے علانیہ اُن کی مخالفت کی اور ولایت جانے سے پہلے دو برس تک برابر اُن تمام سبھاؤں اور مجلسوں اور کمیٹیوں کے برخلاف آرٹیکل لکھتا رہا جو بنارس اور الہ آباد اور دیگر مقامات میں اردو کی بیخ کنی کے لیے قائم ہوئی تھیں۔ پھر جب ایسے ہی تنگدلی اور تعصب کے خیالات سے الہ آباد یونیورسٹی میں یہ تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کردی جائے تو اُس نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں بمقام الہ آباد اس تحریک کے برخلاف ایک نہایت پرجوش اور زبردست اسپیچ میں اُن تمام دلائل کی تردید کی جو فارسی زبان کے خارج کرنے کی ضرورت پر پیش کی گئی تھیں۔

باوجودیکہ وہ انگریزوں کا دوست تھا اور اُن میں اور مسلمانوں میں خلوص اور دوستی پیدا کرنا چاہتا تھا مگر جن انگریزوں نے اسلام کے برخلاف کتابیں لکھیں اُن کا مقابلہ اُس نے نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ کیا۔ اُس نے سب سے پہلے گورنمنٹ کو اس بات سے آگاہ کیا کہ ملکی اور فوجی افسر اپنے تابعین کو مشنریوں کا وعظ سنوانے کے لیے اپنا رعب وداب کام میں لاتے ہیں جس سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ضلع مرادآباد میں انتظامِ قحط کے موقع پر ہندو مسلمانوں کے یتیم لاوارث بچوں کی بابت جو کشاکشی سرسید اور مشنریوں اور کلکٹر مرادآباد کے درمیان رہی وہ پہلے حصے میں مفصل بیان ہوچکی ہے۔ اُس نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کی عام فیلنگ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے برخلاف ہے پس اگر کہیں کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو اس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ اس نے کمیشن میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ "جہاں مشنری اسکول ہیں اگر وہاں کے لوگ اپنی اولاد کو اُن اسکولوں میں بھیجنا پسند نہ کریں اور آپ اپنے لیے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں تو گورنمنٹ اُن کو گرنیٹ ان ایڈ عطا فرمادے اور اس بات کی خبر رکھے کہ وہاں کے حکام اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے اپنی حکومت اور رعب وداب کو اُن کے برخلاف عمل میں نہ لاویں۔"

اس سے بڑھ کر کوئی شخص اس بات کا مخالف نہ تھا کہ مسلمان اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے مشنری اسکولوں یا کالجوں میں داخل کریں، نہ اس لیے کہ اُس کو عیسائی مذہب سے کچھ تعصب تھا بلکہ صرف اس خیال سے کہ مسلمانوں کو

غیرت آئے اور وہ اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی تعلیم کا خود انتظام کریں اُس نے جو لکچر ۱۸۸۴ء میں بمقام لدھیانہ دیا تھا اس میں وہاں کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر صاف صاف کہا تھا کہ "بڑے افسوس کی بات ہے کہ لدھیانہ سے شہر میں جو ایک بڑا شہر ہے اور جہاں بہت سے مسلمان آباد ہیں، مشنری اسکول بہت سے ہیں اور مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں اُن کو کچھ جوش پیدا نہیں ہوتا، اُن کو کچھ غیرت نہیں آتی کہ وہ اپنے لڑکوں کا خود کچھ بندوبست کریں۔ وہ کتے کی طرح اپنے لڑکوں کو خیراتی روٹی پر پلاتے ہیں اور ایسے خیراتی اسکولوں میں اپنی اولاد کو تعلیم کے واسطے بھیجتے ہیں اور خود کوئی بندوبست اپنے بچوں کی تعلیم کا نہیں کرتے۔"

اُسی لدھیانہ کے جلسہ میں جب وہاں کے مشن اسکول کے ایک مسلمان طالب علم نے سرسید کی تعریف میں کچھ تقریر کی تو اُس کے جواب میں جو کچھ انھوں نے کہا اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مشن اسکول کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان کی نسبت کیسے خیالات اور شبہات رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا، "تمہارے بیان میں کئی جگہ قوم کا لفظ آیا ہے مگر یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم قوم نہ ہو، ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تب ہی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے، اُس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے اے عزیز بچے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا؟ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ اُس کو قائم رکھو گے اور اُس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرنے

جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہوگی جو تم کو بھی فائدہ دے گی اور قوم کو بھی عزت ہوگی اور آیندہ آنے والی نسلیں بھی اُس سے فائدہ اٹھاویں گی "

اگرچہ اسلامی حمیت ہر مسلمان کے دل میں کم و بیش ضرور ہوتی ہے اور ہونی چاہیے مگر اس باب میں سرسید کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے بالکل مختلف تھے۔ جو اعتراض عیسائی لوگ اسلام پر کرتے ہیں یا جو مطاعن رسول خدا صلعم کی نسبت اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں بعضے مسلمان تو اس کو کمال دین داری سمجھتے ہیں کہ اُس کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ بعضے غیظ و غضب میں آکر ایسی کتابوں کو آگ میں جلا دیتے ہیں اور بعضے گورنمنٹ سے فریاد کرتے ہیں کہ فلاں کتاب میں ہمارے دین یا ہمارے نبی کی توہین کی گئی ہے۔ اُس کو گورنمنٹ تلف کراوے اور آیندہ اس کے چھاپنے کی ممانعت ہو جائے۔ مگر درحقیقت ان باتوں کو مذہبی حمیت سے کچھ علاقہ نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ مخالفوں کے اعتراضات کا ہمارے پاس اس کے سوا کچھ علاج نہیں کہ اُن اعتراضوں سے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیں یا گورنمنٹ سے فریاد کر کے ایسی کتابوں کو تلف اور اُن کی اشاعت بند کرا دیں برخلاف اس کے سرسید کے خیالات اس باب میں یہ تھے کہ مسلمانوں کے لیے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ عیسائیوں کے اعتراضوں کو لغو و لوچ سمجھ کر اُن کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ یا گورنمنٹ میں استغاثہ کر کے اس بات کا ثبوت دیا جائے کہ مسلمان ان کا جواب دینے سے عاجز ہیں۔ بلکہ اسلامی حمیت کا مقتضا یہ ہے کہ اُن کے اعتراضوں کو نہایت ٹھنڈے دل سے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ دیکھیں اور اُن پر غور کریں، پھر جو جواب دینے کے قابل ہوں اُن کا جواب دیں اور جن میں بد زبانی و بے تہذیبی کے سوا کوئی بات التفات کے قابل نہ ہو اُن

کا فیصلہ پبلک کی رائے پر چھوڑ دیں نہ یہ کہ گورنمنٹ کو اُن کا جج قرار دیں اور مذہبی مباحثوں میں حکومت کی پناہ ڈھونڈیں" تاکہ دنیا پر ظاہر ہو جائے کہ اسلام کی دلیلیں باوجود اُس کے محکوم و مغلوب ہونے کے اب بھی ویسی ہی غالب ہیں جیسی اُس وقت تھیں جب کہ اسپین[1] کے عیسائی مسلمانوں کے زوال کے بعد ان کو اس لیے جلا وطن کرتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب دینے سے عاجز آ گئے تھے۔

الغرض اگر مسلمان سے یہ مراد ہے کہ دین اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے نہ کہ ماں باپ کی تقلید سے یقین واثق رکھتا ہو، اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کا تعلیم دینے والا غیر مذہب والوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ سکھانے والا اور فتنہ و فساد و ظلم و بے رحمی کی بیخ کنی کرنے والا، غرض کہ اس کی تعلیم کو نوع انسانی کے حق میں سراسر رحمت اور برکت سمجھتا ہو، خدا کے سوا کسی کو مستحقِ عبادت اور نبی کے سوا کسی انسان کے قول کو واجب الاتباع نہ جانتا ہو، اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد خیال کرتا ہو، مسلمانوں کی عزت چاہنے والا اور ان کی ذلت پر افسوس کرنے والا ہو، جس بات کو سچ جانے اُس کے ظاہر کرنے میں کسی کی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو، معاملات میں راستباز ہو

---

[1] سرسید نے خطبات احمدیہ میں ایک آزاد خیال یوروپین مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اگرچہ بظاہر مورد (یعنی اسپین کے مسلمان) اس وجہ سے جلا وطن کیے جاتے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہ کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان رنگ راہب ایسا سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھے کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک اُن کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی۔ وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا"

اور برائی کی عوض میں بھی بھلائی کے سوا کچھ نہ کرے تو شاید سید احمد خاں جیسا مسلمان زمانے میں مشکل سے ملے گا، لیکن اگر مسلمان سے یہ مراد نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے حقیقی مصداق وہ لوگ ہیں جو تعصب کو دین اسلام کا رکن رکین سمجھتے ہیں، جو ذرا ذرا سے اختلافات پر جماعت اسلام کا پراگندہ کرنا اپنا فرض جانتے ہیں، جن کو ائمۂ مجتہدین کی تقلید نے قرآن اور حدیث سے مستغنی کر دیا ہے، جو قرآن کو محض تلاوت کرنے کی کتاب اور حدیث کو صرف سند لینے کی چیز خیال کرتے ہیں، جو احکام ظاہری پر جلسے جلسے وعظ کہتے ہیں، آمین اور رفع یدین کی بحث میں عمریں گزار دیتے ہیں، وضع و لباس میں غیر قوموں کے تشبہ کو محاربۂ خدا اور رسول کی حد تک پہنچا دیتے ہیں، مگر قوم کے اخلاق کی درستی کا جس کی نسبت نبی نے کہا تھا کہ .... " بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ " کبھی بھول کر بھی خیال نہیں کرتے، جن کے وعظ و نصیحت سے سوا اس کے کہ مسلمانوں میں افلاس، نااتفاقی، بغض اور کینہ کو ترقی ہو، اہلِ قبلہ میں ہمیشہ کھٹا پٹی رہے، اسلام مطعون ہو، قوم کو دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے کوئی نتیجہ پیدا ہوتا نظر نہیں آتا تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان معنوں میں سید احمد خاں کو مسلمان کہنا صحیح نہ ہوگا مگر یہ ویسی ہی مسلمانی ہوگی جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

اگر حقیقتِ اسلام در جہاں این ست
ہزار خندہ ز کفرست بر مسلمانی